ندا فاضلی

دیواروں کے باہر

میں رویا پردیس میں بھیگا ماں کا پیار
دُکھ نے دُکھ سے بات کی بِن چٹھی بِن تار

ندا فاضلی

نام کتاب : دیواروں کے باہر

مصنف : ندا فاضلی

پتہ : ۱۰۳، اَمرا اپارٹمنٹ،
ڈان پارا کھار (ویسٹ) ممبئی ۔۵۲

اشاعت : ۲۰۰۰ء

مطبوعہ : عزیز پرنٹنگ پریس، دہلی

قیمت : ۱۵۰ر روپے

ملنے کے پتے:

☆ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، دہلی، ممبئی
☆ انجمن ترقی اردو (ہند) ۲۱۲، راؤز ایونیو، نئی دہلی ۔۱۱۰۰۰۲
☆ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی ۔۱۱۰۰۰۶
☆ ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، گولا مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی ۔۱۱۰۰۰۲

معیار پبلی کیشنز
کے ۔۳۰۲ر تاج انکلیو، گیتا کالونی، دہلی ۱۱۰۰۳۱

اپنی بیٹی

تحریر

کے لئے

جتنی بُری کہی جاتی ہے اتنی بُری نہیں ہے دنیا
بچوں کے اسکول میں شاید تم سے ملی نہیں ہے دنیا

ے

HaSnain Sialvi

جس گھر میں اب میں رہتا ہوں
وہ میرا ہے
اس کے کمروں کی آرائش
اس کے آنگن کی زیبائش
اب میری ہے
مجھ سے پہلے
مجھ سے پہلے سے بھی پہلے
یہ گھر کس کس کا اپنا تھا
کن کن آنکھوں کا سپنا تھا
کب کب اس کا کیا نقشہ تھا
یہ سب تو کل کا قصہ ہے

اس کا آج مرا حصہ ہے
آج کے کل بن جانے تک ہی
میرا ابھی اس سے رشتہ ہے
اس گھر میں اب میں رہتا ہوں!

روٹی، گھر، کپڑے اور کتابوں کو ایک جگہ کرنے میں اسے بیس سال سے زیادہ لگ گئے۔ الگ الگ سمتوں کے ان باسیوں کی یکجائی کی مدت ہر ایک کے ساتھ مختلف ہوتی ہے۔ ان چند خوش قسمت افراد کے علاوہ جن کو پیدائش سے ہی وراثت میں سب کچھ مل جاتا ہے، سبھی کو انہیں اکٹھا کرنے کے مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ کچھ بنے بنائے راستوں کے مسافر ہوتے ہیں، پیدا ہونا، تعلیم حاصل کرنا، نوکری کرنا، گھر بنانا، ندا کو اس مروجہ ترتیب سے جینے کی سہولت حاصل نہیں ہوئی۔ اس نے اپنے لئے جو راستہ منتخب کیا تھا یا حالات نے اسے جس راستہ پر ڈال دیا تھا اس میں مقابلتاً زمین سخت اور آسمان دور تھا۔ اس کے سارے بھائی والدین کے تجربوں کے سائے میں مناسب وقت پر دروازوں پر اپنے اپنے نام کی تختیاں لگا کر باعزت بن گئے۔ ندا کی خودسری نے ان کے تجربوں سے فائدہ نہیں اٹھایا اور بہت سارا وقت یوں ہی گنوا دیا۔

اپنے ہی شہر میں اچانک وہ گھر سے بے گھر ہو کر گوالیار سے سن پینسٹھ کی ایک دوپہر کو ممبئی کے وی ٹی اسٹیشن پر اترا تھا۔ بسنت اسٹوڈیو کے پاس وہ وہاں سے پانجراپول نامی چھوٹی سی آبادی میں آیا تھا۔ ممبئی کی بڑی بڑی عمارتوں اور لمبے چوڑے فاصلوں سے ٹکرانے کے لئے اس کے ہاتھ میں چند کپڑوں کی ایک اٹیچی اور جیب میں گنتی کے اکیس روپے تھے۔ آج ممبئی میں اس کا اپنا گھر ہے۔ روٹی کپڑے اور کتابوں کے اس اکیلے گھر کو مکمل ہونے میں ابھی ایک عورت کی ضرورت ہے۔ اس عورت کا نام ابھی تک عشرت ہے۔ جو گوالیار کے ایک محلے کے کشادہ گھر میں اپنے والد کے ریٹائر منٹ کے بعد سب سے بڑی لڑکی ہونے کی سزا پوری کر رہی تھی۔ وہ ایک مقامی کالج میں فائن آرٹس کی لکچرر ہے۔ اس کے گھر میں اس سے چھوٹی

پانچ بہنیں اور ایک بھائی ہے۔ ان سب میں بٹی ہوئی وہ جب کسی شام یا دوپہر کی فرصت میں خود میں جڑنے کا حوصلہ پاتی ہے تو ندا کو خط لکھ دیتی ہے۔

"مجھے میری ذمہ داریوں نے تھکا دیا ہے۔ میں ان سب سے دور ہو کر تمہارے پاس آ جانا چاہتی ہوں۔ لیکن بابو صاحب کا بڑھاپا راستہ روک لیتا ہے۔ اگر میں نے بھی اس وقت ان کا ساتھ چھوڑ دیا تو وہ ٹوٹ کے رہ جائیں گے اور یہ صدمہ میں برداشت نہیں کر پاؤں گی۔ مجھے تھوڑا وقت اور دے دو۔ پھر اس کے بعد تمہیں مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہو گی۔"

ایسے ہی ایک خط کو دیکھ کر، ندا کی بڑی بہن، مرتضیٰ حسن کو لے کر کراچی سے گوالیار آتی ہے۔ وہ اپنے ساتھ صندوق میں مرحومہ جمیل فاطمہ کے دیئے ہوئے زیورات اور شادی کے دن دلہن کے پہننے کا موروثی لباس بھی لاتی ہے اور دو تین ہفتے یونہی گنوا کر واپس لوٹ جاتی ہے۔

اس کے مسلسل ہٹ کر جڑنے اور جڑ کر بٹنے سے ناراض ہو کر بڑی بہن نئے رشتوں کی تلاش کرتی ہے۔ اس کی خبر جب عشرت کو ہوتی ہے تو ان دیکھے آنسوؤں سے اس کی آنکھیں بھیگنے لگتی ہیں۔ وہ اپنی ایک سہیلی کے یہاں ندا سے ملتی ہے اور وہ ساری باتیں جو وہ کہنا چاہتی ہے، خود خاموش رہ کر اس سہیلی سے کہلواتی ہے۔ ان باتوں میں محبت، انتظار اور مجبوری کے لفظ بار بار سنائی دیتے ہیں۔ اس کے منہ سے رخصت ہوتے وقت صرف ایک جملہ نکلتا ہے۔

"میں تم کو چاہتی ہوں، تمہاری خاطر شہر میں بدنام ہوئی ہوں۔ اس کا خیال رکھنا۔"

اس نئے گھر میں وہ کئی سالوں کے بعد جب سے ممبئی آیا ہے۔ پہلی بار دوپہر میں ایک گھنٹہ سو کر اٹھا ہے۔ مکان کی چابی اسے صبح ملی ہے اور اب دوپہر ہے۔ وہ کافی تازہ دم محسوس کرتا ہے۔ وہ بیڈ روم کی گیلری میں کھڑا، دیکھتا ہے کہ سامنے میدان میں مچھیروں کے دیوتا وٹھل کا مندر ہے۔ سرخ کھپریلوں سے ڈھکے ہوئے اس مندر کے قریب مولسری کا پیڑ ہے۔ دائیں طرف جامن کا پرانا درخت ہے۔ جامن کی شاخ پر بیٹھا ہوا طوطا جامن کترتے ہوئے اسے دیکھتا ہے اور پھر پر پھیلا کر اڑ جاتا ہے۔ اسے وہ طوطا اچانک یاد آتا ہے۔ جو عشرت

کی پھوپی سے قرآن پڑھتا تھا اور جو آج بھی وہیں میدان میں کسی چھوٹی سی قبر میں لبدی نیند میں محو ہے۔ اس کا جسم قبر میں ہے اور روح جنت میں ہے مولسری کے پیڑ میں چھپی چڑیاں دوپہر کی گپ شپ میں مشغول ہیں۔ مندر میں گھنٹیوں کی آواز کی گونج سے چونک کر ایک ساتھ کئی چڑیاں باہر نکلتی ہیں اور ان کے پروں کی سرسراہٹ سے بہت سارے پھول شاخوں سے ٹوٹ کر ہوا میں جھولتے ہوئے فرش پر بکھر جاتے ہیں۔ ڈوبتے سورج کی دھوپ اپنے اجلے ہاتھوں میں ان پھولوں کو لئے مندر کی دیوار پر کھڑی آرتی انتظار کر رہی ہے۔ کہیں قریب سے اذان کی دھیمی آواز ہوا میں تیرتی ہوئی اس تک آتی ہے۔

"خدا نے میری ساری آرزوئیں پوری کی ہیں۔ لیکن نہ جانے کون سا ایسا گناہ ہے جس کی سزا مجھے اب تک تیری جدائی کی صورت میں مل رہی ہے۔ جب تو گھر بار کا ہوگا تب تجھے احساس ہوگا، اولاد کا دکھ کیا ہوتا ہے۔"

جمیل فاطمہ کے ایک خط میں یہ جملے، اذان کے آخری لفظوں سے جھانکتے ہیں۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر کی صدا میں ایک چہرہ ابھرتا ہے اور پھر خاموشی بن جاتا ہے۔ تہہ در تہہ خاموشی......

"...... فسادات ہوتے نہیں ہیں کرائے جاتے ہیں۔ کرسیوں کی لالچ اہلِ سیاست کو جانور بنا دیتی ہے۔ خونخوار جانور! آدمی تو اتفاقات کا کھلونا ہے۔ پیدائش سے پہلے کس سے پوچھا جاتا ہے کہ کون کہاں پیدا ہونا چاہتا ہے۔ جو جہاں آتا ہے وہیں کا ہو جاتا ہے! موتی لال نہرو، پنڈت نہرو، اندرا گاندھی، راجیو گاندھی، ایک ڈھنگ کے گھر میں پیدا ہونے سے، کئی نسلوں تک آدمی بے فکر ہو جاتا ہے۔ زبان، مذہب، دیس، چہرہ سب ایسے ہی اتفاقات کے دائرے ہیں......!"

گوالیار میں نئی سڑک کی ایک دکان ساہتیہ سنگم میں ندا اپنے ہم عمر دوستوں کے درمیان کسی بحث میں الجھا ہوا ہے۔ وہ اپنے بارے میں خود فیصلہ کرتا ہے۔ اس فیصلے کے بعد وہ خود اپنی نظر میں اہم ہو جاتا ہے۔ اسے لگتا ہے کہ وہ اچانک بڑا ہو گیا ہے۔

سورج، ہوا اور آسمان کو اپنے بنائے ہوئے گھر کی گیلری سے دیکھنے کا یہ اس کا پہلا تجربہ ہے۔ اسے لگتا ہے ہوسٹل کے کمرے کی کھڑکی، یا کسی کرائے کے روم سے دیکھی ہوئی دنیا اور اپنی گیلری سے نظر آنے والی دنیا، ایک ہی دنیا میں کئی مختلف دنیائیں ہیں۔ دنیا وہی رہتی ہے، لیکن دیکھنے والے کے حالات کے لحاظ سے یہ سب کو الگ الگ روپ میں نظر آتی ہے۔ ندا نے ہوسٹل میں کئی سال گذارے ہیں۔ ایک کمرے میں اپنے علاوہ ایک اور کے ساتھ!" یہ ایک اور"۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے ساتھ بدلتا رہتا ہے اس کی عادتیں اور سونے جاگنے کے اوقات بھی ہر نام کے ساتھ مختلف ہوتے ہیں۔ کسی کو رات میں دیر تک بانسری بجانے کا شوق ہوتا ہے کوئی ضرورت سے زیادہ سوشیل ہے، لہٰذا اس کے پاس ہمیشہ دوستوں کی بھیڑ ہوتی ہے، کسی کی ہر روز کوئی نہ کوئی چیز گم ہو جاتی ہے، جس کے دوبارہ ملنے تک وہ مسلسل کمرے کو اوپر نیچے کرتا رہتا ہے اور جب وہ کھوئی چیز مل جاتی ہے تو تلاش کے پورے واقعہ کو دیر تک وہ اپنے آپ کو سناتا رہتا ہے۔ انہیں 'ایک اور، میں ایک' چہرہ مہرہ سے معقول، لمبا تڑنگا پنجابی نوجوان ہے، جو لندن سے ممبئی فلم انڈسٹری میں اپنی مردانہ وجاہت کی دھاک بٹھانے آیا ہے۔ جب دھرمیندر ہوسٹل میں رہ کر ہیرو بن سکتا ہے تو اس میں کیا کمی ہے؟ اس کا رہن سہن اور کپڑے جوتے، ہوسٹل میں دوسرے رہنے والوں سے الگ ہیں۔ وہ ناشتہ یا کھانا باہر جا کر ہوٹل میں نہیں کھاتا، ہوٹل کا لڑکا لے کے آتا ہے اور ہر پھیرے میں معقول ٹپ پاتا ہے۔ وہ جب بھی بن سنور کر باہر نکلتا ہے تو پوری فضا میں خوشبو جاگ جاتی ہے۔ سب اسے مڑ مڑ کے دیکھتے ہیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں ہوسٹل کے سارے اجنبی اس کے دوست بن جاتے ہیں۔ پہلے وہ شام ہوتے ہی بوتل کھول کر اکیلا ہی فلم انڈسٹری میں اپنی کامیابی کے خواب دیکھتا تھا۔ نئے نئے وعدوں کے تیر آسمان میں پھینکتا تھا جب ندا کمرے میں ہوتا تو اسے بھی شریک کر لیتا تھا لیکن بعد میں اب بن بلائے بہت سے مہمان اس کی تنہائیوں میں شامل ہونے لگتے ہیں۔ رات کی اس کی میزبانیاں کافی مشہور ہو چکی ہیں اس شہرت نے دوسروں کی ضرورتوں کی اس سے توقعات بڑھا دی ہیں۔ اب ضرورتیں ادھر ادھر بھٹکنے کے بجائے

سیدھے اس کے پرس تک آجاتی ہیں۔ ایک پرس اور بہت ساری اور مسلسل ضرورتیں۔ وہ پریشان ہونے لگتا ہے۔ ایک شام کچھ دیر وہ خاموش رہ کر تیار ہوتا ہے اور باہر نکلنے سے پہلے سب کے سامنے ندا سے کہتا ہے۔ یار آج بہت کڑکی ہے۔ بیس پچیس روپے ہوں تو ادھار دے دو جیسے ہی کہیں سے پیسے آئیں گے لوٹا دونگا......" اس کے اس جملے سے دوسرے تو حیرت زدہ ہوتے ہیں ہیں خود ندا کو بھی تعجب ہوتا ہے۔ اس ادھار کے بعد وہ دوسروں کی توقعات کے اونچے سنگھاسن سے اتر کے، ویسا ہی بن جاتا ہے جیسے دوسرے ہیں، طبقاتی فرق کے مٹتے ہی لوگوں کی نہ صرف اس میں دلچسپی ختم ہو جاتی ہے، سلام دعا کی وہ عزت بھی اسے ملنا بند ہو جاتی ہے جو اب سے پہلے آتے جاتے اسے ملتی تھی۔ ندا سے لیئے ہوئے پیسے ندا کو اسی شام واپس مل جاتے ہیں۔ اس کا پرس جیسا پہلے تھا ویسا ہی اب بھی ہے۔ لیکن ہوسٹل والوں میں اس کے افلاس کی شہرت بدستور قائم رہتی ہے۔ یہ شہرت اس کی خود ساختہ غریبی کے بہت کام آتی ہے۔ وہ جب تک یہاں رہتا ہے۔ اسے یہ بے فکر نیند بھی سلاتی ہے اور اس کی امیری کو دوسروں کی طرح مفلس ہونے سے بھی بچاتی ہے۔ کئی مہینوں کی تگ ودو کے بعد بھی اسے متوقع کامیابی نہیں ملتی تو اس کی امیری بھی اس سے منہ موڑنا شروع کر دیتی ہے۔ ایک دن ندا کو اپنی میز پر اس کا ہاتھ کا لکھا ہوا ایک کاغذ ملتا ہے۔

"آج میں واقعی ضرورت مند ہوں۔ ہو سکے تو پانچ سو روپے میری ڈائری میں رکھ دینا۔ یہ رقم پہلے کے بیس کی طرح تمہیں فوراً نہیں ملے گی۔ کچھ دن بعد ہی دے پاؤنگا"۔

ان پیسوں سے وہ ریستوراں کا بل ادا کرتا ہے۔ ہوسٹل کا کرایہ دیتا ہے اور باقی جو بچتا ہے اس سے وہ دو بوتل شراب لاتا ہے اور ان سب کو پلاتا ہے جو اس کے افلاس پر ترس کھا کر اس سے اُدھار مانگنا چھوڑ چکے تھے پینے والوں کی رائے اچانک اس کے بارے میں بدل جاتی ہے۔ اپنی غریبی کو اس طرح امیر بنا کر وہ جس بستر پر سوتا ہے وہاں سے دوبارہ خود نہیں اٹھتا، اٹھایا جاتا ہے۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق اس کی موت خودکشی ہے۔ اس کی لاش دو تین دن مردہ گھر میں لاوارث پڑی رہتی ہے۔ پھر ان سبھی کے چندہ سے جن کو شروع میں اس

نے ادھار دیا تھا، اسے آگ کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ ندا کئی دن تک اس کی موت کو بھی اس کا کوئی ناٹک سمجھتا ہے۔ اسے لگتا ہے وہ کسی شام کو پھر ہنستا ہوا اس سے ملے گا اور کہے گا، کیوں کیسا ناٹک کیا میں نے، ہوسٹل میں سکون سے رہنے کے لئے اس قسم کے ناٹک ضروری ہوتے ہیں۔

پالی ناکہ کے اس ہوسٹل میں سبھی فلم اسٹرگلر ہیں۔ پنجاب، بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان بنگال وغیرہ سے آئے ہوئے اپنے گھر بار سے دور، یہ سب دن میں اپنے اپنے خوابوں کے پیچھے بھاگتے دوڑتے ہیں اور رات کو الگ الگ کمروں میں دیر تک نشے میں ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے ہیں۔ یہ لڑائی کبھی کبھی قریب کے پولیس اسٹیشن تک پہونچ جاتی ہے اور باقی رات وہیں آرام کر کے سویرے ہوسٹل میں واپس آتی ہے۔ اس ہوسٹل میں سب کے اپنے خواب چہرے ہیں۔ کوئی نغمہ نگار بننا چاہتا، کوئی سنگیت کی دنیا میں تہلکہ مچانا چاہتا ہے، کوئی ہیرو، کوئی ویلن ہے۔ لیکن سب مہینوں سے بے کار ہیں۔ گذر اوقات کے لئے ان میں سے بیشتر نے اپنے مزاج سے مختلف پیشے اختیار کئے ہوئے ہیں۔ جس کو ہیرو بننا ہے وہ لنکنگ روڈ کی ایک بڑی ہوٹل میں ویٹر کا کام کرتا ہے۔ ویلن باندرہ سے گوشت لا کر گھروں میں سپلائی کرتا ہے۔ صابر دت نغمہ نگاری کے شوق کو ملتوی کر کے فلم رائٹرس ایسوسی ایشن کے سکریٹری اور کرشن چندر کے چھوٹے بھائی مہندر ناتھ کی مدد سے انہیں پر فن اور شخصیت کا پہلا نمبر پلان کر رہا ہے کرشن چندر اپنے ہوتے ہوئے، اپنے بھائی پر کسی نمبر کے نکالے جانے کے خلاف ہیں لیکن اشتہاروں کی مدد سے نمبر نکلتا ہے مگر مہندر ناتھ کو اپنا یہ نمبر دیکھنا نصیب نہیں ہوتا۔ مہندر ناتھ کے بعد دوسرا نمبر جاں نثار اختر پر ہوتا ہے۔ وہ بھی اسے دیکھتے ہی اللہ کو پیارے ہو جاتے ہیں۔ ان دو حادثوں کے بعد صابر دت جس کسی کے فن اور شخصیت پر نیا شمارہ پلان کرتا ہے وہ ڈر کے اپنا نام واپس لے لیتا ہے۔ سب کو اپنی زندگی سے زیادہ پیار ہو گیا ہے اور صابر پھر سے بے کار ہو گیا ہے۔ ان بے کاری کے دنوں میں وہ ایک ایسے اُردو ادیب یا شاعر کی تلاش میں ہر گھڑی مصروف رہتا ہے جو اس کے کہنے پر مرنے پر

رضامند ہو۔ کچھ دنوں سے ہوسٹل میں ندا کے کمرے میں "ایک اور" صابر ہے۔

اس ہوسٹل میں ایک میوزک ڈائریکٹر ندا پر کافی مہربان ہیں۔ وہ ہر وقت اپنے کمرے میں ایک پرانے سے ہارمونیم پر ان فلموں کے لئے دھنیں بناتے رہتے ہیں جو کئی سال سے انہیں ملنے والی ہیں لیکن ابھی تک ملی نہیں۔ ندا سے ان کی ملاقات ہوسٹل میں کم، ہوسٹل کے باہر ہوٹل میں زیادہ ہوتی ہے۔ وہ ناشتہ کے وقت جب بھی آتے ہیں ندا کے لئے ایک نئی فلم کا آفر لاتے ہیں۔ اور چائے پی کے چلے جاتے ہیں۔ ان کو اس ہوسٹل میں آئے چند مہینے ہی گذرے ہیں لیکن ان فلموں کی تعداد جن میں ندا ان کے ساتھ گیت لکھنے والا ہے۔ اب ان کے قیام کے مہینوں سے تگنی چوگنی ہو چکی ہے۔ اتنی ساری فلموں کے بعد بھی ندا پر ان کی مہربانیاں کم نہیں ہوتیں۔ ان کی گنتی بڑھتی ہی رہتی ہے۔ لیکن ندا پاس ہی اب آفر لینے کا وقت ختم ہو جاتا ہے، اب وہ ان کی نئی فلموں کے لئے وقت نہیں نکال پاتا۔ اور انہیں دیکھتے ہی ہوٹل سے اٹھ جاتا ہے انہیں ندا کے رویہ سے تکلیف ہوتی ہے اور کئی دن کے لئے خاموش ہو جاتے ہیں۔ وہ اب ندا کو اپنی نئی دھنیں بھی نہیں سناتے۔ کچھ دن کے بعد وہ ہوسٹل چھوڑ کر کلکتہ واپس چلے جاتے ہیں۔ کئی سال نظر نہیں آتے۔ اچانک ایک دن کانگریس ہاؤس کے دفتر میں اختر کے مجرے میں ہارمونیم بجاتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ندا کو پہچان لیتے ہیں پہلے وہ پردیپ رائے تھے اور اب شمشاد خان ہیں۔ اختر کے پہلے کے دونوں لڑکے اب انہیں کی ولدیت سے اسکول میں داخل ہیں۔ وہ اختر کے ساتھ مل کر ایک فلم کی تیاری میں ہیں۔ اس فلم میں ہیروئن اختر طوائف ہے اور میوزک ڈائریکٹر وہ خود ہیں لیکن اس فلم کے شروع ہونے سے پہلے ہی، اختر فلم کو اپنے ساتھ لے کر ہمیشہ کے لئے دوبئی چلی جاتی ہے۔ وہ ایک عرب کے بڑھاپے کو جوان خواب دکھاتی ہے اور ریال کماتی ہے اختر کے دونوں لڑکے اب شمشاد خان کے ساتھ ہیں۔ وہ پنج وقتہ نمازی بن جاتے ہیں، ان نمازوں سے جب انہیں فرصت ملتی ہے تو ان لڑکوں کو پاس بٹھا کر اپنی آخری دوبائی گئی ہوی ہوئی فلم کی دھنوں کو عبادت کی طرح گاتے ہیں۔ اور چپ چاپ آنسو بہاتے ہیں۔ ان کے لئے لکھے ہوئے گیت ندا

پرائیویٹ کیسیٹ اور فلموں میں دے چکا ہے۔

آج گیلری سے اسے جس طرح دنیا نظر آتی ہے، اس نے اس میں ایک ساتھ کئی خواہشیں جگادی ہیں، وہ چاہتا ہے، بچپن کی طرح بہت سے پیسے چڑی مار کو دے کر بہت سی چڑیاں اس کے پنجرے سے آزاد کروادے۔ وہ چاہتا ہے شام ہوتے ہی کسی قبرستان میں جائے اور کسی ایک قبر پر ڈھیر ساری اگربتیاں جلائے اور ایک ساتھ کئی قبروں پر فاتحہ پڑھ کر چلا آئے۔ وہ چاہتا ہے، سمندر کے کنارے کسی سنسان گوشے میں بیٹھ کر آتی جاتی لہروں پر کئی بھولے بسرے چہرے بنائے۔ وہ چاہتا ہے ماضی کی کسی خوشی کو یاد کر کے اتنا ہنسے کہ آنکھوں میں آنسو چمک اٹھیں۔

اسے یاد آتا ہے، ایک لمبے عرصے سے، اسے اچھی طرح رونے کی فرصت ہی نصیب نہیں ہوئی۔ جمیل فاطمہ کے گذر جانے کا جب اسے تار ملتا ہے وہ دوستوں میں گھرا ہوتا ہے۔ مرتضٰی حسن کا غم روزی روٹی یا دانہ پانی کی بھاگ دوڑ میں کہیں چھوٹ جاتا ہے اور بھی کئی چھوٹے بڑے دکھ اسی طرح آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ وقت کے اس پورے دور میں اس کا سارا رونا آنکھوں سے دور، اس کے اندر کہیں جمع ہوتا رہتا ہے اور وہ لگاتار ہنستا رہتا ہے۔

شہر میں سب کو کہاں ملتی ہے رونے کی جگہ
اپنی عزت بھی یہاں ہنسنے ہنسانے سے رہی

کچھ دیر وہ گیلری میں کھڑا رہ کر اندر آتا ہے۔ بلب روشن ہونے میں ابھی تھوڑی دیر ہے۔ اکیلے گھر میں شام ڈرائنگ روم میں بیٹھی دھوپ کے خط میں آخری سطریں لکھ رہی ہے۔ میز پر رکھی گھڑی کی سوئی ایک دائرہ میں گھوم رہی ہے۔ بارہ تک چکر پورا کر کے وہ پھر بارہ کے نشان کو چھونے کے لئے گھومتی ہے۔ سال، مہینے، ہفتے، دن، دوپہر، شام بنتے جاتے ہیں، مٹتے جاتے ہیں۔ یہ گھڑی مرتضٰی حسن نے، جب وہ گوالیار سے کراچی واپس جا رہے تھے، اسٹیشن پر اپنے ہاتھ سے اتار کر ندا کو دی تھی۔ یہ گھڑی انہیں ان کے والد علی حسین سے ورثہ میں ملی تھی۔ آج سے آٹھ سال پہلے گوالیار اسٹیشن پر بھی اس میں شام کا یہی وقت

تھا۔ تب سے اب تک نہ جانے یہ کتنے چھ بس جا چکی ہے۔ یہ گھڑی کتنی پرانی ہے یہ تو نہیں معلوم لیکن جب مرتضیٰ حسن نے اسے یہ دی تھی، اس وقت شاید انہیں وقت کے ناپنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ عمر کے ۸۰ سال پورے کر کے خود وقت بن چکے تھے۔ ان کے ساتھ وقت صحت اور زندگی کا فرق ختم ہو چکا تھا۔ اس گھڑی کے آٹھ سال پہلے کے چھ بس پر ان سے ندا کی آخری ملاقات ہوئی تھی۔ مرتضیٰ حسن کی والدہ علی گڑھ کے پاس ڈبائی میں مدفون ہیں۔ ان کے والد کی قبر گوالیار میں خواجہ خانوں کے احاطے کے باہر ہے۔ وہیں کراچی جانے تک کی ان کی محبوبہ زبین دفن تھیں۔ وہ خود کراچی میں ابدی نیند میں محو ہیں۔

"گذرے ہوئے کل میں کوئی ترمیم ممکن نہیں۔ آنے والا کل غیر یقینی ہے۔ صرف آج ہی یقینی ہے، اسی کو، یہ جب تک تمہارے ساتھ ہے جیسا چاہو جی لو...... زرتشت۔"

ندا نہاتا ہے اور پھر نئے کپڑے پہن کر خاموش ایک کرسی میں بیٹھ جاتا ہے۔ وہ دیر تک یوں ہی بیٹھا رہتا ہے۔ وہ رونا چاہتا ہے۔ لیکن بہت دنوں سے رکے ہوئے آنسو اندر ہی اندر لہراتے ہیں، آنکھوں تک آنے کا راستہ وہ بھول چکے ہیں۔ وہ آنسوؤں کی اس بھول پر مسکراتا ہے۔

اسے اس طرح اکیلے میں رونا اچھا لگتا ہے۔ رونے کے بعد اسے لگتا ہے، دھوپ اور پانی کی طرح کبھی کبھی کا رونا بھی آدمی کیلئے بہت ضروری ہے۔ وہ روئے ہوئے دکھوں کو، نا روئے ہوئے دکھوں سے الگ کر کے اٹھتا ہے اور باہر نکل جاتا ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے، مکان سے باہر آکر بھی وہ مکان کے کسی کونے میں بیٹھا ان دیواروں کو دیکھ رہا ہے جن سے اس کا ابھی اچھی طرح تعارف نہیں ہوا ہے۔ پتھر آدمی کی طرح جلد بے تکلف نہیں ہوتے۔ انہیں گفتگو میں شامل کرنے کے لئے ان کے ساتھ کچھ زیادہ وقت گذارنا پڑتا ہے۔ پھر وہ دور ہوں یا پاس، آدمی کی تنہائیوں میں شریک رہتے ہیں۔ کھوئے ہوئے راستے، بھولے ہوئے روشن دان، بچھڑی ہوئی دوکانیں، شناسا گلیاں جن کے ساتھ کچھ وقت گذر چکا ہوتا ہے۔ اپنے بن جاتے ہیں۔ پھر وہ بولتے ہیں۔ کبھی کبھی بہت بولتے ہیں۔ ان کے پاس بھولی ہوئی ساری یادیں محفوظ

رہتی ہیں۔ پھر وہ اینٹ پتھر نہ رہ کر جیتے جاگتے کردار بن جاتے ہیں۔ اور یادوں کو بوڑھا نہیں ہونے دیتے۔

جارجٹ کے کرتے، نمازی دوپٹے، ان میں ہنستے ہوئے چاند، پایل پہنے چنچل گلیاں، کھڑکیوں کے پردوں سے جھانکتی روشنیاں، نیبو کے پیڑ کے نیچے بکھرے ہوئے دھوپ کے چھلے اور ان میں بولتی ہوئی دھیمی سرگوشیاں، بابو رنگریز کا لٹا ہوا گھر، چھوٹے چھوٹے خطوں میں لمبی لمبی کہانیاں، اندھیرے کونوں میں چلتے پھرتے اجلے اجلے وعدے، اسٹیشن سے کھسکتی ہوئی ٹرین، دور ان کی کھڑکیوں سے ہلتے ہوئے چوڑیوں والے ہاتھ، خاموش راستوں پر پہرہ دیتے ہوئے کتے، سیاستوں سے بنتے ہوئے رشتے اور نہ جانے کیا کیا۔ ان گلی کوچوں میں آج بھی اسی طرح محفوظ ہیں جیسے وہ برسوں پہلے تھے۔

ندا پچھلے کئی مہینوں سے گوالیار نہیں گیا ہے۔ وہ بہت کچھ بھولتا جا رہا ہے۔ اب تو اخبار میں کسی جانی پہچانی خوشی یا کسی شناسا غم کی خبر نظر سے گذرتی ہے، تو بھولا ہوا بہت کچھ یاد آنے لگتا ہے۔

موتی لال شرما، بھوپال میں ایک کار سے ٹکرا کر سڑک پر ہی ڈھیر ہو گئے۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری اور ندا کے کالج کے دنوں میں اسٹوڈنٹ فیڈریشن کے لیڈر تھے۔ چھریرے بدن کے، خوش لباس، کافی پڑھے لکھے شخص تھے۔ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھے۔ لیکن اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی، سرکاری نوکری کے خلاف تھے۔ آئی اے ایس کی تیاری کرتے کرتے مارکسزم سے دلچسپی ہو گئی۔ ماں باپ کے برسوں کے خواب کو ادھورا چھوڑ کر دنیا کے محنت کشوں کو ایک پرچم تلے اکٹھا کرنے کے ادھورے سپنے کو پورا کرنے میں لگ گئے۔ سیاست کے ساتھ ادب کے بھی اچھے قاری تھے۔ ان کی شخصیت کی علمیت اور انقلاب پسندی نے شہر کے بہت سارے نوجوانوں کو ان کا پرستار بنا دیا۔ وہ جب بھی کوئی نئی کتاب پڑھتے تھے، شام کو اپنے نوجوان پرستاروں میں بیٹھ کر اس کتاب پر اس خوبصورتی سے تبصرہ کرتے کہ دوسرے دن سے کتابوں کی دوکانوں پر اس کی تلاش شروع

ہو جاتی تھی۔ وہ صبح دس بجے سے شام ہونے تک پارٹی آفس میں رہتے تھے۔ ان کے آنے سے پہلے ہر صبح ان کی ماں اس آفس کی صفائی کرنے آتی تھی۔ جھاڑو، کٹکا اور نل سے مٹکے میں پانی بھرنا ان کا روز کا معمول تھا۔ وہ پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ لیکن مارکس اور لینن کو اس لئے دیوتا سمجھتی تھیں کہ ان کا بیٹا ان کو اپنا گرو مانتا تھا۔ صبح جب وہ صفائی کے لئے آتی تھیں تو اپنے گھر کے سامنے کی چنبیلی سے دو ہار پرو کر پابندی سے لاتی تھیں اور ان تصویروں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر ان پر ڈال دیتی تھیں۔ وہ پارٹی میں آنے جانے والوں کی مشترکہ ماں تھیں۔ انہیں صرف ایک ہی چنتا ستاتی تھی۔ جس کا ذکر وہ اکثر پارٹی کے لوگوں سے کرتی رہتی تھیں۔ موتی لال ۳۵ کو پار کر کے بھی کنوارے تھے اور ماں جی اپنے جیتے جی انہیں اپنی ہی طرح کی کسی دوسری عورت کے حوالے کر دینا چاہتی تھیں جو ان کے بعد ان کا خیال رکھے۔ موتی لال کے پاس ایسی غیر ضروری باتوں کے لئے وقت تھا نہ فرصت۔ انہوں نے پارٹی کو کافی پھیلا دیا تھا۔ اس پھیلاؤ کے ساتھ ان کے پاس وقت کم ہو گیا تھا اور کام زیادہ ہو گئے تھے۔ کہیں کسی سرکاری ناانصافی کے خلاف بھوک ہڑتال پر بیٹھے ہیں، کہیں فساد میں پولس کے لئے اقلیتی علاقوں کا چکر لگا رہے ہیں، کہیں مجمع لگائے تقریر کر رہے ہیں۔ اس بھاگ دوڑ میں انہیں کھانے پینے کے اوقات بھی یاد نہیں رہتے تھے۔ ان کی ماں ان کے کھانے کا ٹفن لئے ادھر اُدھر بھٹکتی رہتی تھیں لیکن ٹفن کو موتی لال مشکل سے ہی ملتے تھے۔ اکثر یہ پارٹی ورکر کے کام آتا تھا۔ ماں کے انتقال کے بعد وہ، ماں کی آرزو پوری کرتے ہیں اور ڈھلتی عمر میں ، اندور کی ایک ڈھلتی عمر کی لیکچرر سے شادی کر لیتے ہیں۔ ان کی بیوی بھی ان کی ماں کی طرح، ان کی ہی محبت میں پارٹی کی وفادار بن جاتی ہیں۔ شادی کے بعد، مدھیہ پردیش کا ہیڈ آفس، ان کو بھوپال بلا لیتا ہے۔ جہاں کسی کی کار، ان کے مٹھی بھر ہڈیوں والے جسم سے ٹکرانے کا انتظار کر رہی تھی۔ یہ حادثہ اتفاقی تھا یا سازشی ؟ یہ راز ابھی تک راز ہے۔

گوالیار میں گھر سے بے گھر ہو جانے کے بعد ندا کو انہوں نے پارٹی آفس کے نیچے رہنے کی جگہ دی تھی۔ وہ جب پارٹی آفس میں ہوتے، تو اپنے ٹفن میں ندا کو ضرور شریک

کرتے تھے۔ کبھی کبھی کا یہ ٹفن ان دنوں ندا کے لئے بہت اہم تھا۔ موتی لال اب دنیا میں نہیں رہے لیکن ندا اب بھی جب گوالیار جاتا ہے تو کئی راستوں پر ان سے ملتا ہے۔ کہیں تقریر کرتے ہوئے، کہیں کالج کے لڑکوں سے کسی نئی پڑھی ہوئی کتاب پر بات کرتے ہوئے۔ کہیں کسی جلوس کی رہنمائی کرتے ہوئے۔!

جانے والوں سے رابطہ رکھنا

دوستو! رسم فاتحہ رکھنا

غریبی ہٹاؤ کا نعرہ امیر بن کر آرام کی نیند سو رہا ہے۔ جرمن کے ایک تفتیشی ادارہ ٹی۔ آئی۔ او نے اپنی حالیہ رپورٹ میں دنیا کے دس نادار اور بد کردار دیشوں کی فہرست میں سب سے اوپر ہندوستان کا نام رکھا ہے۔ اس مقابلے میں اس نے پاکستان اور فلپائین کو بھی کوسوں پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

چرچل نے آج سے پچاس سال پہلے بطور پیشن گوئی کہا تھا، ”ہم بھارت کی باگ ڈور ان مٹھی بھر جنگلی ہاتھوں میں سونپ رہے ہیں جو بہت جلد اسے جنگل بنا دیں گے“۔

ندا سوچتا ہے موتی لال اگر اپنی ماں کی زندگی میں گھر بار کے ہو جاتے تو کم سے کم ماں جی کو تو خوش کر سکتے تھے ندا سوچتا ہے اگر وہ آئی ایس ہو جاتے تو کچھ آرام کر کے مرتے۔

بھاگتی ہوئی لوکل کی کھڑکی سے ٹکا ندا ایک میگزین کے صفحے پلٹ رہا ہے۔ اس میں کئی جگہ عبارتوں پر کالی سیاہی پتی ہوئی ہے۔ ہر مضمون بے ربط اور بے معنی سا لگتا ہے۔ اندرا گاندھی نے عدالت کے فیصلہ کو ٹھکرا کر ایمرجنسی نافذ کر دی ہے۔ لوگوں کی گویائی اور لکھائی پر پہرے بٹھا دیے گئے ہیں۔ پولس جسے چاہتی ہے بنا کسی وجہ کے حراست میں لے لیتی ہے۔ شمشاد خان کو مسلمان سمجھ کر بند کر دیا گیا ہے۔ ان کی سابق بیوی اختر کے دونوں لڑکے جو ہندو ناموں سے جونیئر آرٹسٹ کے رجسٹر میں شامل ہیں اس کی خبر ندا کو دیتے ہیں۔ شمشاد کے پردیپ ہونے کا ثبوت کئی دن بعد بتایا جاتا ہے۔ اور انہیں مشکل سے جیل سے آزاد کرایا جاتا ہے۔

لوکل دو اسٹیشنوں کے درمیان رکی ہوئی ہے۔ ریلوے لائن کے قریب بنی کھولیوں سے بچے نکل کر مسافروں کے سامنے ہاتھ پھیلا رہے ہیں۔ گاڑی چلتی ہے۔ ان میں سے ایک بچہ، اس آدمی کو اپنی عمر سے ایک بڑی گالی دیتا ہے، جس کے ہاتھ اس کی لمبی گڑگڑاہٹ کے باوجود جیب میں داخل نہیں ہوتے...... ندا کو یہ گندی گالی بہت پاک صاف لگتی ہے۔ اسے لگتا ہے، کھولیوں میں جنم لینے والی گالیاں بہت دنوں تک کھولیوں تک محدود نہیں رہتیں ان کی دنیا بڑی ہو جاتی ہے۔ کمپارٹمنٹ میں مسافر بھیڑ بکریوں کی طرح بھرے ہیں۔ ٹرین کے رفتار پکڑتے ہی ندا کے ذہن میں جارج ایلیٹ کے کسی ناول کا ایک کردار ابھر آتا ہے...... انجن کی بھٹی میں کوئلہ جھونکتے جھونکتے انجن ڈرائیور اچانک پاگل ہو جاتا ہے۔ ٹرین بنا کنٹرول کے بھاگتی رہتی ہے۔ پاگل، جو بٹن چاہتا ہے دباتا ہے جو ہینڈل چاہتا ہے گھماتا ہے۔ ایک دیوانے کی دیوانگی کے ہاتھ میں پوری ٹرین ہے۔ سینکڑوں مسافر ہیں۔ عورتیں بچے جوان بوڑھے ان میں ندا بھی ہے۔ گاڑی پٹری سے اتر کے نیچے سمندر میں گر جاتی ہے کئی لوگ اس حادثے کا شکار ہوتے ہیں۔ بہت سے اپنے ہاتھ پاؤں کھوتے ہیں۔ بعد میں انکوائری ہوتی ہے۔ حادثہ کے کارن تلاش کئے جاتے ہیں۔ کچھ اس کا رشتہ پڑوسی ملک کی سازش سے جوڑتے ہیں۔ کچھ اس میں دوبئی کے کسی ان دیکھے چہرہ کا عکس دیکھتے ہیں۔ ریلوے کا اشتہار شائع ہوتا ہے۔ جو مر چکے ہیں ان کے وارثوں کو پانچ پانچ ہزار دئے جائیں گے۔ زخمیوں میں ہر ایک کو پانچ سو روپے ملیں گے۔ ہسپتال میں لوگ پڑے ہیں نرسیں مریضوں کے ارد گرد گھوم رہی ہیں......

ندا اچانک چونک کر انجن ڈرائیور کی صحت اور ذہن کی سلامتی کی دعا مانگتا ہے۔ ایک کے پاگل پن سے کتنی ساری زندگیاں وابستہ ہیں۔

ندا کے دیکھتے دیکھتے ممبئی بہت کچھ بدل جاتی ہے۔ رستوں پر لگی تختیوں پر پرانے نام مٹا کر نئے نام لکھ دئے جاتے ہیں۔ ماہم سے ری کلیمیشن کی طرف مڑتی ہوئی سڑک کا نام اب کرشن چندر مارگ ہے، بائیکلہ پر نیا پل تعمیر ہو چکا ہے۔ ریل اور بس کے کرائے تگنے چوگنے

ہو گئے ہیں۔ شہر میں گاڑیاں اتنی ہو گئی ہیں کہ کچھ علاقوں میں تو گاڑی کھڑی کرنے کے لئے کافی وقت خرچ کرنا پڑتا ہے۔ گاڑیوں کے ساتھ گاڑیوں کے پیچھے بھاگنے والے بھکاریوں کا بھی اضافہ ہوا ہے۔ اس تیز رفتار بستی میں ندا کی آہستہ خرامی بھی خوب ہے۔ بستی کہاں سے کہاں پہونچ گئی اور وہ ابھی تک صرف چمبور کے پانجراپول کی ٹین کی کھولی سے باندرہ پالی ناکہ کے ہوسٹل، باندرہ کے ہوسٹل سے باندرہ ایسٹ میں سرکاری کوارٹر میں غیر قانونی کرائے کے کمرے اور وہاں سے کھار میں اپنے مکان تک ہی آپایا ہے۔ حساب لگایا جائے تو وہ بیس سال مسلسل چلنے کے بعد، بس یا لوکل کا بہ مشکل ایک گھنٹے سے بھی کم کا ہی فاصلہ طے کر پایا ہے۔

وہ سوچتا ہے زندگی کی بنیادی ضرورتیں آسمان کی نعمتیں کیوں بن جاتی ہیں۔ آسمان سے زمین پر اترنے میں انہیں اتنی دیر کیوں لگتی ہے۔ بھوک ختم ہو جانے کے بعد روٹی، پیاس مٹ جانے کے بعد پانی ملے بھی تو کس کام کا۔ ندا کی آنکھوں پر اب چشمہ لگ چکا ہے۔ بالوں سے سفیدی جھانکنے لگی ہے۔ دن چھوٹے ہونے لگے ہیں، راتیں لمبی لگنے لگی ہیں۔

کہیں چھت تھی، دیوار و در تھے کہیں، ملا مجھ کو گھر کا پتہ دیر سے
دیا تو بہت زندگی نے مجھے، مگر جو دیا وہ دیا دیر سے

ہوا نہ کوئی کام معمول سے، گذارے شب و روز کچھ اس طرح
کبھی چاند چمکا غلط وقت پر، کبھی گھر میں سورج اگا دیر سے

کہیں رک گیا راہ میں بے سبب، کہیں وقت سے پہلے گھر آئی شب
ہوئے بند دروازے کھل کھل کے سب، جہاں بھی گیا میں گیا دیر سے

سجا دن بھی روشن ہوئی رات بھی، بھرے جام لہرائی برسات بھی
رہے ساتھ کچھ ایسے حالات بھی، جو ہونا تھا جلدی ہوا دیر سے

اس غزل کا آخری شعر یوں ہے۔ (اس شعر کو ندا نے پہلے بھی کئی بار الگ الگ انداز میں کہا ہے۔ آدمی کے ذریعہ خدا کی تلاش اس کا خاص موضوع ہے)

بٹھکتی رہی یوں ہی ہر بندگی، ملی نہ کہیں سے کوئی روشنی
چھپا تھا کہیں بھیڑ میں آدمی، ہوا مجھ میں روشن خدا دیر سے

مکتبہ جامعہ میں حسب معمول چہل پہل ہے۔ شاہد علی خان کے یہاں سے دہلی منتقل ہو جانے کے بعد بھی، شام ہوتے ہی یہاں نئے ادیبوں اور شاعروں کی بھیڑ جٹ جاتی ہے۔ باقر مہدی، فضیل جعفری، انور خان، سلام بن رزاق، انور قمر، عنایت اختر، عزیز جاوید، ساجد رشید، گریش دمیا اور ایسے ہی بہت سے دوسروں میں باقر مہدی سب سے سینئر ہیں۔ ان کے تنقیدی ارشادات، (جو بیشتر زبانی ہوتے ہیں) میں طبقاتی کشمکش کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے۔ ان کے باغیانہ مزاج نے کبھی کوئی ذریعہ معاش پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کے ملنے جلنے والوں میں جب بھی کوئی ان کی اس روایت سے انکار کی جرأت کرتا ہے تو ان کی زبانی تنقید کے عذاب کا شکار بن جاتا ہے۔ اختر الایمانؔ فلموں کے کامیاب مکالمہ نگار بنتے ہی گھٹیا شاعر ہو جاتے ہیں۔ ساحرؔ بہت پہلے سے کمزور شاعر بن چکے ہیں۔ مجروحؔ حکیم اسرار زیادہ ہیں، مجروحؔ سلطان پوری کم ہیں۔ ندا فاضلی ریلوے کے سرکاری کوارٹر کے کمرے سے اپنے خریدے ہوئے مکان میں منتقل ہو گیا ہے۔ اس لئے وہ مقتدئی حسن بن کر ناکارہ ہو گیا ہے۔ سردار جعفریؔ سے ان کے اختلافات بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔

آج کل ان کی تنقیدی کرم فرمائیاں ممبئی کے ایک شاعر عزیز جاوید کی غزلوں پر مہربان ہیں۔ اس مہربانی کی وجہ اس کا افلاس ہے۔ ان کی چار غزلیں انہوں نے اپنے رسالہ ''اظہار'' کی پانچویں کتاب میں بھی شامل کی ہیں عزیز جاوید احمد آباد سے ممبئی آکر بسے ہیں ان کی شاعری اور بے روزگاری کا رشتہ بھی باقر مہدی ہی کی طرح برسوں سے استوار ہے۔ فرق صرف اتنا ہے باقر صاحب شادی شدہ ہیں ان کی بیگم ایک مقامی کالج میں شعبہ فارسی سے منسلک ہیں اور عزیز جاوید کو انکے شعری مزاج نے ان سہولتوں سے بھی محروم کر دیا ہے۔ ان کا دن ممبئی کی

لمبی چوڑی سڑکوں پر، شام مکتبہ جامعہ کی فٹ پاتھ پر اور رات کسی میخانے میں روشن ہوتی ہے۔ ممبئی میں بے روزگاری بھی ایک روزگار ہوتا ہے۔ عزیز جاوید کے ہر شناسا کی جیب میں ہر روز ان کے دو چار روپے ہوتے ہیں جو ان کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ اور بنا مانگے انہیں ملتے رہتے ہیں۔ بنا محنت کی اس آسان آمدنی نے ان سے شاعری کم کروائی ہے، شراب زیادہ پلوائی ہے۔ وہ بڑی آن بان کے آدمی ہیں۔ نام کے آگے مرزا لگاتے ہیں اور دوسروں سے بھی اسی تخاطب کا تقاضہ کرتے ہیں۔ جب کوئی دوست ان کی شراب نوشی پر انہیں ٹوکتا ہے تو وہ نہ صرف اس ٹوکنے والے سے خفا ہو جاتے ہیں بلکہ اس کی جیب میں پڑے اپنے پیسے لینا بھی بھول جاتے ہیں۔ وہ کسی زمانے میں ترقی پسندوں کے حلقہ میں رہے ہیں۔ اب ان کی ترقی پسندی' نصیحت کرنے والوں کو بورژوا اور اپنی بے اعتدالیوں کو پرولتاری سمجھنے تک محدود ہے۔ کتاب کم کھولتے ہیں، زندگی کو زیادہ ٹٹولتے ہیں۔ ان کی بے اعتدالیوں میں کچھ دنوں سے ایک دبلے پتلے لڑکے کا بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ لڑکا دن میں ایک پرائمری اسکول میں مدرسی کرتا ہے اور شام ہوتے ہی عزیز جاوید کا ہمسفر بن جاتا ہے۔ اس ہم سفری کی دفاع میں وہ اکثر میر تقی میؔر کا ایک مصرع دہراتے ہیں، اور دہرانے کے بعد ہچکیوں والا قہقہہ لگاتے ہیں۔

اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

بیچ مجمع میں عزیز جاوید کے منہ سے یہ مصرع سن کر وہ لڑکا پہلے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھتا ہے پھر آنکھیں پھیلا کر مسکرانے لگتا ہے۔ عزیز جاوید غزل کے ڈھنگ کے شاعر ہیں۔ ان کے لفظوں کا مجموعی مزاج غنائی ہے۔ جن میں روایتی تہذیب کے ساتھ مشاہداتی چمک کی آمیزش ہے۔ آخری دور کی غزلوں میں جو ان کے مجموعہ "شہر مدفون" میں شامل ہیں۔ ان کے یہاں غزل کے سکہ بند موضوعات ولفظیات سے شعوری گریز ان کی تخلیقی بیداری کی گواہ ہے۔ لیکن اس تبدیلی کو اور زیادہ رچانے اور گہرانے کی وقت نے انہیں مہلت نہیں دی۔ جو تھوڑا بہت وقت انہیں ملا۔ اس کا بڑا حصہ ان کے بوہیمین رویہ نے ہتھیالیا۔

سرخیاں دیکھ کے یوں لگتا ہے اخباروں کی
رات آسان ہوئی جاتی ہے بیماروں کی

اسی غزل میں عزیز جاوید نے اپنے بارے میں یوں بھی پیشین گوئی کی تھی۔

صرف دس پانچ ہی افراد ہیں کاندھے کے لئے
میتیں یوں ہی اٹھا کرتی ہیں ناداروں کی

پتہ نہیں ان کی یہ پیش گوئی کتنی سچ ثابت ہوئی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس شعر کی تخلیق کے کچھ دن کے بعد جب اس سانحہ کی خبر ملی تو کسی کو زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ وہ تو بہت پہلے سے موت کو ہر وقت اپنے ساتھ لگائے پھرتے تھے۔ کبھی جیب میں، کبھی گلے تک پیٹ میں۔ ان کے یار دوست بھی انہیں اس کے ساتھ دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے۔ ان کی تدفین میں ندا شامل نہیں ہو پایا۔ روز کے ملنے جلنے والے کی اچانک موت نے اسے دہلا سا دیا ہے۔ اسے اپنے آپ سے ڈر لگنے لگتا ہے۔ لیکن ان دس پانچ میں ایک باقر مہدی بھی ہوتے ہیں۔ عزیز جاوید کے لئے بھی ان کے پاس کچھ آنسو محفوظ تھے۔ باقر مہدی دوسروں کی خوشی میں بھلے ہی نہ ہنسیں، لیکن ان کے آنسو اپنے پرائے کے دکھوں کی خیر خبر ضرور رکھتے ہیں۔ میر ابائی نے کہا ہے۔

وپد پڑے کوئے نکٹ نہ آوے
سکھ میں سب کو سیر!

باقر مہدی اپنے مزاج سے شروع سے اس کے بالکل برعکس ہیں۔ وہ سکھ میں دور اور دکھ میں قریب رہتے ہیں۔

☆☆☆

اپنی مرضی سے کہاں اپنے سفر کے ہم ہیں
رخ ہواؤں کا جدھر کا ہے ادھر کے ہم ہیں

عزیز جاوید ممبئی میں آنے سے پہلے احمد آباد کے کسی علاقے میں تھے وہ اپنے نام کے ساتھ "مرزا" لگاتے تھے۔ اس لقب سے معلوم ہوتا ہے وہ احمد آباد کے ہوتے ہوئے بھی گجراتی نہیں تھے! مرزا کی مناسبت سے ان کا شجرہ ہندوستان میں مغلوں کی آمد سے شروع ہو سکتا ہے۔ عمر شیخ مرزا (بابر کے والد) کے فرغانہ سے اکھڑ کر مغل، ہندوستان میں کابل کے راستے سے آئے تھے۔ جہاں سے وہ ادھر آئے تھے۔ وہاں وہ کتنی نسلوں سے آباد تھے۔ وہاں بسنے سے پہلے ان کے بزرگوں کے بزرگ کن کن زمینی خطوں سے گذرے کہاں کہاں اپنے قریب و دور کے رشتہ داروں کی قبریں تعمیر کیں۔ ان میں کون صوفی تھا، کون سپاہی، کون شاعر، عہد بہ عہد بدلتی اس انسانی حیات کا سلسلہ کہاں سے کہاں تک پہونچتا ہے۔

ایک پیڑ، پیڑ میں ہر موسم میں ہزاروں پھل، ہر پھل میں کئی کئی ہزار بیج، ہر بیج میں ہزاروں درخت۔

"تو شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا، اور کہا آدم! میں تم کو ایسا درخت بتاتا ہوں جو زندگی کی ہمیشگی کا ثمرہ ہے۔ اور پھر جب ان دونوں نے اس نشان زدہ درخت کا پھل توڑ کے کھالیا تو یوں ہوا ان پر ان کی شرم گاہیں ظاہر ہو گئیں۔ اور وہ گھبرا کر اپنے بے پردہ حصوں پر بہشت کے پتے چپکانے لگے۔ پھر ان کے پروردگار نے انھیں نوازا، ان پر مہربانی سے توجہ

فرمائی اور فرمایا تم دونوں یہاں سے اتر جاؤ اور زمین کو بساؤ۔"

زمین پر آسمان سے اترنے والے یہ پہلے مرد اور عورت تھے۔

پھر اندھیروں میں اچانک سورج چمکا۔ سورج کی روشنی میں مرد نے عورت کو دیکھا اور پھر چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ اندھیروں میں سے جب وہ باہر آئے تو دونوں بھوکے تھے۔ ان کی بھوک نے پہاڑ سے پتھر کاٹا اور اسے اڑتے پرندے کے پیچھے لگا دیا پتھر نے تھوڑے سے تعاقب کے بعد پرندے کو مار کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ پرندے نے ان کی بھوک مٹائی اور پھر انہیں گہری نیند آئی۔ نیند میں انہیں جنت کی نہر جیسی ایک پرسکون ندی نظر آئی اور وہ اپنے جسموں سے پتے ہٹا کر اس میں اتر گئے۔ ندی میں ٹھنڈے ہو کر جب وہ ابھر کر باہر آئے تو ان کے ساتھ ان جیسا ہی ایک اور وجود تھا۔ انہیں اس طرح ندی میں اترنا اور پھر ابھرنا بہت اچھا لگا اور اس طرح ہر بار ان کی گنتی میں اضافہ ہوتا رہا۔ دن مہینہ میں، مہینہ سال میں اور سال صدی میں ڈھلتا رہا۔ آتا جاتا موسم، زر، زن، زمین میں بدلتا رہا۔ کبھی تلوار کا لوہا ٹوٹا، کبھی تسبیح سے شعلہ پھوٹا ان گنت ناموں کی ایک لمبی چوڑی بھیڑ۔ ان میں ایک نام عزیز جاوید، موجودہ مذہب اسلام، زبان اردو، وطن ممبئی کی پیدل چلتی گئی جانی انجانی گلیاں۔

وقت کے ساتھ ہے مٹی کا سفر صدیوں سے
کس کو معلوم کہاں کے ہیں کدھر کے ہم ہیں

عزیز جاوید نے شادی نہیں کی۔ شاید یہ انکے لئے ممکن بھی نہ ہو۔ ممبئی میں جتنی آسانی سے عورت مل جاتی ہے اتنی آسانی سے گھر نہیں ملتا۔

جوہو بیچ پر گھومتے ہوئے ایک بے گھر آدمی کا دایاں پاؤں ریت پر لڑھکتے ہوئے ناریل کے ایک خول پر لگ گیا۔ اماوس کی رات تھی۔ سمندر ہاتھ میں موجوں کی مالا لیے شانت بیٹھا تھا۔ ہوا، ستارہ، اور آکاش تینوں اس ٹھوکر سے پہلے گردش کے مرکزی نقطے پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ ناریل کے خول میں اچانک بیدار ہو کر، جادوئی دیو دھوئیں کے لمبے چوڑے طوفان کی طرح ظاہر ہوا۔ اس کا سر آسمان کو چھو رہا تھا اور پیر سمندر کے دونوں کناروں پر ٹکے تھے۔ اس

کے منہ سے ایک آواز گونجی، سمندر، ہوا اور ستارے کے ملن کے وقت تم نے مجھے جگایا ہے۔ بولو میرے آقا آسمان اور زمین کے درمیان وہ کون سی خواہش ہے جو تم مجھ سے پوری کروانا چاہتے ہو۔ وہ کون سا نا ممکن عمل ہے جو میری دسترس سے باہر ہے۔ بولو، بولو کیا چاہئے تمہیں۔

بے گھر آدمی حیرت سے اسے دیکھتا ہے۔ اور اپنی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ مجھے گھر چاہئے۔ چھوٹا سا ایک گھر جہاں میں اپنی نیند سو سکوں، جہاں اپنے بستر سے جاگ سکوں، یہ سنتے ہی دیو کا اونچا سر جھک گیا۔ بے گھر آدمی غصہ سے چلاتا ہے۔ سنا نہیں تم نے، حکم کی تعمیل میں اتنی دیر کیوں؟ دیو کی آواز ڈر کے مارے آدمی کی آواز جیسی کمزرو اور نحیف ہو گئی تھی۔ اس نے اسی آواز میں کہا۔ یہ کام میری طاقت سے باہر ہے۔ میرے آقا!

کیوں؟ ایسا کیوں ہے!

”خدا نے شیطان، جن، اور انسان، سب کے کام کے دائرے طے کئے ہیں۔ ممبئی میں مکان دینے دلانے کا کام میرا نہیں ہے۔ اس کام کیلئے شیطان کا انتخاب کیا گیا ہے۔

تم جھوٹ بولتے ہو

مالک میں جھوٹ نہیں بولتا۔ میں بھی آپ ہی کی طرح بے گھر ہوں۔ اسی لئے اس خالی ناریل میں سمٹ کے رہتا ہوں۔ کوئی اور کام آقا۔

نہیں...... تم جاؤ اور پھر سے اپنے گھر میں سو جاؤ۔

عزیز جاوید جس جھونپڑی سے صبح سو کر نکلتے تھے وہ ایک کچی شراب کا دھندا کرنے والے کی جوان بیوہ کی تھی۔ شروع میں وہ، وہاں نمک کے ساتھ کچی شراب سے غم بہلانے جاتے تھے بعد میں لمبے ادھار کے بدلے میں بیوہ کو ماں بننے کی عزت بخش کر، اس کے ساتھ اس کے مرد کی حیثیت سے رہنے لگتے ہیں۔ عورت کے پاس گھر تھا اسے کسی مرد کی ضرورت تھی، مرد بے گھر تھا اسے کسی چھت کے تلے لیٹ کر خواب سوچنے کی عادت تھی۔ ان دو مجبوریوں کے سمجھوتہ نے ایک لڑکی کا روپ دھار لیا۔ اس کی شناخت کے لئے ایک نام رکھا

گیا۔ اس کے نام کے ساتھ جاوید لگا دیا گیا۔ رئیسہ جاوید وہ لڑکی اب اپنے گجراتی شوہر کے ساتھ گجراتی بولتی ہے۔ اور دس دن نوراتری میں ڈانڈیا کھیلتی ہے۔ انیس کا ایک سلام جو محرم کے دنوں میں بہت پہلے اسے یاد کرایا گیا تھا وہ اب اس کے ذہن سے محو ہو چکا ہے۔ اس لڑکی کے چہرہ میں عزیز جاوید کی تھوڑی بہت شباہت ہے۔ لڑکی کے بیٹے میں اس شباہت کے ساتھ ساتھ اب گجراتی شوہر کی صورت بھی شامل ہو گئی ہے وہ مراٹھی اسکول میں مراٹھی پڑھتا ہے۔

مکتبہ جامعہ کے بند ہو جانے کے بعد بھی ادب دیر تک نیچے فٹ پاتھ پر مجمع بازی کرتا رہتا ہے اور جب اس طرح کھڑے کھڑے تھک جاتا ہے تو وہاں سے رینگتا ہوا اسی فٹ پاتھ کی نکڑ کی ہوٹل کے ایک کونے کی کرسیوں میں بیٹھ جاتا ہے۔ ہوٹل کے شور غل میں بھی وہ خاموش نہیں ہوتا۔ مسلسل بولتا رہتا ہے۔ بول بول کر جب تھک جاتا ہے تو وہ روز کی طرح آج کی ساری ادھوری باتیں کل تک کے لئے ملتوی کر کے، نکڑا نکڑاہٹ کر الگ الگ سمتوں میں مڑ جاتا ہے۔ چمبور، کرلا، ملاڈ، دادر، بات بات پر جھنجھلاتے، قہقہے لگاتے، سگریٹوں کا دھواں اڑاتے، اس ادب کو ہر شام ہوٹل میں بٹھانے اور اس کے لئے چائے اور سگریٹ منگوانے کی ذمہ داری کئی لوگ نبھاتے ہیں۔ ان میں کچھ تجارت پیشہ لوگ ہیں جو دن بھر اپنا کاروبار چلاتے ہیں اور شام کو کسی سستی تفریح کی تلاش میں کبھی ادھر بھی نکل آتے ہیں۔ ادب کے ساتھ ان کے دن اور اوقات مقرر ہیں۔ لیکن ایک صاحب روز آکر اپنے سفید ململ کے کرتے کی جیب سے اس کی سرپرستی فرماتے ہیں۔ ان خوش لباس بزرگ کا نام تصدیق احمد ہے۔ ان کا تعلق یوپی کے ایک علاقہ سہاور سے ہے۔ آج سے کئی سال پہلے۔ جب وہ ممبئی میں آئے تھے تب ان کے ہاتھ میں قلم اور دماغ میں کچے پکے رومانس کی کئی ادھوری پوری کہانیاں تھیں۔ ان کہانیوں نے ان کے نام سے احمد نکال کر سہاوری جوڑ دیا تھا۔ ادب وصحافت میں ان کا شوق جوانی کی حدوں تک ہی محدود رہتا ہے۔ ممبئی میں وہ کچھ دن قلم سے دوستی نبھاتے ہیں، کہانیاں لکھتے ہیں، انھیں شائع کراتے ہیں جب اس دوستی سے پریشان ہو جاتے

ہیں تو زندہ رہنے کے لئے دوسرا طریقہ اپناتے ہیں اور اپنے چہرہ کے کھلتے ہوئے رنگ اور خوش گفتاری کا جادو آزماتے ہیں اور جس پریس میں کام کرتے ہیں اسی کے مالک کی لڑکی کو ایک دن آسمان پر کھینچی ہوئی ست رنگی دھنک دکھاتے ہیں اور ایک سے دو بن جاتے ہیں۔ جہاں پہلے ملازم تھے وہیں اب مالک بن کر اپنے جیسے دوسرے ہم پیشہ پر حکم چلاتے ہیں۔ شادی کے بعد دو سال میں ایک لڑکی اور ایک لڑکے کے وجود میں آنے کے بعد آسمان پر تنی ہوئی دھنک اپنے ساتوں رنگ لے کر غائب ہو جاتی ہے۔ شادی سے پہلے اور اس کے بعد کچھ دن تک ،اس دھنک کا کوئی نہ کوئی رنگ دونوں کے درمیان میں رہتا ہے۔ اور پھر جب آسمان خالی ہو جاتا ہے۔ تو یہ بھی نیچے زمین پر آجاتے ہیں جہاں صدیوں سے ، کمانے والا شوہر ہوتا ہے اور کمائی کو آرام سے اڑانے والی بیوی کہلاتی ہے۔ بیوی کی جائداد ، تصدیق کو شوہر سے بیوی اور ان کی اہلیہ رضیہ کو بیوی سے شوہر بنا دیتی ہے۔ بنا آپریشن کے جنس کی یہ تبدیلی سماجی اور اقتصادی حقیقت ہے۔ دن بھر خاموشی سے وہ اپنا یہ نیا کردار نبھاتے ہیں، لیکن سورج ڈھلتے ہی جب وہ اپنی ذمہ داریوں سے مہلت پاتے ہیں تو بیتے ہوئے دن رات انھیں یاد آتے ہیں، وہ ساری ادھوری کہانیاں جنہیں وہ اپنے سر کے کسی کونے میں برسوں سے چھپا کر بھولے ہوئے تھے۔ ان کے کردار اچانک جاگ جاتے ہیں جب یہ کردار ماضی کی آوازوں میں زیادہ شور مچاتے ہیں تو وہ حال کی کسی دوکان سے گلوری لے کر منہ میں رکھتے ہیں اور سیدھے مکتبہ جامعہ چلے آتے ہیں۔

کبھی کبھی زندگی تھوڑا دے کر اتنا زیادہ وصول کرتی ہے کہ آدمی ہمیشہ ایک احساس زیاں میں مبتلا رہتا ہے۔ یہ کمی کا احساس الگ الگ شخصیتوں میں الگ الگ رد عمل ابھارتا ہے۔ کوئی اسے قسمت مان کر سر جھکاتا ہے کوئی چلتے چلتے اچانک رستہ بدل لیتا ہے۔ دوسرا عمل ہمارے معاشرہ میں کم ہی کسی کو راس آتا ہے۔ متوسط طبقہ کے افراد میں اس کا امکان اور بھی کم ہے۔ ندا کی ایک عجیب عادت ہے۔ وہ اپنے ملنے جلنے والوں میں کسی کو بھی کسی پڑھی ہوئی کہانی سے جوڑ دیتا ہے۔ پھر وہ آدمی کردار بن کر نئے حالات سے گذرتا ہے یا گذارا جاتا ہے۔ اور ندا اس

کے نئے حالات کے اُتار چڑھاؤ سے اپنی فرصتوں کو بہلاتا ہے۔ فرصتوں کا یہ کھیل ایک دن اپنے گھر میں اکیلے بیٹھے وہ تصدیق کے ساتھ بھی کھیلتا ہے......

تصدیق صاحب یوروپ میں ہیں۔ انہیں گورنمنٹ سے "لارڈ" کا خطاب ملا ہوا ہے۔ اس خطاب کی اپنی شرائط ہیں۔ ان شرائط کو توڑ کر وہ ایک حسینہ کے قریب ہو جاتے ہیں۔ یہ قربت ان کے نام کے ساتھ "لارڈ" کا خطاب لگانے کی رضامندی نہیں دیتی۔ جارج چہارم کے تاج کی طرح وہ بھی اپنا خطاب عشق پر قربان کر دیتے ہیں۔ اس قربانی سے متاثر ہو کر حسینہ ان کی گردن میں اپنی بانہیں ڈال دیتی ہے۔ ہا گرجا گھر میں حاضری دیے وہ ایک دوسرے کے ہو جاتے ہیں۔ ایک طرف دنیا دوسری طرف محبت، چھ مہینے اس طرح گذرتے ہیں۔ ایک دن صبح اکیلی سڑک پر سائیکل پر کسرت کرتے، وہ ایک موڑ سے گھومتے ہوئے ایک قدرے تنگ راستے میں جیسے ہی داخل ہوتے ہیں ان کے ذہن میں ایک سوال جاگتا ہے۔ کیا وہ حسینہ، جس کے لئے مجھے اپنے خطاب کو اپنے نام سے الگ کرنا پڑا ہے۔ چھ مہینوں کے بعد بھی، میری محبت ہے؟ سائیکل آگے بڑھ رہی ہے اور سائیکل سوار اپنے ہی سوال کا جواب سوچ رہا ہے۔ سائیکل تنگ راستے سے کشادہ شاہراہ پر آتی ہے۔ اور گھر کی طرف مڑتی ہے۔ اس نے سوال کا جواب سوچ لیا ہے۔ جواب ہے نہیں اب مجھے اس سے محبت نہیں ہے! محبت نہیں ہے تو رشتہ کیسا ہے یہ اپنے ساتھ ہی نہیں اس کے ساتھ بھی ناانصافی ہے۔ جو......
وہ گھر میں داخل ہوتے ہی اپنے جواب سے گھر کی عورت کو آگاہ کرتے ہیں۔ گھر کی عورت اس اچانک جواب سے گھبراتی ہے اور تین مہینے الگ الگ رہ کر اس جواب پر دوبارہ غور کرنے کی گذارش کرتی ہے۔ تصدیق صاحب برٹرینڈرسل کے روپ میں اس گذارش کو منظور کر لیتے ہیں۔ طے شدہ وقت پورا ہوتا ہے۔ دونوں ایک شام ایک ہوٹل میں ملتے ہیں۔ دونوں دوپہر کی نیند سے تروتازہ اچھے لباسوں میں ایک میز کے گرد آمنے سامنے بیٹھتے ہیں۔ بیرا آتا ہے دونوں کے احترام میں سر جھکاتا ہے۔ تصدیق صاحب وہسکی اور اس کے ساتھ دوسرے لوازمات کا آرڈر دیتے ہیں، فلور پر ایک طرف ڈانس ہو رہا ہے۔ شراب آتی ہے۔ دونوں اپنا

اپنا گلاس اٹھا کر ایک دوسرے کو نرم گرم نظروں سے دیکھتے ہیں اور پینا شروع کرتے ہیں۔ پیگ کے ختم ہونے کے بعد رسل لڑکی کا ہاتھ ہاتھ میں لے کر کہتا ہے میرا جواب جو پہلے تھا وہی اب بھی ہے وہ دونوں اٹھتے ہیں۔ ہاتھ ملاتے ہیں اور ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے اپنے اپنے راستوں پر مڑ جاتے ہیں......

تصدیق صاحب ہر شام مکتبہ آتے ہیں۔ خاموش تماشائی کی طرح نئے ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ کچھ وقت بتاتے ہیں اور پھر گھر لوٹ جاتے ہیں۔ جاتے وقت وہ اکثر ندا کو بھی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ان کے اور ان کی اہلیہ کے ندا پر کئی احسانات ہیں۔ ان احسانات کی وجہ سے وہ ان کے روز کے اصرار کو ٹال نہیں پاتا۔ وہ دونوں میاں بیوی ایک کھلونے کی طرح ندا سے اپنی بوریت بہلاتے ہیں۔ اس کے صلے میں اسے کھلایا جاتا ہے پلایا جاتا ہے۔ اور کبھی کپڑوں کے تحفوں سے بھی نوازا جاتا ہے۔ ان دیر دیر کی صحبتوں میں ندا کو تصدیق صاحب اور ان کی بیوی رضیہ کی عمروں میں کافی فرق نظر آتا ہے۔ رضیہ عمر سے چھوٹی ہوتی جاتی ہیں اور تصدیق صاحب اپنی عمر سے زیادہ بوڑھے ہوتے جاتے ہیں گھٹتی بڑھتی عمروں کا یہ فرق گھر میں نت نئے اختلافات کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان اختلافات کو ہموار کرنے کے لئے پہلے ندا کو لے جایا جاتا تھا، اب کچھ دن سے وہ اکیلا بھی پہونچ جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ اس گھر میں اس طرح گھل مل جاتا ہے کہ گھر میں ہوتے ہوئے بھی گھر میں مشکل سے نظر آتا ہے۔ جب کوئی چیز عادت میں شامل ہو جاتی ہے تو اس کی موجودگی اور عدم موجودگی میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اپنی بڑھتی ہوئی مصروفیات کی وجہ سے جب ندا کسی دن ادھر نہیں جاتا تو اس کے جانے پہچانے ٹھکانوں پر فون آجاتا ہے اور کہیں نہ کہیں اسے ڈھونڈ لیا جاتا ہے۔ تصدیق صاحب سے اب ان کی بیوی کو کئی شکایتیں ہیں۔

وہ اختر الایمان کی طرح نظمیں نہیں لکھتے ان کی طرح شہرت یافتہ کیوں نہیں ہیں وہ کرشن حیدر کی طرح افسانے نہیں لکھتے جو انہیں لکھنا چاہیئے ندا فاضلی کی طرح ان کی عمر کم کیوں نہیں ہے۔ جو ہونی چاہئے۔ ظ انصاری کی طرح وہ اچھے مقرر نہیں ہیں۔ آدمی کوشش

کرے تو کیا ممکن نہیں ہے۔ تصدیق صاحب جو نہیں ہیں وہ ملنے کیلئے کبھی الف نام سے دو تین شمارے نکال کر پیسہ گنواتے ہیں۔ کبھی گھر میں محفلیں جماتے ہیں اور کبھی نئے ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ مل کر ان سب ترقی پسندوں کو گالیوں سے سرفراز فرماتے ہیں جن سے انہیں کمتر سمجھا جاتا ہے۔

انتقال سے کچھ سال پہلے وہ اپنا زیادہ وقت اپنی پرانی چھپی ہوئی کہانیوں میں تراش خراش اور ادھوری کہانیوں کو پورا کرنے میں خرچ کرنے لگے تھے۔ وہ اپنی کتاب چھپوانا چاہتے تھے۔ کتاب کا مسودہ تیار ہونے سے پہلے کتاب کا نام ڈسٹ کور اور اس کا سائز سب طے ہو چکا تھا۔ صفحات بھی طے ہو چکے تھے۔ ۱۲۴ صفحات کی اس ڈیمائی ساز کی کتاب کا مسودہ ان کی حیات میں مکمل نہیں ہو سکا۔ کچھ کہانیاں تو ان کے پاس تھیں، لیکن وہ ادھوری کہانیاں جنہیں وہ پورا کرنا چاہتے تھے ان کے کردار ان سے ناراض ہو کر ماضی کا حصہ بن چکے تھے وہ روز ان پر محنت کرتے تھے ہر روز جتنے ورق کالے کرتے تھے انہیں سناتے بھی تھے۔ لیکن دوسرے دن خود ہی انہیں چاک بھی کر دیتے تھے۔ وہ ماضی میں سوچی ہوئی کہانیوں کو نئے عہد میں لکھنے کی کوشش میں تھے، اور دو عہد آپس میں ملنے کو تیار نہیں تھے۔ تصدیق صاحب کے انتقال کے بعد پریس فروخت کر دیا گیا پریس کا، پرانی لیتھو مشین، فرنیچر اور میز کرسیوں کے ساتھ سودا کیا گیا تھا۔ اس پریس کے ساتھ وہ مسودہ بھی نئے مالک کی ملکیت میں شامل تھا جو کسی میز کی دراز میں پوشیدہ تھا اور جسے بعد میں پریس کے دوسرے بے کار کاغذوں کے ساتھ پریس سے باہر نکال دیا گیا تھا۔

تصدیق صاحب کے بعد رضیہ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ پاکستان منتقل ہو جاتی ہیں۔ سینڈہرسٹ روڈ کے ریلوے پلیٹ فارم سے نظر آنے والے پرانی وضع کے ایک مکان کی کھڑکی نے اب دور سے ہاتھ ہلانا چھوڑ دیا ہے۔ لوکل ٹرین کا انتظار کرتے ہوئے عادتاً اب بھی کبھی کبھار ادھر نظر مڑ جاتی ہے۔ لیکن اب وہ کھڑکی دور سے ہاتھ نہیں ہلاتی ایک پنجرے میں بیٹھے دو Love برڈس کے جوڑوں کو دانہ چگاتی ہے۔ ہرے طوطوں اور دوسری رنگ برنگی

چڑیوں کے یہ پنجرے اکثر دوکانوں میں ملتے ہیں۔ ان آزاد پرندوں کو قید کر کے کچھ لوگ اپنی آزادی کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ Love برڈس پنجرے کے چھوٹے سے دائرے میں لڑ جھگڑ کر ایک دوسرے سے اتنے قریب ہو جاتے ہیں۔ کہ ساتھ ساتھ پنجرے کے تاروں سے ٹکراتے ہیں۔ آسمان کو دیکھ کر مخصوص سروں میں اپنا درد گاتے ہیں۔ اور جب ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں تو جیتے جی بے صدا ہو جاتے ہیں۔ ندا ایک مشاعرہ کے سلسلے میں کراچی جاتا ہے، وہاں ناظم آباد کی ایک محفل میں کئی سال بعد رضیہ پھر نظر آتی ہیں ان کا بیٹا جرمن کی شہریت لے چکا ہے، بیٹی شادی کر کے اپنے گھر کی ہو گئی ہے، وہ اب اپنی ماں کے ساتھ گھر میں اکیلی رہتی ہیں۔ ندا ایک دوپہر ان کے گھر میں گذارتا ہے۔ ان کے پاس اب کہنے کو پہلے کی طرح کچھ زیادہ نہیں ہے، چند خیر خبر کے رسمی جملوں کے بعد، ملاقات کا باقی وقت ان کے فیملی البم کے ساتھ گذرتا ہے۔ ان میں ان کے بچوں کی تقریبات کی تصویریں ہیں۔ عروسی لباس میں لڑکی، سہرا باندھے ہوئے لڑکا، بہو اور داماد کے ساتھ وہ خود اور بیچ میں ان کا نیا نواسہ۔ رخصت ہوتے وقت وہ ایک لفافے میں کچھ روپے رکھ کر دیتی ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ ان پیسوں سے دو چار جمعرات تصدیق صاحب کی لحد پر اگربتیاں سلگائی جائیں اور پھول چڑھائے جائیں۔ تصدیق صاحب ممبئی میں ڈونگری کے ایک قبرستان میں مدفون ہیں۔

یہ فاصلہ!\
جو تمہارے اور میرے درمیاں ہے\
ہر اک زمانے کی داستاں ہے\
نہ ابتدا ہے\
نہ انتہا ہے\
مسافتوں کا عذاب سانسوں کا دائرہ ہے\
نہ تم کہیں ہو

نہ میں کہیں ہوں
تلاش رنگین واہمہ ہے
یہ فاصلہ! جو تمہارے اور میرے درمیاں ہے
یہی طلب ہے
یہی جزا ہے
یہی خدا ہے

یہ دور جدیدیت کے ابھار اور ترقی پسندی کے اتار کا ہے۔ شاعروں میں جاں نثار اختر کے علاوہ کوئی اور تخلیقی طور پر فعال نہیں ہے۔ مخدوم اللہ کو پیارے ہو گئے۔ سردار جعفری اپنی لمبی تیراکی کے بعد کنارے ہو گئے، ساحر فلمی آسمان کے ستارے ہو گئے۔ جذبی دور کے نظارے ہو گئے۔ مجروح تھوڑا لکھ کر بہت سارے ہو گئے ہیں۔ ظ انصاری کئی شادیاں کر کے پھر سے کنوارے ہو گئے کیفی اسٹیج کے دلارے ہو گئے ہیں۔ مجروح کو جب فلمی گیت لکھنے سے فرصت ملتی ہے تو وہ رسائل میں اپنے خطوں کے ذریعے ان مدیران کو ڈانٹ پلاتے ہیں جو فیض کی غزل کو اونچا اٹھاتے ہیں۔ ان میں سے جو ان کے دلائل کو مان جاتے ہیں انہیں اپنا دوست سمجھتے ہیں باقی کو بے ادب اور بد تہذیب ٹھہراتے ہیں۔ اگر انہیں ترقی پسند غزل کا موجد مان لیا جائے تو وہ فیض کو نظم کا بڑا شاعر بنانے میں تعاون دینے کو تیار ہو سکتے ہیں۔ ان کی رائے میں غزل میں سیاسی و سماجی شعور کی شروعات انہیں سے ہوتی ہے۔ فیض نے ممبئی کی ایک ادبی محفل میں جس میں اتفاق سے سردار، جذبی، جاں نثار اور مجروح وغیرہ شریک تھے۔ مجروح کے مدیران کے نام ان خطوں کا جواب یوں دیا تھا۔

"بھائی دوکانیں تو سب نے ایک ساتھ لگائی تھیں۔ اب اس میں کسی کا کیا قصور کہ کسی کی دوکان چل نکلی کسی کی نہیں چلی، غبار ایام میں فیض کی ایک نظم نذر حسرت موہانی میں ایک شعر ہے۔

ہم شیخ نہ لیڈر نہ مصاحب نہ صحافی
جو خود نہیں کرتے وہ ہدایت نہ کریں گے

فیضؔ کی طرح سردارؔ بھی اپنے ہم عصروں کا کامپلکس ہیں۔ مجازؔ کی ایک ڈائری میں جو ان کے جنون کی بے ترتیب تحریروں پر مشتمل ہے اور جسے ڈاکٹر محمد حسن نے مرتب کیا تھا ایک جملہ یوں بھی ہے۔ "شاعر تو صرف دو ہیں۔ ایک فیضؔ دوسرا مجازؔ۔ مجازؔ ہی کی طرح جذبیؔ بھی اپنے ایک انٹرویو میں سردارؔ کو شاعر ماننے سے بھی انکار فرماتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ سارے بزرگان ادب، اب عمر کی ان منزلوں میں داخل ہو چکے ہیں جہاں ان میں سے ہر ایک کو اپنے سوا دور تک کوئی دوسرا دکھائی نہیں دیتا۔ اخترؔ الایمان دوسروں سے مختلف ہیں۔ لیکن وہ بھی جب اپنی نظموں کی تعریف و توصیف سے مہلت پا کر کبھی اپنے عہد کے شاعروں کی فہرست بناتے ہیں تو نہایت ایمانداری کے باوجود اپنے علاوہ سارے معاصرین کے نام بھول جاتے ہیں۔

سردارؔ تحریراً تو سماجی ذمہ داری نبھاتے ہیں لیکن زبانی جو فرماتے ہیں اس کے مطابق وہ بھی شہر ادب میں اکیلے ہی نظر آتے ہیں۔ فیضؔ کی شہرت میں انہیں ادب سے زیادہ، راول پنڈی کیس، علاقائیت اور موسیقاروں کی گائکی کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔

ساحرؔ ادبی محفلوں میں کم نظر آتے ہیں۔ خود اپنے گھر میں محفلیں جماتے ہیں اور کھلا پلا کر اپنے حاضرین کو آئینہ دکھاتے ہیں، مشاعروں میں پابندی سے شرکت کرتے ہیں۔ مجروحؔ سے ان کی چشمک پرانی ہے۔ وہ مشاعرہ میں وقت پر آتے ہیں لیکن باہر اپنی کار میں بیٹھے اپنے مداحوں کے ساتھ جام پر جام چڑھاتے ہیں تا آنکہ مجروحؔ زحمت کلام کے لئے بلائے جاتے ہیں۔ مجروحؔ کے خوش الحان ترنم کو سنتے ہی وہ مشاعرہ گاہ میں داخل ہوتے ہیں۔ ساحرؔ ہر بار اسی طرح سامعین پر اپنی فلمی شہرت آزماتے ہیں اور مجروحؔ کے ترنم اور غزل کی بے حرمتی کا لطف اٹھاتے ہیں۔ مجروحؔ اپنی محفلوں میں ساحرؔ کو مہمل اور جاں نثار اختر کو (جو ان دنوں ساحرؔ کے صبح و شام کے ساتھی تھے) تابع مہمل کے القاب سے نواز کر اپنی گفتگو کو رنگین

مناتے ہیں۔ جاں نثار اختر جب کبھی اپنے گھر میں رات سجاتے ہیں تو انہیں بھی سارے معاصرین اپنے سے چھوٹے نظر آتے ہیں۔ ایک دوپہر کو وہ ایک کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے اپنے آپ سے ہی کچھ بولتے نظر آتے ہیں۔

"بھئی کمال ہے، جواب نہیں اس ہمت کا، بڑے دل گردہ کا آدمی ہے۔ کیا قدرت کلام ہے"

کس کی تعریف کر رہے ہیں اختر بھائی؟ ندا پوچھتا ہے۔

"میرے یار تاباں کی اوہ کہتے ہیں کے کئی مجموعے ہیں لیکن غزل ایک ہی ہے جو بار بار دہراتا رہتا ہے۔

جدیدیت ابھی پختہ عمر کی۔ اس نرگسیت سے دور ہے۔ تنقید میں ابھی علی گڑھ، الہ آباد، احمد آباد، دہلی اور ممبئی کی گروہی ترجیحات کی شمولیت میں کئی برسوں کی دیر ہے۔ الہ آباد کے نئے نام، بہار کے گلوب اور اورنگ آباد کے نئے کلاسکس میں اچھے برے سب نام شامل ہیں۔ جدیدیت اور ترقی پسندی کے ٹکراؤ نے مختلف رویوں اور مزاجوں کی متحد کر دیا ہے۔ ہر محفل میں جدیدیت موضوع حث ہے۔

جے جے ہاسپٹل کی فٹ پاتھ پر ایک شام تاباں جھانسوی نظر آتے ہیں۔ وہ ندا کے طالب علمی کے زمانے کے مشہور شاعر ہیں۔ سگریٹ سے شراب، شراب سے گانجہ، اور گانجے سے افیم تک کا سفر جوانی میں ہی طے کر چکے ہیں۔ ان کی خوش گلوئی یک زمانے میں مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی تھی۔ لمبا چھریرا قد، خوبصورت چہرہ، نشے میں جھومتے جھامتے جب اسٹیج پر آتے تھے تو پہلے مصرع سے ہی چھا جاتے تھے۔ ان دنوں کا سنا ہوا ایک شعر ندا کی یادداشت میں آج بھی محفوظ ہے۔

اگر مجھے اختیار دے دو تو انقلاب جدید کردوں
لٹا کے قارون کا خزانہ، غریب لوگوں کی عید کردوں

اترا ہوا چہرہ، دھول سے اٹے کپڑے، پوچھنے پر پتہ لگا بھوکے پیاسے بھی ہیں اور ممبئی میں کہیں سونے کا ٹھکانہ بھی نہیں ہے۔ جھانسی سے ممبئی اندیور کے ساتھ چلے آئے۔ اندیور

اکثر چھوٹے شہروں کے شاعروں کے ساتھ ایسا سلوک کرنے کے عادی ہیں۔ جس سے زیادہ خوش ہوتے ہیں اسے ممبئی میں فلمی گیت کار بننے کا خواب تھما دیتے ہیں، مدد کا وعدہ بھی کرتے ہیں ان کے اس جھانسے میں جو آتا ہے وہ پچھتاتا ہے۔ امراؤتی کے ایک مشاعرہ میں ان کی چشم کرم ندا پر بھی ہوتی ہے۔ ایک ہی اندیور اپنے گھر اور اسٹیج پر الگ الگ ہوتے ہیں۔ ندا جب ممبئی میں ان کے دیئے ہوئے پتہ پر پہونچتا ہے تو خود اندیور کی زبانی اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ گھر میں نہیں ہیں۔ حالات جب اچھے نہیں ہوتے تو ایک جگہ سے دوسری جگہ تک آنے جانے کی تھوڑی سی رقم بھی بہت بھاری پڑتی ہے۔ ندا کا ذریعۂ آمدنی ایک مشاعرہ سے دوسرے مشاعرہ تک نپے تلے انداز میں چلتا ہے۔ اس انداز میں ذرا سی تبدیلی بھی اسے کئی دنوں تک پریشان رکھتی ہے۔ ممبئی میں وہ کئی سالوں سے ہے۔ لیکن ادھار مانگنے میں جو حوصلہ اور ہمت چاہئے، ان سے وہ ابھی تک محروم ہے۔

تاباں ٹین کا چھوٹا سا صندوق لے کر ممبئی آتے ہیں۔ دو تین دن اندیور کی میزبانی کا لطف اٹھاتے ہیں۔ نشے میں ڈائری میں جتنی نظمیں اور غزلیں ہوتی ہیں، انہیں اپنے ترنم میں ریکارڈ کراتے ہیں اور اس کے بعد خود اندیور انہیں بتاتے ہیں کہ وہ گھر سے باہر ہیں ان سے ملنا ہو تو پھر آیئے...... لیکن جب وہ پھر کئی دنوں کی کوشش کے بعد بھی ان سے نہیں مل پاتے۔ تو پتہ پوچھتے ہوئے بھنڈی بازار کی طرف نکل آتے ہیں۔

کئی دنوں سے کوئی شئے اکہری نظر نہیں آتی، ہر چیز میں اس ایک چیز کے علاوہ بھی اور بہت کچھ ہوتا ہے۔ ندا اور تاباں جہاں کھڑے ہیں ان کے بیچ جو ایک بڑا سا پتھر ہے۔ اس میں کوئی ان دیکھی مورت بھی ہے۔ وہ مورت، کوئی سنگ تراش اس میں سے نکال لے تو وہ کسی بھی مندر کی مورت بن سکتی ہے۔ اس پتھر کے چاروں طرف کوئی بے نام پہاڑ بھی ہے۔ یہ پتھر اس میں سے کب تراشا گیا۔ وہ پہاڑ سے یہاں تک کیسے آیا۔ پہاڑ سے بستی تک کے سفر میں اور کہاں کہاں وہ تراش خراش سے گذرا۔ اس سفر میں کتنے راستے تھے ان راستوں میں کتنے مکان تھے۔ ان مکانوں میں رہنے والے ان کی محبتیں، نفرتیں ان کے گرد منڈلاتے جانور، اڑتے

ہوئے پرندے، پرندوں کے اوپر پھیلا ہوا آسماں، آسماں کے نیچے بہتی ہوئی ندیاں اور ان سب میں دن کو رات سے اور رات کو دن سے بدلتے، وقت کے پوشیدہ ہاتھ۔ رات اور دن میں آنسو، مسکراہٹیں، یہ پہاڑ جہاں ہے وہاں کی آب وہوا سے، اس کی دوستی کا مزاج کیسا ہے۔ کہتے ہیں پہاڑ صدیوں بوڑھے ہوتے ہیں۔ پہاڑ سے کٹ کر پتھر ادھر اُدھر جاتے رہتے ہیں اور خاموش زبان سے اپنے سفر کی کہانی اور حسب نسب دہراتے رہتے ہیں۔ کسی پتھر کی پوجا ہوتی ہے۔ کوئی محراب میں چنا جاتا ہے۔ کوئی عمارت کی بنیاد بنتا ہے۔ کہیں یہ احتجاج کی علامت بنتا ہے۔ کوئی اس پر سر رکھ کے سوتا ہے کوئی اس پر بیٹھ کے روتا ہے۔ کبھی یہ ہتھیار بن کے خون بہاتا ہے۔ کبھی ایک دوسرے سے ٹکرا کر چنگاری اڑاتا ہے۔ آدمی اور پتھر کا رشتہ زمین پر آدمی کے وجود ہی کی طرح قدیم ہے۔

تاباں جھانسوی کے ارد گرد بھی ندا کو بہت کچھ نظر آتا ہے۔ بیتے ہوئے نہ جانے کتنے دن رات چاروں طرف پھیل جاتے ہیں۔ ان دن راتوں میں ایک اوپری منزل سے اترتی ہوئی، سفید پتھر کے زینے پر چھائی ہوئی ایک انگور کی بیل بھی ہے۔ جس میں گلہریاں مسلسل اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر بھاگتی دوڑتی رہتی ہیں۔ اس بیل کے نیچے ایک بڑا سا کتا ہے۔ جو اپنی عمر پوری کر کے صرف اونگھنے کے لئے زندہ ہے۔ کوئی طوطا جب پیڑ کی شاخ سے اتر کر اس کے سر پر بیٹھ جاتا ہے تو وہ پھریری لے کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس مکان کے طوطوں، چڑیوں، گلہریوں اور بلبلوں نے اس سے ڈرنا چھوڑ دیا ہے۔ کبھی تو بلی پھلانگ کر اس پر سے گذر جاتی ہے۔ پھلانگنے کے بعد مڑ کر ایک نظر اسے دیکھتی ہے پھر میاؤں کر کے آگے بڑھ جاتی ہے۔ اس کتے کے دو نام ہیں پہلا نام روبرٹ ہے جو اسکے انگریز مالک کا دیا ہوا ہے۔ وہ انگریز چھٹی پر لندن جاتے ہوئے کچھ دن کے لئے اسے یہاں چھوڑ گیا تھا۔ جب وہ واپس نہیں آیا تو نئے مالک نے اس کی زبان اور نام اپنے مطابق بدل دیے۔ اب اس کا نام راجہ ہے اور وہ اُردو میں بات سنتا ہے اور سمجھتا بھی ہے۔

ایک رات آسمان پر چمکتا ہوا دسمبر کا پورا سرد چاند، اس بیل میں چھپی دو ہلتی جلتی

پر چھائیوں کو دیکھتا ہے اور سویرا ہوتے ہی اس راز کو جاتے جاتے سورج سے کہہ جاتا ہے۔ سورج انگور کی بیل کی تلاشی لیتا ہے۔ اسے وہاں دو جسموں کی تھوڑی سی خوشبو، چند گرم سانسیں، اور کچھ خاموشی اور سرگوشیاں ملتی ہیں۔ اس تلاش کے بعد زینے کا چھت پر کھلنے والا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے۔ چھت سے چاند کو دیکھنے پر پابندی لگ جاتی ہے۔ انگور کی بیل اور راجہ کا وہ گھر اب صرف گلی کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے ہی کبھی کبھار چاند کو دیکھ پاتا ہے۔

آمنے سامنے دو نئی کھڑکیاں
جلتی سگرٹ کی لہراتی آواز میں
سوئی ڈورے کے رنگین الفاظ میں
مشورہ کر رہی ہیں کئی روز سے
شاید اب بوڑھے دروازے سر جوڑ کر
وقت کی بات کو وقت پر مان لیں
بیچ کی ٹوٹی پھوٹی گلی چھوڑ کر
کھڑکیوں کے اشاروں کو پہچان لیں

دسمبر کی اس سرد رات سے اب تک یوں تو بے شمار چاند آسمان پر آئے گئے، لیکن اس رات جیسا چاند پھر دوبارہ روشن نہیں ہوا۔ وہ چاند اب صرف ماضی کی یاد میں محفوظ ہے۔ جو تنہائی میں جب بھی، جس لمحہ جگمگاتا ہے تو سارا شہر منور کر جاتا ہے۔ چین کے کلاسکی شاعر باشو کا ایک ہائیکو ہے۔

آتے جاتے بادل
چاند کے مسلسل دیکھنے والوں کو
تھوڑی مہلت فراہم کرتے ہیں۔

اس کا نام محمودہ ہے۔ وہ ندا کے کالج کے دنوں میں شہر کی سب سے خوبصورت لڑکی تھی۔ اس فیصلے پر اس کے کئی دوست متفق نہیں تھے۔ ان میں سب کی اپنی پسند اور معیار تھا۔

ہر ایک کو اپنی پسند کے معیار پر پورا اعتبار تھا۔ ان دوستوں کی نوخیز عمروں نے ایک ساتھ بہت سوں کو شہر کی سب سے حسین دوشیزہ بنادیا تھا۔ محمودہ مس بلز اسکول کی نئی ٹیچر تھی۔ اس کا اسکول ندا کے کالج کے راستہ میں پڑتا ہے۔ اس کے اسکول اور ندا کے کالج کے وقت میں آدھ گھنٹے کا فرق ہے۔ اس فرق کو ندا نے کالج کے پرنسپل کی اجازت کے بغیر، لیڈیز سائیکل کے ان پہیوں کی رفتار کے ساتھ ایڈجسٹ کرلیا ہے جو ٹھیک ساڑھے نو بجے، ایک گلی سے باہر نکل کر، سارے شہر کو ایک سڑک میں سمیٹتے گذرتے ہیں۔ ندا کے مسلسل تعاقب نے اسے اپنے اس معجزہ سے واقف کرادیا ہے۔ اس کی مسکراہٹ آہستہ آہستہ ہونٹوں سے نکل کر اس کی آنکھوں، ہاتھوں، کانوں کے بندوں، دوپٹے کی سلوٹوں، سائیکل کے پیڈل پر گھومتے ہوئے پیروں کے سامنے رکھی کتابوں، سب میں پھیل گئی ہے۔ وہ مسکراتی ہے تو اسکے ساتھ یہ سب چیزیں بھی مسکراتی ہیں اور پھر اس مسکراہٹ میں راستے کے درخت ان میں چہچہاتی چڑیاں، بجلی کے تار ان میں الجھی ہوئی پتنگیں، مکانوں کی گیلریوں میں سوکھتے رنگ برنگے کپڑے، ہوا، بادل، سب شریک ہو جاتے ہیں۔ وہ بہت ذہین ہے۔ وہ خاموشی کی زبان کو جانتی ہے۔ وہ ہر دن اپنی شلوار قمیض اور دوپٹے میں اسی رنگ کا انتخاب کرتی ہے جو اس روز ندا کی پسند ہوتا ہے۔ اس کا ایک چھوٹا بھائی ہے۔ ندا کی اس سے دوستی ہوگئی ہے۔ ان دونوں کو ملانے میں بیر کمار اہم رول ادا کرتا ہے۔ وہ اپنی دوکان سے کپڑے لے کر محمودہ کے والد کی شہر کی دوکان اسٹائل ٹیلرز میں سلوانے کے لئے لاتا ہے۔ بیر کمار اور ندا کے سوٹ بننے میں جو وقت لگتا ہے اس میں محمودہ کے بھائی سے اچھی خاصی دوستی ہو جاتی ہے۔ یہ دوستی کچھ دن میں ہی اسے محمودہ کے اس گھر میں لے جانے لگی ہے جہاں انگور کی بیل سے ڈھکے زینہ کے اوپر وہ کمرہ ہے جس کی کھڑکی سے چاند نظر آتا ہے۔ دسمبر کے پورے چاند والی رات کے بعد اس کا تنہا اسکول جانا ختم ہو جاتا ہے۔ کوئی نہ کوئی اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ جمیل فاطمہ تک جب یہ بات پہونچتی ہے تو وہ محمودہ کی تین پشتوں کا شجرہ زبانی سنادیتی ہیں۔ اس کی ماں ہی زینت کی طرح سندھیا دربار سے وابستہ نہیں تھی بلکہ اس کی نانی بھی اپنے زمانے کی مشہور طوائف

تھی۔ ایسے گھر کی لڑکی سے کسی سید زادے کا رشتہ معیوب ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ جب سے جمیل فاطمہ کے بچے بڑے ہونے لگے ہیں۔ وہ مرتضٰی حسن کی رنگ رلیوں پر کڑھنے کے بجائے اپنے بچوں سے زیادہ جڑنے لگی ہیں ان میں سے جب کوئی ان کے طے شدہ راستوں سے الگ ہٹ کر چلنے کی بھول کرتا ہے تو وہ گھر کے کسی کونے میں منہ ڈھانپ کر ایک دو گھنٹے چپ چاپ روتی رہتی ہیں۔ ان کے اس عمل سے ماحول پھر سے ویسا ہی ہو جاتا ہے۔ جیسا وہ سوچے ہوئی تھیں۔ محمودہ ایک شام اکیلے میں جمیل فاطمہ سے ملتی ہے۔ اور پھر ہمیشہ کے لئے کہیں غائب ہو جاتی ہے۔ ندا سے پھر اس کی ملاقات نہیں ہو پاتی۔ اس سوگ میں کچھ دن شہر کی ساری روشنیاں بجھی رہتی ہیں۔ راستے، چوراہے سونے ہو جاتے ہیں۔ پھر ہر چیز پہلے جیسی ہو جاتی ہے۔ وقت گذرتا رہتا ہے۔ ایک دن ممبئی میں ندا کے نئے مکان کے پتہ پر ایک خط آتا ہے۔ یہ خط محمودہ کی تحریر میں ہے۔

میں کئی دنوں سے تمہیں خط لکھنا چاہتی تھی۔ لیکن ہر بار لکھ کر پھاڑ دیتی تھی۔ تمہارا ممبئی کا پتہ میرے پاس نہیں تھا۔ اور کسی سے پوچھنا مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ آج اچانک ایک رسالہ میں، تمہاری تصویر اور پتہ دیکھا تو بہت کچھ گذرا ہوا یاد آنے لگا۔ گوالیار کا وہ راستہ جہاں پہلی بار ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ مس ہلز اسکول کے قریب ہائی کورٹ کا وہ بڑا سا پتھر جس سے تم مجھے دیکھتے ہوئے الجھ کر گرے تھے اور میں بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔ انگور کی بیل والا وہ گھر جہاں تم اکثر آتے تھے اور وہ سرد چاندرات جس کے بعد آسمان برسوں کے لئے سونا ہو گیا۔ پھر تم ممبئی چلے گئے اور میں شادی کر کے جے پور میں بس گئی۔ میرے شوہر بہت اچھے انسان تھے۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ان کی یادگار ایک لڑکی ہے جو اس سال میڈیکل کے آخری سال میں ہے میں اگلے ہفتے ایک دن کے لئے ممبئی آنا چاہتی ہوں۔ بزنس کے کام سے۔ یہ کام تم سے ملنے کا بہانہ بھی ہو سکتا ہے۔ کیا میں امید رکھوں کہ تم اپنی مصروفیات میں سے کچھ لمحے اس ملاقات کے لئے نکال سکو گے۔ تمہارا جواب ملنے کے بعد میں اپنا پروگرام طے کروں گی۔

اس خط کے آخر میں محمودہ کا نام پڑھ کر عجیب سی مسرت ہوتی ہے۔ یہ جان کر اور بھی خوشی ہوتی ہے کہ اتنی لمبی دوریوں کے باوجود وہ جو ایک ربط کبھی ہمارے درمیان تھا وہ آج بھی وقت کی گرد سے محفوظ ہے لیکن یہ خوشی تھوڑی دیر تک ہی نداکی ساتھ رہ پاتی ہے۔ سامنے دیوار پر لگے کلینڈر کا سال دیکھ کر اسے وہ سال یاد آجاتا ہے جب وہ گوالیار سے ممبئی آیا تھا۔ پھر وہ مدت آنکھوں کے سامنے سے گذرتی ہے جس میں ایک ایک اینٹ جوڑ کر اس نے اپنا گھر ممبئی میں تعمیر کیا تھا۔ چاروں طرف دھول سی اڑنے لگی۔ اس غبار میں بہت کچھ دھندلانے لگا۔ آئینہ کے سامنے شیو کرتے ہوئے وہ خود کو دیکھتا ہے۔

"مہاتمابدھ گھومتے ہوئے کئی برسوں بعد اس علاقہ میں واپس آتے ہیں جہاں ان کے پتا ان کے سواگت کے لئے کھڑے ہیں۔ بدھ کی آنکھوں میں اجنبیت دیکھ کر وہ چونکتے ہیں۔ وہ بدھ کو پہچانتے ہیں لیکن بدھ ان کو نہیں جانتے۔

"تم نے پہچانا نہیں" ہم وہی ہیں جو تمہارے اپنے ہیں

بدھ کی آنکھوں کی حیرانی اور گہری ہو جاتی ہے ان کی خاموشی بولتی ہے

"کوئی ندی دوسرے لمحہ پہلی جیسی نہیں رہتی ایک ہی ندی میں دوبار اشنان ممکن نہیں ہے

لیکن ہم تو تمہیں جانتے ہیں۔ تم کیسے......؟

تم جسے جانتے ہو وہ بھی تمہیں پہچانتا ہوگا۔ لیکن وہ اب کہاں ہے، جو ہے وہ موجودہ پل ہے، اس سے پہلے جو تھا اس کے بعد جو ہوگا وہ سب ایک دوسرے سے جدا ہے۔ "سردم دکھم، سروم دکھم"

اسے اچانک خیال آتا ہے۔ محمودہ ایک نہیں ہے۔ دو ہیں۔ ایک وہ جو ماضی ہے دوسری وہ جو حال ہے ماضی مر جاتا ہے، اس میں دن مہینے سال نہیں ہوتے۔ حال وقت کے دائرے کا قیدی ہے۔ وہ چلتا رہتا ہے۔ وہ جس محمودہ کو جانتا ہے وہ وہیں مس ہلزا سکول کی طرف جانے والی سڑک پر کھڑی ہوئی اب بھی مسکرا رہی ہے۔ جس محمودہ کا اسے خط ملا ہے شاید وہ اسے دیکھ کر بھی نہیں پہچان پائے وہ محمودہ کو دوبارہ نہیں کھونا چاہتا۔ وہ اس کے خط کو ایک بار پھر

پڑھتا ہے اور پھاڑ دیتا ہے۔

وقت نے

میرے بالوں میں چاندی بھر دی

اِدھر اُدھر جانے کی

عادت کم کر دی

آئینہ جو کہتا ہے سچ کہتا ہے

ایک سا چہرہ مہرہ

کس کا رہتا ہے

اسی بدلتے وقت کے صحرا میں لیکن

کہیں کسی گھر میں

اک لڑکی ایسی ہے

برسوں پہلے جیسی تھی وہ

اب بھی بالکل ویسی ہے

☆☆☆

گھڑی کے کانٹے صبح کے ساڑھے نو بعد میں جاتے ہیں، کچن کی کھڑکی کے کھلے ہوئے پٹوں پر چار ایک جیسے کوے اپنی کائیں کائیں پہلے شروع کر دیتے ہیں۔ گھڑی ایک دو منٹ آگے پیچھے ہو سکتی ہے، مگر ان کے وقت میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ اب تو انہیں کی آمد سے ندا اپنی گھڑی کو ملا کر ٹھیک کرتا ہے۔ یہ چاروں کوے کچھ دنوں سے ندا کے نئے مکان کے نئے دوست ہیں۔ ان میں پہلے ایک کوے سے اس کی شناسائی ہوئی تھی۔ باقی کے تین سے اسی نے ان کا تعارف کرا لیا تھا۔

ہوا یوں، پہلی بار اپنا ناشتہ ندا خود بناتا ہے وقت ساڑھے نو بجے کا ہوتا ہے۔ ناشتہ کرتے ہوئے وہ دیکھتا ہے، سامنے مندر کے آنگن میں مندر کی چوکیداری کرتے ہوئے مولسری کے پیڑ کی نیچی شاخ سے ایک کوا اڑ کر سیدھا کھڑکی کے دائیں پٹ پر آ کے بیٹھ جاتا ہے۔ پہلے وہ شرمایا شرمایا کنکھیوں سے اسے دیکھتا ہے، ایک دو بار گردن اونچی نیچی کرتا ہے، کبھی اندر کی طرف دیکھتا ہے، کبھی باہر جھانکتا ہے۔ پھر دونوں کی آنکھیں چار ہوتی ہیں۔ وہ اپنی کائیں کائیں کی بولی میں خود کو متعارف کراتا ہے۔ ندا اپنی بھاشا میں اس کی خیریت پوچھتا ہے۔ کیسے ہو؟ کیا کام ہے۔ پتہ نہیں وہ اس کی بات سمجھتا ہے یا نہیں۔ وقت کے ساتھ انسان اور فطرت میں اتنی دوریاں پھیل گئی ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کی زبان بھول چکے ہیں، ایک دوسرے کی

پہچان بھلا چکے ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہونے کے بجائے ایک دوسرے سے ڈرنے لگے ہیں۔ آدمی اور فطرت کی قربت کے لئے جس معصومیت کی ضرورت ہوتی ہے وہ ارتقاء کے راستے میں کہیں پیچھے چھوٹ گئی ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے دور ہو کر ایک دوسرے پر شک وشبہ کرنے لگے ہیں۔

ندا کو اچانک یاد آتا ہے۔ اس کی چھوٹی بہن کی پانچ سال کی بچی ماریہ پاکستان سے آئی تھی ندا اسے گود میں لے کر جب بھی کہیں جاتا، وہ پھول دیکھ کر تالی بجاتی تھی اور اشارہ کر کے کہتی تھی ماما یہ میں ہوں۔

"جب کفار غار کے قریب پہونچ گئے تو ان کی آہٹیں سن کر حضرت ابوبکر صدیقؓ غمزدہ ہو گئے۔ عرض کی اب دشمن اس قدر قریب آ گئے ہیں کہ اگر اپنے قدموں پر ان کی نظر پڑے گی تو وہ ہم کو دیکھ لیں گے۔ آپؐ نے فرمایا لاتحزن ان اللہ معنا (گھبراؤ نہیں، خدا ہمارے ساتھ ہے) اور یوں ہی ہوا ببول کے درخت کی ٹہنیوں نے پھیل کر کالی کملی والے کو چھپالیا۔ ساتھ ہی دو کبوتر آئے اور انہوں نے ان ٹہنیوں میں گھونسلہ بنا کر انڈے دیے...... اور کفار آگے بڑھ گئے......"

ندا کی آواز اور آواز کے ساتھ ہاتھ کی حرکت سے ڈر کر پہلے وہ کوا کھڑکی کے پٹ پر بیٹھا گردن اٹھا کر پر پھلاتا ہے اور پھر نئے مکان کے نئے مکین کو دیکھ کر اڑ جاتا ہے۔ تھوڑی دیر باہر کے چکر کاٹ کر پھر وہ اسی جگہ آکر بیٹھ جاتا ہے اور ٹکٹکی باندھے کچھ لمحے چپ چاپ گھورتا رہتا ہے۔ اب وہ اپنی ہی بھاشا میں کچھ کہتا ہے۔ وہ کیا کہتا ہے یہ تو سمجھ میں نہیں آتا لیکن اس بار وہ اس کی آواز کی پہلی سی کرختگی میں تھوڑی سی نرمی محسوس کرتا ہے اور کھاتے کھاتے ایک سلائس کا آدھا ٹکڑا اس کی طرف پھینک دیتا ہے جسے وہ زمین پر گرنے سے پہلے جھک کر اپنی چونچ میں بھر لیتا ہے۔ دو تین دن وہ اسی طرح دور دور سے ناشتہ میں شریک ہوتا ہے۔ ابتداء میں نئے مہمان کی طرح شرماتا ہے پھر آہستہ آہستہ اتنا بے تکلف ہو جاتا ہے کہ میزبان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میزبان سے مہمان نوازی کرواتا ہے۔ جب کبھی ناشتہ میں کسی وجہ

سے دیر ہو جاتی ہے تو موصوف، اپنے وقت پر آکر ایسا شور مچاتے ہیں کہ ندا گھر میں چاہے کسی کام میں مصروف ہو، کچھ لکھ رہا ہو، یا کسی سے بات کر رہا ہو، فوراً اٹھ کر اس کے حصہ کا ناشتہ الگ ایک پلیٹ میں رکھ آتا ہے۔ اسے لگتا ہے وہ ناراض ہو کر اپنی بھاشا میں اسے گالی دے رہا ہے۔ اس ڈر سے کہ کہیں دوسرے یہ گالیاں نہ سن لیں وہ ایسا کرتا ہے۔ پلیٹ میں اپنا ناشتہ دیکھ کر وہ خاموشی سے نیچے اترتا ہے، بے خوفی سے سلائس کو کترتا ہے اور میزبان سے یہ پوچھے بغیر کہ اس نے ناشتہ کیا یا نہیں؟ اتنی تاخیر کی کیا وجہ ہے؟ خود اپنا پیٹ بھرتا ہے۔ پیٹ بھرنے کے بعد سامنے پڑے ہوئے کپڑے سے چونچ صاف کرتا ہے نل کے قریب جا کر پانی پیتا ہے اور اگلی صبح تک کے لئے غائب ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ کے تین کوّے اسی کے ساتھی ہیں۔ اس گھر کا پتہ انہیں اسی پہلے نے بتایا ہے۔ اس گنتی میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا ہے۔ پہلے ایک سے دو ہوتے ہیں۔ دو سے تین اور پھر تین سے چار ہو جاتے ہیں۔ ان چاروں درویشوں کی منڈلی میں جب کوئی پانچواں داخل ہونے کی کوشش کرتا ہے تو یہ چاروں مل کر اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں جیسے شیو سینا نے سن ۱۹۹۲ء میں ممبئی کے مسلمانوں کے ساتھ کیا تھا۔ پہلے کوّے کو ندا نے مذاقاً "شیخو" نام دیا تھا۔ بے دھیانی میں دیا ہوا یہ نام بعد میں سنجیدہ ہو کر مغل تاریخ کے ایک سنہری دور سے اپنا رشتہ جوڑ لیتا ہے۔ اکبر جہاں گیر کو بچپن میں شیخو کی عرفیت سے پکارتا تھا۔ شاید یہ نام اس نے صوفی شیخ سلیم چشتی سے عقیدت کی بنا پر رکھا تھا۔ شیخو کو اکبر نے سلیم چشتی کی دعاؤں سے پایا تھا۔ اس کوّے کو ندا نے اپنی تنہائیوں سے اپنایا تھا۔ اکبر کے ساتھ جنگ کے خاتمہ پر جب جہانگیر کو قیدی بنا کر واپس محل میں لایا جا رہا تھا تو جودھابائی کے بیٹے کی منتظر آنکھوں کو اسی کوّے نے کرشن مندر کی منڈیر پر آکر تسلی دی تھی۔ تاریخ کے اسی دور میں راجستھان کی پریم دیوانی نے شاید اسی کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

کاگا سب تن کھائیو، چن چن کھائیو ماس
دو نیناں نا کھائیو، پیا ملن کی آس

ندا کا دیا ہوا یہ نام دو چار دن ہی اس کی پہچان بن پاتا ہے۔ بعد میں یہ بھی تینوں میں مل کر اوروں جیسا ہو جاتا ہے۔ اب تو ان میں سے جو پہلے آجاتا ہے وہ ہی شینو کہلاتا ہے۔ ایک جیسے رنگ ایک جیسی چونچیں۔ سب ایک جیسے لگتے ہیں۔ یوں بھی نام سے شناخت کی رسم انسانی شعور کی دین ہے۔ سمندر اپنی لہروں کو نام نہیں دیتا۔ چوپایوں، پرندوں درختوں کو تو ہمیشہ ایک ہی نام سے پکارا جاتا ہے۔ جہاں افراد کے الگ الگ نام نہیں ہوتے وہاں نہ موت کا ماتم کیا جاتا ہے نہ پیدائش کا جشن منایا جاتا ہے۔ صدیوں سے ایک ہی گائے، ایک ہی نیم ایک ہی بندر ایک ہی کوا چلا آرہا ہے۔ گوسائیں تلسی داس کے یگ میں وہی کوا کاگ بھوشن کے روپ میں رشی بھاردواج کے رام کتھا وچن کا شروتا ہوتا ہے۔ اسی کے ہاتھ یوپی کی ایک پرانی حویلی میں ساون کا جھولا پڑتے ہی، کوئی اداس بہن سسرال سے اپنے بیرن کو سندیسہ بھیجتی ہے۔

اڑ جارے کاگا

پہنچادے بہن کا سندیسہ

مورے بیرن لیوے کو آئیں

کراچی کے ایک علاقہ ناظم آباد کے ایک بنگلے میں جمیل فاطمہ زندگی و موت کی کشمکش سے گذر رہی ہیں۔ وہ ندا کی بڑی بہن قمر طلعت سے خط لکھواتی ہیں۔ اس کی آخری سطریں ہیں۔

"تین دنوں سے ایک کوا میرے سرہانے بول بول کر کان کھا رہا تھا میں اس کے بولنے سے ہر دن تمہارا انتظار کرتی رہی۔ لیکن تم نہیں آئے لگتا ہے انسانوں کی طرح پرندوں پر بھی شہر کا رنگ چڑھنے لگا ہے۔ وہ بھی اب بلا جھجک جھوٹ بولنے لگے ہیں۔ گوالیار اپنے محلے کے کوّے کتنے اچھے اور سچے ہوتے تھے۔ وہ جب بھی منڈیر پر آتے تھے۔ کوئی نہ کوئی سچی خوشخبری سناتے تھے"۔

کھار ڈانڈا میں واقع امر اپارٹمنٹ کے گراؤنڈ فلور کے فلیٹ کی سندھی لڑکی، ایتا، روز سویرے اشنان کر کے سفید ساڑی میں لپٹی کندھوں پر گیلے بال بکھیرے کمپاؤنڈ کی دیوار پر تازہ ابالے چاولوں کی چھ ڈھیریاں لگاتی ہے اور اس کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفے سے چھ بار

تالیاں بجاتی ہے۔ ان تالیوں کی آواز کو کئی دشاؤں میں سن کر چھ کوّے مولسری کے پیڑ پر آتے ہیں وہاں سے اتر کے ان ڈھیریوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ انہیں چاولوں کو کھاتا دیکھ کر اپتا شردھا سے سر پر پلو سرکاتی ہے اور چوڑیوں بھرے دونوں ہاتھ جوڑ کر اپنے پرکھوں کی آتماؤں کو نمن کرتی ہے اور آشیرواد لیتی ہے۔ ان چھ ڈھیروں میں چار اس کے مایکے کے سگے سمبندھیوں کے نام کی ہوتی ہیں اور باقی کی دو اس کے پتی کے ماتا پتا کے نام منسوب ہوتی ہیں۔ اپتا کے یہ بزرگ جواب آتمائیں بن چکے ہیں پاکستان بننے کے بعد، سندھ سے اکھڑ کے ممبئی میں آئے تھے۔ اپنی دھرتی، آکاش اور ندیوں سے کٹ کر انہوں نے اپنے حصہ کا جا کھا سے یہاں پورا کیا اور پھر خود وقت بن گئے۔ شرادھ کے دس دن ان بزرگوں کی آتمائیں گگن لوک سے دھرالوک پر آتی ہیں اور کوؤں میں چھپ کر اپنے اپنے پریوار کے درشن کر کے واپس لوٹ جاتی ہیں۔

ندا نے اپتا کے پرکھوں کو دیکھا نہیں ہے۔ وہ اس کے ممبئی میں آنے سے پہلے شریر تیاگ چکے تھے مگر کچن میں روز ساڑھے نو بجے آنے والے دوستوں کی کائیں کائیں اس سے اکثر ان کی باتیں کرتی ہیں۔ ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے ندا کے خاندان کی طرح، ان کے دکھ سکھ بھی ان سیماؤں، سیاستوں اور آنسوؤں کے حصار میں تھے جن پر ان کا کوئی اختیار نہیں تھا۔

چرواہے آتے ہیں اور گونگی بہری بھیڑوں کو اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ہنکا کر لے جاتے ہیں۔ ان چرواہوں کی لکڑیوں پر اپنے اپنے خداؤں کی شبیہیں ثبت ہوتی ہیں۔

کارٹر روڈ پر ایک ادھیڑ عمر مارواڑی، میواڑ کے کسی شمشان میں اگنی کو سونپے ہوئے اپنے پرکھوں کی یاد میں روز ایک تھیلا بھر پاؤروٹی لاتا ہے اور چپ چاپ سمندر کی طرف منہ کئے ایک دوبار منہ سے ایسی آواز نکالتا ہے جسے کوّے سمجھتے ہیں۔ وہ اس آواز کو سن کر مختلف سمتوں سے آتے ہیں۔ پاؤروٹی کھاتے ہیں اور پھر فضاؤں میں بکھر جاتے ہیں۔ ایک دن وہ ادھیڑ آدمی نظر نہیں آتا۔ اس کی جگہ اس جیسا ہی کوئی جوان لڑکا پاؤروٹی کے تھیلے کو لاتا ہے۔ وہ

بھی ادھیڑ عمر کے مارواڑی کی طرح اسی طرح آواز لگاتا ہے اور کووں کو پاؤ روٹی کھلانے کے لئے بلاتا ہے۔ یہ جوان لڑکا اس مارواڑی کا بڑا بیٹا ہے۔ اس کا پتا اب آتما بن کر کوے کی آنکھوں سے اسے دیکھنے آتا ہے۔

کھارا اسٹیشن کے قریب ایک چبوترا کووں کے لئے بنا ہے۔ وہاں ڈھلتی عمر کے کئی لوگ باری باری آتے ہیں اور مٹھیوں میں بھر بھر کر جوار باجرہ انہیں کھلاتے ہیں۔ ڈھیر سارے کوّے ایک ساتھ آتے ہیں اور دانہ کھلانے والوں کو دعائیں دے کر اڑ جاتے ہیں۔

ایک مراٹھی عورت، بالوں میں بیلے کی کلیاں گوندھے، مندر سے سیدھی لنگ روڈ کے پارک میں چہل قدمی کے لئے آتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں چاندی کی چھوٹی سی کٹوری میں شکر ہوتی ہے۔ وہ ٹہلتے ہوئے زمین میں جہاں کہیں چیونٹیوں کو دیکھتی ہے، چٹکی بھر شکر ان کے پاس رکھ دیتی ہے۔ کٹوری کی شکر ختم ہونے تک وہ باغ میں گھومتی ہے۔ اس پورے وقت اس کے پاؤں زمین پر اور آنکھیں گھاس پر رہتی ہیں۔ وہ اپنا دن انہیں انجانی چیونٹیوں کے خاموش آشیرواد سے شروع کرتی ہے۔

مٹی سے مٹی ملے کھو کر سبھی نشان
کس میں کتنا کون ہے کیسے ہو پہچان

شانی نے اپنا ناول کالا جل، جبل پور کے ایک مسلم خاندان میں شب برات تہوار سے شروع کیا ہے۔ اس رات حلوہ اور روٹی پر نام بہ نام کئی مرحوم رشتہ داروں کو یاد کیا جاتا ہے۔ ان مرحومین کے ناموں کی فہرست سامنے رکھ کر، ہر نام پر طشتری میں دو روٹی اور چمچہ بھر حلوہ نکالا جاتا ہے اور اس پر فاتحہ کے بول پھونکے جاتے ہیں۔ فاتحہ کے بول وہی رہتے ہیں صرف فہرست کے حساب سے ہر بار نام بدلتا رہتا ہے۔ نیاز کی یہ رسم پوری ہو جانے کے بعد روٹی اور حلوہ کا تھال محلے میں گھر گھر بانٹ دیا جاتا ہے۔ مرنے والوں کو یاد کرنے کے ہر علاقے اور عقیدے میں کچھ دن مقرر ہوتے ہیں۔ ان یادوں کی رسمیں بھی ہر جگہ الگ ہوتی ہیں۔

۵۰

دعائیں مانگو
دعائیں مانگو
شجر حجر میں
ہر اک ثمر میں
کسی کا مسکن رہے ہمیشہ
وہ نام جس کے حروف سارے
زمین آکاش پھول تارے
وہ نام روشن رہے ہمیشہ
قدیم قبروں پہ سر جھکائے
گھنیرے پیڑوں کی ڈالیوں پر
شفیق ماؤں سی فاختائیں
تلاوتوں کے دیئے جلائیں
اندھیر ادر پن بشارتوں کا
اجالا جیسے فرشتہ کوئی صحیفہ کھولے
وسیع گہرے سمندروں میں
خدا کے پیروں کا عکس ڈولے
دعائیں مانگو
ہمارے اندر
ہمارے ماں باپ کی شبیہیں
ہمارے ہونٹوں سے مسکرائیں
ہماری آنکھوں سے جگمگائیں
ہماری تنہائیاں بسائیں
دعائیں مانگو

کراچی میں جمیل فاطمہ کی بیماری میں اپنے جھوٹے وعدوں سے انہیں ستانے کے باوجود، ندا کی ان کوؤں سے دوستی نہیں ٹوٹتی۔ روز کی یہ دوستی یوں ہی چلتی رہتی ہے۔ انہیں ندا کی ضرورت ہو نہ ہو لیکن اسے ان کی ضرورت ہے، ان کی وجہ سے اس کی بنجارہ مزاجی کو گھر سے ایک لگاؤ سا پیدا ہو گیا ہے۔ وہ رات بھلے ہی کہیں بتائے لیکن سویرے اپنے بستر سے جاگنے کی عادت اب اس کا معمول ہے۔ جب وہ ممبئی سے باہر ہوتا ہے تو ساڑھے نو بجے کے یہ دوست ہی، وہ جہاں بھی ہو، وہاں آکر اسے گھر کی یاد دلاتے ہیں اور جلدی واپس آنے کی تاکید فرماتے ہیں خالی گھر کو گھر کرنے کے لئے اپنے علاوہ کسی اور کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس ضرورت نے کئی اور بہانے بھی تلاش کئے ہیں۔ ان میں کمپاؤنڈ میں کھڑا پیپل کا ایک بیمار درخت بھی ہے۔ صبح کھڑکی سے ڈرائنگ روم میں کچھ دیر کو اترتی تھوڑی سی دھوپ بھی ہے۔ ڈرائنگ روم کے سامنے والی کھڑکی کی اجنبی لڑکی بھی ہے۔ جو گھر کے کام سے فارغ ہو کر دن میں ایک دوبار کھڑکی میں نظر آجاتی ہے اور ان کے علاوہ مولسری کے وہ پھول بھی ہیں جو ہوا کے جھونکوں سے اڑ کر اس کی گیلری میں چلے آتے ہیں۔ اس چھوٹے سے پریوار میں کچھ دن سے مٹی کے گملے میں ایک گم سم کیکٹس بھی ہے جو صبح شام ندا کے دو کٹورے پانی سے اشنان کر کے مہاتما بدھ کی طرح اپنے دھیان میں کھویا رہتا ہے۔ جب وہ آنکھیوں کو کھولتا ہے تو اس کی ایک آنکھ میں ماضی جگمگاتا ہے دوسری میں حال مسکراتا ہے۔ ماضی سے ایک چہرہ جھانکتا ہے۔

دسمبر کی ایک سرد چاندرات میں سارا محلہ سویا ہوا ہے۔ گلی کے کونے پر ایک پرچھائیں آکر کنویں کی طرف مڑ جاتی ہے کنویں کے برابر ایک تنگ زینے کے اوپر ایک سنسان کمرہ ہے۔ اس کمرے کی خاموشی میں ندا کے ہاتھوں کو اپنی ہتھیلیوں اور ہونٹوں سے گرم کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

"مجھے وہ گھر اچھا لگتا ہے جس کی کھڑکی سے صبح دھوپ اترتی ہے جہاں سے ڈھلتا ہوا سورج نظر آتا ہے۔ ارد گرد ہرے بھرے درختوں کی شاخیں جھولتی ہیں اور منڈیروں پر کوّے پوسٹ مین کی طرح آتے ہیں اور پردیسیوں کے پیغام سناتے ہیں"

اس رات کے سناٹے میں ندا کو عشرت کی سر گوشیوں میں ایک چھوٹا سا چہ ہمکتا محسوس ہوتا ہے۔ یہ چہ پھر ان سر گوشیوں کو پھلانگ کر کنویں کے پیچھے اسکے گھر میں اگے ہوئے بہت سارے رنگ برنگے پھولوں سے کھیلنے لگتا ہے۔ کھیلتے کھیلتے جب تھک جاتا ہے تو آسمان میں پورا چاند بن جاتا ہے۔ اس چاند کو عشرت اور وہ ایک ساتھ دیکھتے ہیں۔ پھر عشرت نظریں جھکا لیتی ہے اور ندا اس چے کی تلاش میں دور نکل جاتا ہے جو بار بار اپنے روپ بدلتا رہتا ہے۔ اس کی تلاش میں وہ اتنی دور نکل جاتا ہے جہاں سے پیچھے مڑ کر دیکھنے پر اسے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اس رات اس نے سوچا تھا، اس چے کو ہم دونوں ایک ساتھ تلاش کریں گے لیکن کچھ دن کے بعد اس تلاش میں وہ تنہا ہی بھٹکتا محسوس ہوتا ہے۔ اس رات کے بعد ندا کی عشرت سے ملاقات نہیں ہوتی۔ وہ ممبئی سے جب بھی ادھر جاتا مایوس ہو کر لوٹ آتا۔ وقت گذرتا جاتا ہے۔ ندا زندگی کی بھاگ دوڑ میں کھو جاتا ہے۔ اور وہ ایک سرکاری مقامی کالج میں فائن آرٹس کی لیکچرر بن کر طے شدہ راستہ سے اپنے مستقبل کی طرف مڑ جاتی ہے۔ وہ آرٹسٹ ہے کئی شہروں میں اس کی پینٹنگز کی نمائش ہو چکی ہے۔ اس کی تصویروں کے رنگ سرخ اور سیاہ کے امتزاج لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کی تصویروں میں بیشتر بنا جسم کے ہاتھ، پاؤں، آنکھیں یا صرف آدھا چہرہ ہوتا ہے۔ لیکن پورا چاند ہر کینوس میں ضرور ہوتا ہے۔ اس کی ایک تصویر کو مدھیہ پردیش کا سرکاری انعام بھی ملا ہے۔ اس تصویر میں دھوپ سے روشن ایک منڈیر پر چونچ کھولے ایک کوا بیٹھا ہے جسے ایک ہرے درخت میں چھپا ہوا چاند دیکھ رہا ہے۔ چاند کا تین چوتھائی حصہ بادل سے ڈھکا ہے۔

ممبئی سے آتی جاتی خبروں نے عشرت کو یقین دلا دیا تھا کہ دھوپ، درخت اور پوسٹ مین کوؤں کو اکٹھا کرنا ندا کے لئے آسان نہیں ہے اس لئے اس کے ماں باپ، اسی کے اصرار پر اس کی پسند کے گھر کی تلاش میں جٹ جاتے ہیں۔ لیکن عشرت تک آتے آتے ہر گھر واپس اپنی جگہ لوٹ جاتا ہے۔ ایک دن وہ خود اپنی تلاش کے گھر پر دستک دیتی ہے گھر کا دروازہ کھلتا ہے۔ لیکن یہ گھر شادی شدہ ہوتا ہے جو کچھ ہی مہینوں تک اس کی مصوری کا موضوع بن کر

ہمیشہ کے لئے دروازہ بند کرلیتا ہے۔ وہ پھر سے اپنے اسی کمرے میں عمر کی ڈوری میں گانٹھیں لگاتی رہتی ہے جس میں کبھی اس کی پھوپی جوانی سے بڑھاپے کی سرحد میں داخل ہوئی تھی۔ اس کی چھوٹی بہن اپنے آفس میں کسی لڑکے کے ساتھ دو تین مہینے کے لئے غائب ہو جاتی ہے جب وہ لوٹ کے آتی ہے تو مسلمان کے پیٹ میں ہندو کو چھپائے ہوئے ہوتی ہے۔ ماں باپ کی تنبیہہ کے باوجود وہ اپنے ماں بننے کے حق کو مذہبی اختلافات کے حوالے کرنے کو تیار نہیں ہوتی، کچھ دن کے لئے وہ لڑکا عبداللہ بن کر لڑکی کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے اور پھر پہلے کی طرح رمیش بن جاتا ہے۔ اس کی دوسری بہن نے کنویں کے اوپر والے گھر کو آباد کر لیا ہے۔ وہ بھی اپنے پسند کے ساتھی کے ساتھ رہتی ہے۔ عشرت کے کالج کی دوست گھر بار کی ہو کر اس کی تنہائی پر طنز کرنے لگی ہیں وہ ان کی باتوں کو یوں ہی ہنسی میں ٹالتی رہتی ہے۔ لیکن ایک دن جب کالج کے لئے تیار ہوتے وقت خود اس کا آئینہ بھی اس سے گستاخی کرتا ہے تو اس کا غرور بکھرتا ہے۔ ندا کو ممبئ میں آئے اب کئی سال ہو چکے ہیں۔ ان کئی سالوں میں کچھ چمبور کے پانجراپول میں، کچھ گوونڈی کی میونسپل چال میں، کچھ سینڈہرسٹ روڈ پر تصدیق سہاروی کے گھر کے پاس کی ایک عمارت کی دوسری منزل میں، کچھ پالی ولیج کے ۶ اویں راستہ کے ایک بے نام ہوسٹل میں اور کچھ باندرہ ایسٹ کے گورنمنٹ کوارٹر کے ایک کمرے میں گذرے تھے۔ باربار بدلتی ان قیام گاہوں میں ندا کا رشتہ اس چہ سے ختم نہیں ہوتا جسے دسمبر کی سرد رات میں اچانک کنویں کے اوپر کے کمرے کی خاموشیوں نے جنم دے کر پھولوں بادلوں اور موسموں میں چھپادیا تھا۔ یہ رشتہ ایک یاد کی صورت اس کی تنہائیوں میں سسکتا رہتا تھا۔ ممبئ کے مختلف علاقوں کا لمبا چکر کاٹ کر وہ کھار ڈانڈا میں اپنے فلیٹ میں آیا تھا۔

اتنے لمبے سفر کی تھکن میں اس کی کئی بیماریاں جو کئی برسوں سے اس کے ساتھ مسافرانہ بھٹک رہی تھیں ان میں سے ایک اچانک ڈاکٹر کا پتہ پوچھنے لگتی ہے اس بیماری کا مریض تو وہ ممبئ میں آنے کے کچھ دن بعد سے ہی تھا لیکن ان دنوں صبح کو شام اور شام کو صبح کرنے میں اتنا وقت نکل جاتا تھا کہ بیماری جیسی غیر ضروری ضرورتوں پر دھیان نہیں جاتا

تھا۔ ممبئی میں ان دنوں نہ راستے تھے نہ چہرے تھے نہ عمارتیں تھیں۔ ہر طرف تندور کی پھولی پھولی روٹیاں دکھائی دیتی تھیں۔ وہی چلتی پھرتی تھیں، وہی روتی مسکراتی تھیں۔ وہی آپس میں لڑتی جھگڑتی تھیں۔ یہ روٹیاں بھی عجب طلسماتی تھیں جہاں یہ نظر آتی تھیں وہاں نہیں ہوتی تھیں۔ دور سے قریب نظر آتی تھیں۔ مگر قریب سے دور ہو جاتی تھیں۔

کئی دن مسلسل ساتھ رہنے کی وجہ سے ندا اور اس کی بیماری ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچان چکے تھے۔ اس نے حالات کا جائزہ لے کر مناسب وقت پر اپنی تکلیف کا اظہار کیا تھا۔ اس بیماری کا نام ڈاکٹر نے ہرنیہ بتایا تھا اور اس کا واحد علاج آپریشن تھا۔ آپریشن حالانکہ معمولی تھا لیکن زندگی میں بدن کی پہلی چیر پھاڑ کے خیال سے وہ ڈرا ہوا تھا۔ یہ ڈر اس کے اکیلا ہونے کی وجہ سے زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔ کئی بار تو ایسا ہوتا ہے جب درد زیادہ ستاتا ہے تو وہ گھر سے ہاسپٹل کی طرف جاتا ہے اور آدھے راستے میں ہی خود کو سمجھا بجھا کر واپس لے آتا ہے جن دنوں وہ اس خوف کے شکنجے میں بری طرح سے الجھا ہوا تھا، گجراتی فلموں کی ایک ادکارہ سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ وہ ورلی میں پونم اپارٹمنٹ کے فلیٹ سے باندرہ میں روی درشن میں رہنے آئی تھی۔ پھر وہیں بار بار دکھائی دیتی ہے۔ ایک دن صبح دروازہ پر دستک ہوتی ہے اور دستک ایک جسم بن جاتی ہے۔ اس کا نام مالتی جوشی ہوتا ہے۔ وہ اپنی آواز میں غزلوں کا ایک کیسیٹ بنانا چاہتی تھی۔ اس میں کچھ غزلیں ندا کی بھی شامل کرنے کا ارادہ ظاہر کرتی ہے۔ اس سلسلے میں اسی طرح دو چار ملاقاتیں اور ہوتی ہیں۔ انہیں ملاقاتوں میں اسے ندا کی بیماری اور اس کے خوف کا علم ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف ندا کے ذہن سے آپریشن کا خوف مٹاتی ہے ہاسپٹل میں اس کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بھی نبھاتی ہے۔ ہاسپٹل میں اسٹریچر پر ڈال کر جب اسے آپریشن روم میں لے جایا جاتا ہے تو مالتی کا ہاتھ ہی اس کی پیشانی کو چھو کر اس میں حوصلہ جگاتا ہے۔ وہی گارنٹی کارڈ پر دستخط کرتی ہے لیکن آپریشن کے بعد انیستھیسیا کے نشے میں جب وہ اپنے بستر پر لٹایا جاتا ہے تو مالتی چلی جاتی ہے اور عشرت اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ رات بھر وہی اس کے ساتھ رہتی ہے لیکن صبح ہوتے ہی وہ غائب ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ مالتی کمرے

میں بیٹھی نظر آتی ہے۔ وہ چائے کا کپ دیتے ہوئے کہتی ہے۔
"تم بے ہوشی میں نہ جانے کیا کیا بول رہے تھے۔ گوالیار سے کون آنے والا تھا جس کا تم بار بار نام لے رہے تھے کسی کو تم نے لکھا تھا"؟

"لکھا تو تھا، لیکن ممبئی اور گوالیار کا فاصلہ تقریباً نو سو میل کا ہے، کوئی آنا بھی چاہے تو ریل سے ۲۴ گھنٹوں سے زیادہ لگتے ہیں" شاید فاصلوں نے اسے روک لیا ہے۔ وہ جواب دیتا ہے۔

"پریشانی میں فاصلوں کو کون دھیان دیتا ہے۔ میرے گھر سے تمہارے گھر کا فاصلہ تو صدیوں دور تھا۔ مالتی مسکراتے ہوئے کہتی ہے۔ ندا کو یاد آتا ہے مالتی کے گھر والوں کو ایک مسلمان کے ساتھ اس کی نزدیکیاں پسند نہیں ہیں۔ وہ اپنے ماتا پتا کی مخالفت کے باوجود اس کے ساتھ ڈیڑھ دن سے ہاسپٹل کے کمرے میں ہے۔ وہی اسے یہاں لاتی ہے وہی یہاں سے اسے واپس گھر لے کے آتی ہے۔

اس کا زیادہ وقت اب ندا کے ساتھ گذرتا ہے۔ اس کے گھر والوں کی مخالفت جب زیادہ سر اُٹھاتی ہے تو وہ ایک دن اپنا اٹیچی لے کر ندا کے گھر چلی آتی ہے۔ وہ بنا کسی قانونی تحفظ کے ساتھ ساتھ رہنے لگتے ہیں اور پھر ایک رات کے پچھلے پہر وہ ہندو مسلم کے صدیوں پرانے حصار سے باہر نکل کر عورت اور مرد بن جاتے ہیں۔

عورت نے اپنے جسم سے پچیس ندیاں نکال کر دھرتی پر چاروں طرف پھیلادیں اور مرد کو آواز دی، پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی سے ٹکراتی اس آواز کو سن کر مرد نے سمندر کی طرح چاروں دشاؤں میں پھیل کر ان ندیوں کو اپنی بھجاوں میں سمیٹ لیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں مل کر مکمل ہو گئے تھے۔ عبادت گاہوں میں گہری نیند میں سوئی ہوئی خدائی مورتیوں نے اس تماشہ کو دیکھا اور خوف زدہ ہو گئیں۔ وہ اپنے پتھروں کے خول سے باہر آئے اور عورت اور مرد کے ملے جلے اس وجود کو اٹھا کر پہاڑ کی اس چوٹی پر لے گئے جہاں عورت کی آواز ٹکرائی تھی اور مرد نے اسے سنا تھا۔ ڈرے ہوئے دیوتاؤں نے آسمان کے تیز دھار سورج سے اس مکمل وجود کو تقسیم کر کے عورت کو مرد سے اور مرد کو عورت سے الگ کیا اور ایک

تکمیل کے دو ادھورے حصوں کو مختلف سمتوں کے حوالے کر دیا۔ اس دن سے آج تک ایک ادھورا حصہ، پورا ہونے کے لئے دوسرے ادھورے حصے کی تلاش میں ہے۔ لیکن یہ تلاش کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اس تلاش میں کسی موڑ پر جو ملتا ہے وہ سمجھوتہ ہوتا ہے۔

مدتیں بیت گئیں
تم نہیں آئیں اب تک
روز سورج کے بیاباں میں بھٹکتی ہے حیات
چاند کے غار میں
تھک ہار کے سو جاتی ہے رات
پھول کچھ دیر مہکتا ہے
بکھر جاتا ہے
ہر نشہ
لہر بناتے ہی اتر جاتا ہے
وقت! بے چہرہ ہواؤں سا گزر جاتا ہے
کسی آواز کے سبزے میں لہک جیسی تم
کسی خاموش تبسم میں چمک جیسی تم
کسی چہرہ میں مہکتی ہو آنکھوں جیسی
کہیں ماتھا، کہیں گیسو، کہیں بانہوں جیسی
چاند سے پھول تلک
یوں تو تمہیں تم ہو مگر
تم کوئی چہرہ، کوئی جسم کوئی نام نہیں
تم جہاں بھی ہو!
ادھوری ہو حقیقت کی طرح

تم کوئی خواب نہیں ہو
جو مکمل ہوگی

مالتی کے آجانے سے گھر میں کئی تبدیلیاں نظر آنے لگی ہیں۔ بیڈ روم کو ڈرائنگ روم سے ایک پردہ ڈال کر الگ کر دیا گیا۔ اب ملنے جلنے والے باہر ہی بیٹھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ آتے ہی پورے گھر کا جائزہ نہیں لیتے۔ پہلے کی طرح اب چھوٹے بڑے اڈوں کے پرانے ہم پیالہ، شام ہوتے ہی وقت گذارنے یہاں نہیں آتے۔ آنے جانے والی لڑکیوں کی گنتی بھی اب آہستہ آہستہ کم ہوتی جارہی تھی۔ شائستہ گھروں کے دوست اب شام ہوتے ہی، گندی گالیوں سے گفتگو کو مزے دار بنانے اور فحش لطیفے سنانے کے لئے ادھر کا رخ نہیں کرتے......

یہ تبدیلیاں جب مقامی ہندی، گجراتی اخباروں میں خبریں بنتی ہیں تو مالتی آزاد رشتے کو پابند بنانے پر اصرار کرتی ہے۔ اس کے لئے وہ کورٹ سے فارم بھی لاتی ہے جو ابھی تک جیسے آئے تھے ویسے ہی گھر میں کہیں پڑے ہیں۔ ندا اور مالتی کا رشتہ دو ایسے پرندوں جیسا ہے جو ایک آسمان میں پرواز کرتے ہوئے اپنے اپنے ستاروں کے ہم سفر ہیں۔ ندا اس کی پرسنل لائف میں مداخلت کرنا مناسب نہیں سمجھتا لیکن وہ اکثر فون پر نسائی آوازوں کو سن کر کچھ ایسی ترشی سے بات کرتی ہے کہ فون کرنے والی پھر اپنی ڈائری سے ہمیشہ کے لئے ندا کا نمبر ہی کاٹ دیتی ہے۔ وہ آئے دن ایسی شکایتوں کو سنتا ہے لیکن بات آگے نہیں بڑھاتا۔ عورت پابند ہو یا آزاد کچھ دن ساتھ ساتھ رہنے کے بعد سب ایک جیسی ہو جاتی ہیں۔ مالتی کا یہ بدلا ہوا روپ اسے اکھرتا ہے لیکن اس کے ساتھ وہ اپنی تنہائیوں سے بھی ڈرتا ہے۔ ندا کی بنجارہ مزاجی اسے ورثہ میں ملی ہے، وہ لاکھ احتیاط برتے لیکن یہ کب چلتے چلتے اسے کدھر موڑ دے، اس کی اطلاع اسے اس وقت ہوتی ہے جب وہ واقعہ وجود میں آچکا ہوتا ہے۔

مالتی دو مہینے کے لئے ایک میوزک کنٹریکٹ پر مڈل ایسٹ میں بحرین جاتی ہے۔ اسی دوران کراچی سے ندا کی بڑی بہن قمر طلعت اچانک ممبئی آتی ہے۔ اس بار وہ پوری تیاری سے آئی تھیں۔ جمیل فاطمہ نے اپنی حیات میں سب بھائی بہنوں کی تقریبات کے لئے زیورات

بنوائے تھے۔ ندا کے نام کے زیورات اور دلہن کا زری کا موروثی جوڑا بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ اس بار ہر قیمت پر ندا کی ملحدانہ بے راہ رویوں میں شریعتی اعتدال پیدا کرنے کی خواہش مند ہے۔ اس کار ثواب کے لئے اس کے ذہن میں ایک ہی نام تھا اور وہ نام تھا عشرت۔

"بہت گل چھرّے اڑا لئے۔ اب خدا کا خوف کھاؤ اور راہ راست پر آجاؤ۔ عشرت ہماری جان پہچان کی ہے۔ بچپن سے ہم ایک دوسرے کے خاندانوں کو جانتے ہیں۔ وہ تمہارے ساتھ ہوگی تو میں کراچی میں تمہاری طرف سے بے فکر رہوں گی۔ سارے بہن بھائی خدا کے فضل اور مرحوم صاحب اور بابو جی کی دعاؤں کے طفیل اپنے اپنے گھر کے ہو چکے ہیں۔ ایک تم ہو جس کے غم میں صاحب ہمیشہ خواب میں پریشان نظر آتی ہیں۔ زندگی میں تو انہیں چین نہیں لینے دیا۔ قبر میں تو آرام سے سونے دو" قمر طلعت بھیگی ہوئی آنکھوں کو دوپٹے سے پوچھتی ہوئی نماز کے لئے کھڑی ہو جاتی ہے۔

نماز پڑھتے ہوئے وہ پیچھے سے بالکل صاحب نظر آتی ہے۔ اس کے ہاتھوں میں سواد بھی جمیل فاطمہ جیسا ہے۔ جب سے آئی ہے وہی کھانا پکاتی ہے۔ اس کے ہاتھ کا کھانا کھاتے ہوئے وہ ہر بار پندرہ سال پیچھے لوٹ جاتا ہے۔ وہاں سے جب واپس آتا ہے تو سب کچھ بدل چکا ہوتا ہے۔ صرف چند یادیں کسی ویران مزار پر سلگتی اگر بتیوں کی طرح اندھیرے میں جگمگاتی ہیں اور پھر آپ ہی آپ بجھ جاتی ہیں۔ قمر طلعت کا اپنا کوئی بچہ نہیں ہے لیکن جمیل فاطمہ کے انتقال کے بعد ان کی ساری چھوٹی بڑی اولاد کی وہ اکیلی ماں ہے۔ اس کے اکیلے دم سے آج بھی الگ الگ گھروں میں تقسیم ہو کر بھی سارا خاندان جڑا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اسے دیکھ کر لگتا ہے صاحب مری نہیں ہیں اب بھی زندہ ہیں۔

بیسن کی سوندھی روٹی پر کھٹی چٹنی جیسی ماں
یاد آتی ہے چوکا، باسن، چمٹا، پھکنی جیسی ماں
بان کی کُھرّی کھاٹ کے اوپر ہر آہٹ پر کان دھرے
آدھی سوئی آدھی جاگی تھکی دوپہری جیسی ماں

چڑیوں کی چہکار میں گونجے رادھا موہن علی علی
مرغے کی آواز سے بجتی گھر کی کنڈی جیسی ماں
بیوی، بیٹی، بہن، پڑوسن، تھوڑی تھوڑی سی سب میں
دن بھر اك رسی کے اوپر چلتی نٹنی جیسی ماں
بانٹ کے اپنا چہرہ، ماتھا، آنکھیں، جانے کہاں گئی
پھٹے پرانے اك البم میں چنچل لڑکی جیسی ماں

ندا قمر طلعت کی رائے سے متفق نہیں تھا۔ وہ مالتی سے رشتہ کی مخالف ہے۔ جب ندا اس کی تجویز کو ٹھکراتا ہے تو وہ چہرہ پر دوپٹہ لپیٹ کر گھر کے ایک کونے میں لیٹی دیر تک روتی ہے۔ ایسے ہی جیسے ندا کی شرارتوں سے ناراض ہو کر گوالیار میں جمیل فاطمہ روتی تھیں۔ عشرت اپنی ماں اور چھوٹے بھائی کے ساتھ ممبئی میں تھی۔ وہ سانتا کروز میں اپنے کسی رشتہ دار کے یہاں ٹھہری ہوئی تھی۔ قمر طلعت اور عشرت کی طویل خط وکتابت نے ندا کے جانے بغیر یہ پلان بنایا تھا۔ ندا عجیب الجھن میں تھا۔ ایک طرف قمر طلعت کے آنسو تھے۔ دوسری طرف عشرت اور اس کے ساتھ جڑا ہوا گوالیار کا وہ ماضی تھا جو ممبئی کے حال سے اپنی مطابقت کھو چکا تھا۔ ان دونوں کے درمیان مالتی جوشی اور ندا کے رشتہ کی بدنامی تھی۔

اس الجھن کے بارے میں باہر نکل کر پہلے وہ کمپاؤنڈ کے اس بیمار پیپل سے مشورہ کرتا ہے جس کے نیچے کھڑے ہو کر وہ روز صبح نئے دن کا آغاز کرتا ہے۔ اس درخت نے اس کی کئی الجھنوں کو سلجھایا ہے۔ پیڑ آسانی سے کسی کو دوست نہیں بناتے لیکن جب یہ دوست بن جاتے ہیں تو لمبا ساتھ نبھاتے ہیں۔ پیپل کا یہ درخت ندا کی کئی نظموں اور "دیواروں کے بیچ" کے پہلے حصہ کے کئی ابواب کا گھوسٹ رائٹر بھی رہا ہے۔ اسی نے فسادات کے دنوں میں اسکول جاتے بچوں کے تھیلوں سے نکال کر کئی نظمیں ندا کی بیاض میں لکھی تھیں۔ اسی نے سامنے کی فٹ پاتھ پر ٹیلی فون بوتھ کی مدراسی لڑکی کی اجنبی مسکراہٹ کو لفظوں میں روشن کیا تھا۔ چمکتے بتیس موتیوں والی یہ مسکراہٹ کئی نظموں کے روپ میں ندا کے نئے مجموعہ "کھویا ہوا سا

کچھ" میں شامل ہیں۔ "دیواروں کے بیچ" کے کئی حصوں کو جب وہ لکھتے لکھتے رک جاتا تھا تب یہی انہیں آگے بڑھاتا تھا۔ پیپل کا یہ پیڑ عمر میں ندا سے کافی چھوٹا ہے۔ امر اپارٹمنٹ کی تعمیر کے بعد ہی ندا کی زندگی میں اس کا جنم ہوا تھا لیکن ایک جگہ کھڑے کھڑے چاروں طرف گھومنے پھرنے کی اس کی عادت نے اسے کافی تجربہ کار اور باشعور بنا دیا ہے۔ وہ ندا کی پوری بات سن کر تھوڑی دیر غور کرتا ہے پھر گھر کے کسی بزرگ کی طرح سمجھاتا ہے۔

"اگر مرنے کے بعد ماں اپنی ممتا سے مجبور ہو کر دوبارہ تم سے ملنے آئے تو اس کے ساتھ پہلے جیسا سلوک نہیں کرنا چاہئے"۔

ندا کو یاد آتا ہے۔ جمیل فاطمہ کو سب سے زیادہ اسی نے ستایا ہے۔ وہ انہیں اور ستانا نہیں چاہتا۔ وہ قمر طلعت کی بات مان لیتا ہے۔ قمر طلعت ندا کے منہ سے وہی سن کر جو وہ سننا چاہتی تھی۔ فخریہ انداز میں کہتی ہے "مجھے معلوم تھا تم انکار نہیں کروگے۔ اللہ کے کرم سے اب تک پانچ بھائی اور تین بہنوں میں کسی کی اتنی ہمت نہیں ہوئی جو میری بات ٹال سکے"۔ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں پھر بھیگ جاتی ہیں لیکن اس بار وہ انہیں چھپانے کے لئے منہ کو دوپٹے سے نہیں چھپاتی ہونٹوں کی مسکراہٹ سے خوبصورت بناتی ہے۔ دوسرے دن عشرت اور ندا ایک رشتہ میں باندھ دیئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہی ہوتا ہے جس کا ذکر "دیواروں کے بیچ" کے پہلے حصہ کے آخری باب میں ہے۔ وہ گوالیار میں اپنی نوکری چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتی۔ ندا کی تنہائیاں بدستور قائم رہتی ہیں۔ اسی طرح ایک سال اور کچھ مہینے گذر جاتے ہیں۔ پھر اچانک ایک دن ممبئی میں اس کی آمد کی اطلاع ملتی ہے وہ اپنے ایک فیملی فرینڈ کے یہاں ٹھہری ہوئی تھی۔ ندا اس سے ملتا ہے لیکن دونوں کے بیچ جو شروع سے فاصلے تھے، وہ اسی طرح برقرار رہتے ہیں۔ وہ ممبئی آتی ہے اور دو دن کے بعد وہیں سے جہاں آکر وہ ٹھہری تھی واپس چلی جاتی ہے۔ وہ کیوں آتی ہے اور کیوں چلی جاتی ہے؟ اس کے بارے میں اس کی باتوں سے کچھ پتہ نہیں لگتا۔ یہ اس کی ندا سے آخری ملاقات تھی۔ اس کے جانے کے کچھ دن بعد بھوپال کے شہر قاضی کی طرف سے ندا کو ایک نوٹس بھیجا جاتا ہے جس میں یک طرفہ

طلاق کی کئی وجوہات درج ہیں۔ ندااس نوٹس کا جواب شہر قاضی کو دینے کے بجائے عشرت کو لکھتا ہے جس کا جواب حسب معمول خاموشی ہوتا ہے۔بعد میں معلوم ہوااس نے گوالیار سے بھوپال شفٹ ہو کر اسی کو اپنا ہم سفر بنالیا ہے جس کے ساتھ اس کی اوائل عمر کی بدنامی ان دنوں محلے کی عورتوں کا خاص موضوع تھا۔ ندا کی طرح اس کا بھی اپنا کوئی بچہ نہیں ہے۔اس نے اس کمی کو کوئی بچہ گود لے کر پورا کرلیا ہے۔ مشفق خواجہ نے ''دیواروں کے بیچ'' پڑھ کر کراچی سے لکھا تھا، اس میں عشرت کا کردار کچھ ادھورا سا لگتا ہے۔ واقعی وہ کردار ادھورا ہے لیکن اس کے ادھورے پن نے ندا میں بھی بہت کچھ ادھورا کردیا ہے۔ معلوم نہیں اس دو طرفہ ادھورے پن کا کون کتنا ذمہ دار ہے۔ نداشعوری سطح پر بھلے ہی اپنی دفاع میں نئی نئی دلیلیں سوچتا رہے لیکن جب بھی ممبئی کی مصروف زندگی میں وہ کچھ لمحے خود اپنے ساتھ گذارتا ہے تو اس کہانی میں اسے اپنا کردار بھی ویسا نظر نہیں آتا جیساوہ تحریری صورت میں ہے۔ عشرت کی طرح وہ بھی کئی نفسیاتی گتھیوں کا شکار ہے اور اس، کئی بار کے بنتے بنتے بگڑتے اور بگڑتے بگڑتے بنتے رشتہ کے ہمیشہ کے لئے ختم ہو جانے کے جرم میں وہ بھی برابر کا قصوروار ہے۔ اس احساس جرم کا اظہار اس نے اپنی نثر سے زیادہ نظم و غزل میں کیا ہے۔ شاید وہ دونوں ایک دوسرے کو زیادہ ہی پسند کرتے تھے، اسی لئے ایک دوسرے کو تباہ کرنے کے درپے بھی زیادہ تھے۔

جو ہو اک بار وہ ہر بار ہو ایسا نہیں ہوتا
ہمیشہ ایک ہی سے پیار ہو ایسا نہیں ہوتا

ہر اک کشتی کا اپنا تجربہ ہوتا ہے دریا میں
سفر میں روز ہی منجھدار ہو ایسا نہیں ہوتا

کہانی میں تو کرداروں کو جو چاہے بنادیجئے
حقیقت بھی کہانی کار ہو ایسا نہیں ہوتا

کہیں تو کوئی ہوگا جس کی اپنی بھی ضرورت ہو
ہر اک بازی میں دل کی ہار ہو ایسا نہیں ہوتا
سکھا دیتی ہیں چلنا ٹھوکریں بھی راہ گیروں کو
کوئی رستہ سدا دشوار ہو ایسا نہیں ہوتا

کھڑکی سے چھنتی دھوپ، گیلری میں آتے جاتے پرندوں اور ارد گرد پھیلے ہوئے ہرے بھرے پیڑوں کا، ندا کا یہ، گھر جس علاقہ میں ہے وہ غیر قانونی شراب، (جسے یہاں کی زبان میں ٹھرا یا بیوڑا کہتے ہیں) اور بھنی ہوئی یا تلی ہوئی تازہ مچھلیوں کے لئے کافی مشہور ہے۔ چاروں طرف سے سمندر سے گھرے ہوئے اس علاقہ کے پرانے باشندے مچھیرے ہیں۔ ان میں مشنری کے بنائے ہوئے عیسائی، امبیڈ کر کے تبدیل کئے ہوئے بودھ اور مراٹھی کولی شامل ہیں۔ لیکن پیشہ پہناوہ اور چھوٹے چھوٹے چال ٹائپ گھروں کے ڈیزائن ایک جیسے ہیں۔ کمروں کے اندر سجی تصویروں سے ہی گھر والوں کے عقیدوں کا سراغ ملتا ہے۔ ایک ہی سمندر سب کا روزی رساں ہے۔ نئی کشتی یا نیا جال اتارتے وقت سب کنارے پر ناریل توڑ کر سمندر کے دیوتا کے چرنوں پر پھول چڑھاتے ہیں۔ اور آسمان کی بیٹی صبح کے سامنے شیش جھکاتے ہیں۔ رگ وید کے منتروں میں پانی اور صبح کو دیویوں کے روپ میں سراہا گیا ہے۔ ایک بھجن میں صبح کی پرشسا (تعریف) اس طرح ہے۔

بیتے ہوئے یگوں کے وہ نشور جو تیرا انتظار کرتے تھے
اپنے دکھ سکھ میں تجھے پکارا کرتے تھے
اب ہم میں نہیں ہیں
اب ہم تیرے پرکاش کے پجاری ہیں
ہمارے بعد جو آئیں گے
وہ بھی تیرے اجالوں سے اپنی آنکھیں جگائیں گے

سمندر کئی نسلوں سے انہیں چھوٹی بڑی مچھلیاں، جھینگے، کیکڑے اور دوسری آبی

غذائیں دیتا رہا ہے۔اب بھی اس کی مہربانیاں پہلے کی طرح قائم ہیں۔ سمندر سے جو وہ پاتے ہیں پہلے خود کھاتے ہیں۔باقی کو بازار میں بیچ کر ضرورت کی دوسری چیزیں بناتے ہیں۔ سمندر سے قریب ہونے کی وجہ سے ان میں سے کچھ بڑے اسمگلروں کے چھوٹے کارندوں کے روپ میں بھی کام کرتے ہیں۔بے ایمانی کے دھندے میں جو ایک دوسرے پر زبانی بھروسہ ہوتا ہے جب وہ کبھی ٹوٹتا ہے تو سمندر سے طوفان پھوٹتا ہے اور دوسرے دن سمندر سے لاشیں بر آمد ہوتی ہیں۔ جنہیں سمندر کے بیچ کسی چٹان پر رکھ کر اگنی کے حوالے کردیا جاتا ہے۔شادی بیاہ میں بھی ان کے آپسی عقیدے آڑے نہیں آتے۔جوانی جوانی سے اپنی پسند کا رشتہ جوڑنے کے لئے آزاد ہے۔ عیسائی کے ساتھ ہندو، بودھ کے ساتھ عیسائی، ہندو کے ساتھ بودھ مل کر نسلیں بڑھاتے ہیں اور سمندر سے پیدا ہوتے ہیں اور سمندر ہی میں کھو جاتے ہیں۔باہر سے آنے والوں نے ان کی زمینیں اونے پونے داموں میں خرید کر بڑی بڑی عمارتیں بنائی ہیں اور سمندر کے ساتھ انہیں بھی کھلے راستوں سے ہٹا کر اندر کی طرف دھکیل دیا ہے۔ چھوٹی بڑی تنگ گلیوں میں سمٹ کر ڈانڈا کے مچھیروں کی یہ آبادی مچھلیوں کے ساتھ گھروں میں کشید کی گئی شراب کے اڈے بھی چلاتی ہے۔یوں تو پینے والے ہر وقت ان گلیوں کے چکر کاٹتے رہتے ہیں۔ لیکن سورج غروب ہوتے ہی چلتے ہوئے راستوں اور اونچی عمارتوں کے پیچھے کی یہ گلیاں دلہن بن جاتی ہیں۔گلیوں میں آتے جاتے قدموں کی آہٹوں اور بے فکر آزاد آوازوں کے قہقہے روشن ہو جاتے ہیں۔ان اڈوں میں ہر اڈے کا مالک مضبوط کاٹھی کا دھاکڑ آدمی ہوتا ہے۔جو وقت پر نشے میں بہکنے والوں پر اپنی طاقت بھی آزماتا ہے۔اڈے کے ایک کونے میں اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا وہ ہر ایک پر نظر رکھتا ہے۔وہ اڈے کا ٹھرّا خود نہیں پیتا اپنے پینے کے لئے وہ شراب سرکاری دوکان سے منگاتا ہے۔اسے اپنی بنائی ہوئی شراب اور انگریزی وہسکی کا فرق معلوم ہے لیکن یہاں کے ٹھرے کی وفاداری پوری ممبئی میں مشہور ہے۔ایک بار جس کے منہ لگ جاتی ہے اس کا مرتے دم تک ساتھ نبھاتی ہے۔

اس وفاداری کے کئی سانحے فلم انڈسٹری میں مشہور ہیں۔ان میں ایک ندا کا میوزک

ڈائریکٹر دوست مانس مکھرجی بھی تھا۔ مانس کلکتہ میں شانتی نکیتن میں تعلیم پوری کر کے اپنی قسمت آزمانے ممبئی آیا تھا۔ خوبصورت آواز اور سنگیت کی کلاسیکی جانکاری کئی دروازوں پر دستک دیتی ہے لیکن ہر دروازہ پر کوئی نہ کوئی قفل لگا ملتا ہے۔ ان تالوں کی چابیاں تلاش کرتے کرتے ایک دن وہ ادھر آنکلتا ہے۔ اسے یہاں چابیاں تو نہیں ملتیں۔ یہاں کی شراب سے اس کی جان پہچان ہو جاتی ہے جو چند ہی دنوں میں گہری دوستی میں بدل جاتی ہے۔ دن بھر کی بھاگ دوڑ سے ٹوٹ کر جب وہ یہاں کے ٹھرے کو منہ سے لگاتا تھا تو وہ گلے سے اترتے ہی نہ صرف اسے پھر سے جوڑ کے تازہ دم بناتا تھا بلکہ ہر شام اس کی قابلیت اور صلاحیت کی مدح میں ایک لمبا قصیدہ بھی سناتا تھا۔ اس تعریفی قصیدے میں اس کی تعریف کے ساتھ ان سارے میوزک ڈائریکٹروں کی نام بہ نام ہجو بھی شامل ہوتی تھی جو ایک ساتھ کئی کئی فلموں کے سنگیت میں مصروف تھے۔ مانس مکھرجی کو اس ٹھرے کی زبانی اپنی تعریف سے زیادہ دوسرے فنکاروں کی تنقیص پسند آتی تھی۔ جسے وہ رات کو دیر دیر تک سنتا رہتا تھا۔

اپنی تعریف اور دوسروں کی برائی سننے کی اسے ایسی عادت پڑ جاتی ہے کہ وہ دن میں کام کرتے وقت بھی کسی کو بھیج کر یہاں سے ٹھرا منگانے لگتا ہے۔ شراب کی زیادتی تندرستی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ گلے کا سریلا پن غائب ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر شراب کو ہمیشہ کے لئے چھوڑنے کی تاکید کرتا ہے لیکن وہ وفادار سے بے وفائی کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ ندا کی اس سے آخری ملاقات کھار ڈانڈا کے گھر میں ہوتی ہے۔ وہ اپنی شراب اسی علاقہ سے خرید کر جیب میں رکھ کر لایا تھا۔ ندا کے منع کرنے پر وہ گھر میں نہیں پیتا، لیکن جیسے ہی نیچے اترتا ہے جلدی جلدی کافی سے زیادہ پی جاتا ہے۔ اور فلم شاید کا ایک گیت (جو اس نے کمپوز کیا تھا) کا مکھڑا گنگناتے ہوئے چلا جاتا ہے۔

دن بھر دھوپ کا پربت کاٹا شام کو پینے نکلے ہم
جن گلیوں میں موت چھپی تھی ان میں جینے نکلے ہم

اس ٹھرے نے مانس کا ساتھ آخری سانس تک نبھایا۔ اسپتال میں بھی وہ لاکھ پہروں

کے باوجود اس تک پہونچ جاتا تھااور اس کی شان میں روتے ہوئے قصیدہ بھی سناتا تھا۔

مانس کی طرح اس شراب کے اسیر اور بھی کئی جانے پہچانے لوگ تھے۔ فلموں کے وہ پرانے کلاکار جو اپنے اسٹرگل کے دنوں میں اس سے اپنا غم بہلاتے تھے اپنی منزلوں پر پہونچنے پر بھی اسے نہیں بھول پاتے۔ ان کی شامیں اب اسکاچ سے ضرور طلوع ہوتی تھیں۔ لیکن رات کا آخری جام جب تک ان گلی کوچوں سے چل کر ان تک نہیں آجاتا انہیں نیند نہیں آتی۔

یہ شراب جو اپنی بدنامی کی وجہ سے کافی شہرت یافتہ ہے اس کی خاصیت وہ کک (Kick) ہے جو پیٹ میں اترتے ہی وہ اندر سے لگاتی ہے۔ اندر سے اس کی لات لگتے ہی پینے والا، آدمی سے فٹ بال بن کر آن کی آن میں زمین سے آسمان تک کا سفر پورا کرلیتا تھا آسمان پر پہونچ کر وہ جتنی دیر وہاں ٹھہرتا تھا اسے نیچے کی دنیا میں گیٹ وے آف انڈیا، ٹی وی ٹاور، لمبا چوڑا سمندر، آسمان چھوتی عمارتیں، چلتی پھرتی کاریں بچوں کے کھلونے جیسے نظر آتے تھے۔ وہ اوپر سے ہی ہاتھ بڑھاکر کھلونوں کی طرح ان میں چابیاں بھرتا جاتا تھا، انہیں جیسا چاہتا تھا گھماتا تھا نچاتا تھااور ان سب میں اپنی حکمرانی دیکھ کر خوش ہوکر تالیاں بجاتا تھا۔ نشہ اترتے ہی وہ واپس زمین پر آتا تھا پھر دوسرا پیگ چڑھاکر وہیں لوٹ جاتا تھا۔ رات کو دیر تک جب وہ اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر کی قلابازیوں سے تھک جاتا تھا تو دنیا کو ٹھوکر مار کر دنیا کو دنیا سے بھگادیتا تھا۔

ان غیر قانونی اڈوں سے پولس کو پابندی سے ہفتہ دیا جاتا تھا۔ لیکن جب پولس والوں کو ان اڈوں میں کچھ کھاتے پیتے لوگ نظر آتے تھے تو وہ بلائے ناگہاں کی طرح اندر گھس آتے تھے اور شریفوں سے ان کی عزت لوٹانے پر اچھی خاصی رقم وصول کرتے ہیں۔ ان اڈوں میں سے ایک میں ایک رات کرشن چندر، ساحر لدھیانوی، شاہد لطیف اور ان کے ساتھ کئی دوسرے نامی گرامی بھی باعزت سے بے عزت ہو چکے ہیں۔

ندا نے مکان کے بعد ایک سیکنڈ ہینڈ کار بھی خریدلی۔ ڈرائیونگ پر مہارت حاصل کئے

بغیر ہی اپنے تعلقات کی بنا پر گاڑی چلانے کا لائسنس بھی لے لیا ہے پہلی بار گاڑی آتی ہے تو دوسروں کو دکھانے کے لئے زیادہ چلائی بھی جاتی ہے۔ اسٹیرنگ پر کنٹرول کی کمی تھی گاڑی کو ایک گیئر سے دوسرے گیئر میں کرنے سے پہلے سوچا جاتا تھا پھر سوچ کو عمل میں لایا جاتا تھا۔ جو بھی ساتھ بیٹھتا وہ یہ دیکھ کر گھبراتا اور بار بار اپنے جان ومال کی حفاظت کے لئے دل ہی دل میں دعا مانگتا۔ اقبال مجید کے چھوٹے بھائی، اجلال مجید بھوپال سے پہلی بار ممبئی آتے ہیں۔ جاں نثار اختر کے ہم زلف اور ندا کے اچھے شاعر دوست ہیں۔ ندا کو جیسے ہی ان کے آنے کی اطلاع ملتی ہے، وہ اپنی شان دکھانے کے لئے فوراً گاڑی لے کر ان تک پہونچ جاتا ہے۔ اور انہیں اپنے ساتھ لے آتا ہے۔ باندرہ کے ۲۹ ویں راستے سے نکل کر پہلے وہ کارٹر روڈ کے کونے کی پان کی دکان ''شانِ اودھ'' پر رکتا ہے۔ خود بھی پان کھاتا ہے، اجلال کو بھی کھلاتا ہے۔ وہاں سے سیدھا گھر کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ دوپہر میں سڑک پر زیادہ بھیڑ بھاڑ نہیں تھی۔ گاڑی چلانے میں زیادہ دقت نہیں ہوتی۔ اجلال سے نئی پرانی باتیں بھی جاری تھیں اور گاڑی بھی چل رہی تھی۔ کارٹر روڈ اور ندا کے گھر کے بیچ میں ڈانڈا شروع ہونے سے پہلے سمندر کے سامنے کی فٹ پاتھ پر ایک ساتھ کئی جھونپڑیاں بنی تھیں۔

ممبئی میں سرکاری جگہوں کو غیر سرکاری لوگ خریدتے بیچتے رہتے ہیں۔ ایسے ہر علاقہ کے الگ الگ مالک ہوتے ہیں۔ زمین سرکاری، علاقے کا دادا بیوپاری۔ وہ اپنے علاقے میں جس کو بھی جھونپڑی باندھنے کی اجازت دیتا ہے، معاوضے میں اس سے اچھی خاصی رقم لیتا ہے۔ اس رقم میں میونسپل کارپوریشن کے لوگوں کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ اس رقم کے اور بھی حصہ دار ہوتے ہیں۔ ان میں بے پردہ اور پردہ نشین دونوں شامل ہوتے ہیں۔ یہ جھونپڑیاں کہیں بھی کسی بھی جگہ رات ہی رات میں بن کر تیار ہو جاتی ہیں۔ جس جگہ یہ تعمیر ہوتی ہیں اس جگہ کے فلیٹوں کی قیمت صبح ہوتے ہی ایک چوتھائی کم ہو جاتی ہے۔ ان جھونپڑیوں میں رہنے والے ہندوستان کی مختلف ریاستوں سے ممبئی میں روزی روٹی کمانے آتے ہیں۔ کچھ دن فٹ پاتھوں پر سوتے جاگتے ہیں، جب تھوڑی بہت رقم بنا لیتے ہیں تو کسی

بھی علاقہ کے داداکو تھمادیتے ہیں۔ آزادی کے بعد دیش کا اقتصادی ڈھانچہ پنڈت نہرو کی نگرانی میں تیار ہوا تھا۔ نہرو ڈسکوری آف انڈیا لکھنے کے باوجود ہندوستان سے اتنا واقف نہیں تھے جتنا گاندھی تھے۔ نہرو اپنے وقت کے کامیاب ترین وکیل موتی لال کے اکلوتے بیٹے تھے، آسائشوں میں پلے بڑھے تھے۔ مسائل کو کمروں میں دلیلوں اور فارمولوں سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ گاندھی ان کے برعکس زمین کے بیٹے تھے۔ زمین کے درد کو زمین بن کر پہچانتے تھے۔ نہرو کا دیش بڑے بڑے شہروں میں بڑی بڑی صنعتوں میں تھا اور گاندھی اسے ان چھوٹے چھوٹے، پچھڑے ہوئے علاقوں میں تلاش کرتے تھے جن میں تین چوتھائی دیش بستا ہے، لیکن دیش کے وکاس میں باپو کی سوچ کو ان کے جیون کال میں چرخہ اور سوت بنا کر الگ کردیا جاتا ہے اور پنڈت نہرو کا ہندوستان شہروں کے راستوں سے آگے بڑھتا جاتا ہے۔ دھرتی پوجا کے اس دیش میں دھرتی کے اپمان کا ثبوت شہروں کی بڑھتی ہوئی آبادیاں ہیں۔ ان آبادیوں میں پلتے جرائم ہیں۔ ان جرائم کی کوکھ سے پھوٹتی سیاستیں ہیں، ان سیاستوں کے ہاتھوں بنتے ہوئے داؤد ہیں، گاؤلی ہیں، حاجی مستان ہیں اور ان سماج دشمن عناصر سے جڑی ہوئی سرکاریں ہیں۔ اور ان سرکاری شکنجوں میں لمحہ لمحہ ٹوٹتے بکھرتے عوام ہیں۔

ڈانڈا کی جھونپڑپٹی کے سامنے کے بس اسٹینڈ پر بس کے رکتے ہی کئی مسافر اترتے ہیں اور بھاگتے ہوئے سڑک پار کرتے ہیں۔ ندا اجلال کی باتوں میں بھوپال کے کسی راستہ میں گھوم رہا تھا کہ اچانک ممبئی کی سڑک سے گذرتی اس کی گاڑی سے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی ٹکرا جاتا ہے۔ تیز اسپیڈ میں بریک لگنے سے کار رک تو جاتی ہے لیکن ٹکرانے والا آدمی جہاں گاڑی رکتی ہے وہاں سے نو دس قدم دور جاکر گرتا ہے۔ ایکسیڈنٹ کے ہوتے ہی جھونپڑیوں سے آدمی اور عورتیں نکل نکل کر باہر آتے ہیں۔ ندا گھبرا جاتا ہے۔ وہ کبھی زخمی آدمی کو دیکھتا ہے کبھی بڑھتی ہوئی بھیڑ کو۔ اس وقت اجلال کی سوجھ بوجھ کام آتی ہے اس سے پہلے کہ ناراض ہوتی بھیڑ کا غصہ ندا اور اس کی کار کو نشانہ بنائے، اجلال اس آدمی کو اٹھا کر کار میں بٹھا دیتا ہے۔

سرکاری اسپتال میں ڈیوٹی آفیسر کو جو رپورٹ لکھائی جاتی ہے اس کے مطابق مریض زخمی حالت میں سڑک پر پایا جاتا ہے۔ اجلال اسے دے دلا کر کچھ اس طرح پٹاتا ہے کہ کلرک کا قلم وہی لکھتا ہے جو اس سے لکھایا جاتا ہے۔

اس طرح ندا قانونی گرفت سے تو بچ جاتا ہے لیکن ان آنکھوں سے دور نہیں ہو پاتا جو ندا کے پیشہ سے اسے جانتے ہیں۔ حادثہ جس دن ہوتا ہے، اس کی شام کو ہی ایک پختہ عمر کی عورت ایک لڑکے کے ساتھ آتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو زخمی آدمی کی بیوی بتاتی ہے۔ پتی کے غم میں تھوڑے آنسو بہاتی ہے اور پھر اس کی دواؤں کے لئے ندا سے اچھے خاصے روپے لے کر چلی جاتی ہے۔ مریض کئی دنوں تک بیمار رہتا ہے۔ ہر دوسرے تیسرے دن اس کی بیوی آتی تھی اور ندا اسے دیکھتے ہی دوائیوں کا خرچہ اسے دے دیتا تھا۔ پانچ چھ ہزار کو دوائی بنا کر پی جانے کے بعد بھی جب مریض کا مرض اچھا ہونے کے بجائے اور بگڑتا جاتا ہے تو ندا ایک دن خود مریض سے ملنے اس کے گھر جاتا ہے لیکن وہ اپنے پتہ پر نہیں ملتا۔ وہاں اس کے نام سے کوئی اسے جانتا بھی نہیں۔ ندا جب اس کا ذکر اس کی بیوی سے کرتا ہے تو اس کے چیختے چلاتے آنسو بہت سوں کو اس کا ہمدرد بنا دیتے ہیں۔ اب وہ دوائیوں کا خرچہ لینے اکیلی نہیں آتی ہر بار ایک دو نئے ہمدرد بھی اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اور پھر پتا چلتا کہ وہ آدمی ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتا ہے۔ اس کے کریا کرم کے لئے بڑی رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن موت کے بعد بھی وہ آدمی ندا کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ مرنے سے پہلے وہ صرف اپنی بیوی کا شوہر تھا لیکن مرنے کے بعد دو بچوں کا باپ بھی بن جاتا ہے۔ ان دیکھے ان یتیم بچوں کا خرچہ اس کی اپنی دوائیوں سے بھی زیادہ ہوتا ہے..... ایک دو بار کے بعد جب ندا اپنا ہاتھ روکتا ہے تو اسے طرح طرح کی دھمکیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

روز روز کی بڑھتی پریشانیوں میں اسے ایک دن حاجی مستان یاد آتے ہیں۔ حاجی مستان سے وہ ناسک کے ایک مشاعرے میں مل چکا تھا۔ مستان اب پرانے کاموں سے تائب ہو کر اپنی غیر سماجی شہرت سے سماجی فلاح کو عزت بخشتے تھے۔ وہ "مسلم دلت پچھڑ سماج" کے

سربراہ تھے۔ ان کی اسی سماجی حیثیت کا وی پی سنگھ اپنے یوپی کے الیکشن میں فائدہ اٹھا چکے ہیں۔ مستان سے ایک بار اور پہلے بھی وہ مل چکا ہے، دلی کے ایک پروڈیوسر ساگر بھگت کے ساتھ۔ ان کی فلم بے پناہ میں موسیقی خیام کی ہے اور گیت ندا فاضلی کے ہیں فلم بننے کے دوران ساگر بھگت ایک الجھن میں پھنس جاتے ہیں۔ وہ کسی مقامی آدمی سے کسی پراپرٹی کا سودا کرتے ہیں لیکن وہ شخص قیمت کی ادائیگی کے باوجود مکان کا قبضہ نہیں دیتا۔ ندا پہلی بار مستان کے گھر ساگر بھگت کو لے کر جاتا ہے۔

دبلا پتلا ایک دراز قد آدمی، ہوا تیز ہو تو زمین پر پیر جمانا مشکل ہو جائے۔ کئی نیم تاریک کمروں اور کئی چھوٹی بڑی سیڑھیوں کا ایک گھر، ہر پانچ دس قدم پر کمرے ہی کی اونچائی جیسے دو تین کالے بھجنگ دیو۔ ان سے گذر کر دوسرے منزل کی تنگ سی گیلری۔ گیلری میں بچھے لکڑی کے تخت پر پتلے پتلے گھٹنوں میں پر ٹکی، چہرے سے باہر نکلتی دو آنکھیں۔ آہٹیں سن کر آنکھوں میں حرکت ہوتی ہے۔ ان سے ایک بھاری آواز پھوٹتی ہے۔ تشریف رکھئے۔ السلام علیکم......! ندا ساگر بھگت کا تعارف کراتا ہے ساگر بھگت اپنی تکلیف بیان کرتے ہیں۔ مستان گھٹنوں سے آنکھیں ہٹا کر واپس اپنے چہرہ پر لگا لیتے ہیں۔ سنتے ہوئے ساکت چہرہ میں ہلکی سی مسکراہٹ سے چمک پیدا ہوتی ہے۔ تخت کے سامنے رکھی میز کی دراز سے ایک رسید کٹا نکال کر وہ ساگر بھگت کے سامنے کر دیتے ہیں۔ بنا کسی کی طرف دیکھے ان کی آواز بولتی ہے۔ میں سماج کے پیڑت لوگوں کی خدمت کرتا ہوں۔ آپ اس بھلے کام کیلئے جتنا چاہیں اس رسید میں بھر دیں کام ہو جائے گا۔ ساگر بھگت اپنے پین سے دس ہزار کا ایک چیک لکھ کر انہیں دیتے ہیں۔ وہ رسید دیتے ہوئے پہلی سی بے نیازی کے ساتھ کہتے ہیں۔ یہ رسید اسے دکھانا وہ سمجھ جائے گا۔ رخصت ہو کر ابھی ہم چند قدم ہی چلے ہونگے کہ مستان کی آواز واپس بلا لیتی ہے جس پارٹی سے جھگڑا ہے اس کے نام کی بھی دس ہزار کی ایک رسید بنا کر وہ بھگت کو دیتے ہوئے کہتے ہیں۔ یہ رسید اسے دے دینا۔ ساگر بھگت کا وہ کیس جو پچھلے کئی مہینوں سے عدالت میں ایک فائل کی صورت میں ایک میز سے دوسری میز تک سفر کر رہا تھا۔ پندرہ

منٹ سے کم مدت میں طے ہو جاتا ہے۔

حاجی مستان ندا سے فون پر پوری بات سنتے ہیں اور جواباً اپنے دو کیم شحیم کارکنوں کو ندا کے پتے پر بھیج دیتے ہیں۔ وہ تین چار گھنٹوں کے لئے ندا کے گھر کو اپنا آفس بناتے ہیں اور فون پر ہی دو چار نمبر گھما کر آدھے گھنٹے کے وقفے میں دس بارہ آدمی اکٹھا کر لیتے ہیں۔ حاجی مستان کی طرف سے سب کے لئے دوپہر کا کھانا آتا ہے۔ کھاپی کر سارے پر شور خراٹوں سے دوپہر سے شام کرتے ہیں۔ شام ہوتے ہی ان میں سے ایک باہر جاتا ہے اور تھوڑی دیر کے بعد اس عورت کو ساتھ لے آتا ہے جو مسلسل کئی دنوں سے ندا کو بلیک میل کر رہی تھی۔ وہ عورت آتے ہی گھبرا جاتی ہے اور سب کے سامنے کسی مرنے والی کی پتنی اور بعد میں اس کے بچوں کی ماں بننے کے جھوٹ کا اقرار کر کے ہمیشہ کے لئے غائب ہو جاتی ہے۔ اس کے جانے کے بعد مرنے والا بھی زندہ ہو کر ندا کے گھر آتا ہے اور ندا کو اپنے قتل کے جرم سے آزاد کر دیتا ہے۔

اس دن کے بعد ندا کو پتہ لگتا ہے کہ وہ جس علاقہ میں رہتا ہے وہ علاقہ کئی ٹکڑوں میں کئی دادا لوگوں کی جاگیر ہے۔ ندا کے گھر سے ڈانڈا تک جہاں مچھلیاں سکھانے کا ایک بہت بڑا میدان ہے اور یہ حصہ جس کی حکمرانی میں ہے وہ اب ڈانڈا پاڑہ کے چوراہے پر گھنے پیپل کے تلے، حال میں بنے ہنومان مندر کا تلک دھاری پجاری ہے۔ اس پجاری سے ندا کی پہلی ملاقات اپنے گھر میں ہی ہوئی تھی وہ بھی انہی لوگوں میں شامل تھا جنہیں حاجی مستان کے آدمیوں نے فون کر کے بلایا تھا۔ جس جگہ یہ مندر ہے اس وقت یہاں صرف ایک بڑا سا پیپل کا پیڑ تھا۔ پیڑ کے نیچے ایک چھوٹے سے چبوترے کی تعمیر، اور اس پر پون پتر ہنومان کی مورت اسی کی شردھا کا روپ ہے۔ اس مندر کو بنانے، لوگوں کے دلوں میں اس کی عقیدت جگانے اور علاقہ کے دوسرے مندروں کے مقابلہ میں اسے زیادہ مشہور کروانے میں اس نے کافی دولت اور محنت خرچ کی ہے۔

کئی دن پہلے کی بات ہے۔ ایک دن وہ ندا کے گھر آیا اور ایک پانچ سو کا نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ آپ جب سویرے پان کھانے آئیں تو یہ نوٹ ہنومان جی کے چرنوں میں رکھ جائیں۔ ندا

جب اس سے اس کی وجہ پوچھتا ہے تو وہ سر جھکا کے بولتا ہے مجھے پتہ ہے آپ دوسرے دھرم کے ہیں لیکن سب ایک ہی شکتی کے وبھنیہ روپ ہیں۔ آپ کی اور سے بھینٹ پا کر بھگوان آپ سے خوش ہونگے اور آپ کے کام میں ترقی ہوگی۔ جیسا وہ کہتا ہے ندا ویسا ہی کرتا ہے۔ ندا پان کی دوکان سے اسے دیکھتا ہے، وہ مورت کے پاس بیٹھا اسے دیکھ کر مسکراتا ہے۔ ندا خاموشی سے ادھر جاتا ہے اور مورت کے سامنے وہ نوٹ رکھ دیتا ہے۔ ندا کے ساتھ اور دو تین شردھالو مورت پر ویسے ہی نوٹوں کی بھینٹ چڑھاتے ہیں۔ مورت کے بیچ بچ کے پجاری یہ چمتکار دیکھ کر اپنے دل میں اور زیادہ عقیدت جگاتے ہیں۔ رات دن کے چمتکار عقیدتوں کو ہوا دیتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اس مندر میں دوسرے مندروں سے زیادہ بھیڑ جڑنے لگتی ہے۔ مندر کے بغل میں پھولوں کی ایک دکان لگ جاتی ہے۔ دوکان کے سامنے دو گائیں بندھ جاتی ہیں۔ گایوں کے پاس ایک آدمی گھاس کے گٹھے لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ ارد گرد بھکاریوں کی قطار پھیل جاتی ہے۔ دور دور سے عقیدتیں آتی ہیں منتیں مانی جاتی ہیں۔ بھینٹیں چڑھائی جاتی ہیں۔ روشنیاں جگمگائی جاتی ہیں...... اذان اور آرتی کے جھگڑے کے دنوں میں ممبئی کے چھوٹے موٹے فساد بھی اس مندر کے عظمت میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس مندر کی تعمیر کے ابتدائی مصارف رحمت بھائی اٹھاتے ہیں۔ رحمت بھائی کچھ دن پہلے محبوب اسٹوڈیو کے پیچھے ایک ہوٹل کرایہ پر چلاتے تھے اس ہوٹل کا کنٹریکٹ ختم ہو جانے کے بعد فلموں میں لائٹ سپلائی کرنے کا دھندا کرتے ہیں۔ رحمت بھائی سے ندا کی ملاقات مانس مکھر جی نے کرائی تھی۔ اس کی ہوٹل میں ادھار کی چائے پی پی کر مانس اور ندا نے کافی وقت گذارا ہے۔ مانس کے بعد کئی مشترک دوستوں کی طرح وہ بھی کئی مہینوں کے لئے اوجھل رہتے ہیں۔ پھر ایک دن اچانک ندا کے گھر کے نیچے، ہنومان مندر کے پاس مل جاتے ہیں۔ وہ اب کھار ڈانڈا میں ہی مقیم تھے۔ دوسرے دن وہ سویرے ندا سے ملنے آتے ہیں اور اپنے نئے بزنس کے لئے ندا سے مشورہ کرتے ہیں۔ وہ کہیں ایک مندر بنانا چاہتے ہیں۔

رحمت علی بھائی اور مندر۔ ندا کو یہ عجیب لگا لیکن رحمت بھائی کی سوچ مختلف تھی۔ وہ

بتاتے ہیں کہ ہنومان مندر کے موجودہ پجاری پردیپ مہاراج نے جب جگہ تلاش کر کے اس مندر کا پلان بنایا تھا تو انہوں نے اسی شرط پر فائنانس دیا تھا کہ مندر سے جو آمدنی ہو گی اس میں ان کی آدھی حصہ داری ہو گی۔ پردیپ مہاراج شروع میں اس معاہدہ پر راضی تھا، لیکن جیسے ہی مندر چل نکلتا ہے اس کے من میں بے ایمانی آجاتی ہے۔ اور وہ پارٹنر شپ ختم کر دیتا ہے۔

آپ نے جو پیسہ لگایا تھا اس کا کیا ہوا؟ ندا پوچھتا ہے۔

وہ جواب دیتے ہیں پیسہ کہاں جانے والا تھا وہ تو ملنے ہی والا تھا۔ افسوس تو اس بات کا ہے پردیپ کی بے ایمانی نے مجھ سے میرے بچپن کا دوست چھین لیا۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ زندگی شروع کی مل جل کے دکھ سکھ کے دن گذارے تھے، بولتے بولتے ان کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ وہ ندا سے مدد کے خواہش مند ہیں۔ انہیں یوپی کے کسی جانکار برہمن لڑکے کا انتظار تھا۔ اس کو لے کر وہ کہیں مناسب جگہ پر ایک رام مندر بنانا چاہتے تھے اور اپنے دوست کو دکھانا چاہتے تھے کہ وہ اس کے بغیر بھی ممبئی میں کوئی کامیاب دھندا کر سکتا ہے۔

مندروں مسجدوں کی دنیا میں
مجھ کو پہچانتے کہاں ہیں لوگ

روز میں چاند بن کے آتا ہوں
دن میں سورج سا جگمگاتا ہوں

کھنکھناتا ہوں ماں کے گہنوں میں
ہنستا رہتا ہوں چھپ کے بہنوں میں

میں ہی!
مزدور کے پسینے میں
میں ہی

برسات کے مہینے میں

میری تصویر آنکھ کا آنسو

میری تحریر

جسم کا جادو

مندروں مسجدوں کی دنیا میں

مجھ کو پہچانتے نہیں جب لوگ

میں!

زمینوں کو بے ضیاء کرکے

آسمانوں میں لوٹ جاتا ہوں

میں خدا بن کے

قہر ڈھاتا ہوں۔

☆☆☆

کمپاؤنڈ کا پیپل کا درخت اب اپنی عمر کے لحاظ سے کافی بوڑھا ہو چکا ہے۔ اس کا گھناؤ بھی زیادہ ہو گیا ہے، اور جہاں کھڑا ہے وہاں اس کے بدن کا گھیر پھیل کر دیوار توڑ کر باہر نکلنے لگا ہے۔ اس کے اس پھیلاؤ سے بلڈنگ والے فکر مند ہیں۔ دیوار کی مرمت کے لئے پیپل کو کاٹنے کی ضرورت ہے! عمارت کی کمیٹی کی میٹنگ ہوتی ہے۔ اس میں، درخت کو یہاں سے ہٹانے اور دیوار کو پہلی حالت میں لانے کی تجویز پاس کی جاتی ہے۔ میٹنگ میں شامل بلڈنگ کے فلیٹ کے مالکوں میں کسی کو ندا اور اس درخت کی دوستی کا علم نہیں تھا۔ گوالیار کے نیم اور املی کے بعد یہ اس کا تیسرا درخت دوست تھا۔ درختوں کو دوست بنانے کے لئے ان کے ساتھ کچھ اچھے برے دن بتانے پڑتے ہیں۔ جب وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح جان جاتے ہیں تو دور تک ساتھ نبھاتے ہیں۔ نیم اور املی اس کے بچپن کے بزرگ تھے۔ گوالیار چھوڑتے وقت، وہ اسے رخصت کرنے اسٹیشن تک آئے تھے۔ گاڑی کے چلنے تک وہ ریل کی کھڑکی سے لگے اداس کھڑے رہے اور دیر تک ہاتھ ہلاتے رہے۔ ندا انہیں اپنے ساتھ ممبئی لے جانا چاہتا تھا، لیکن اس کے پاس اس وقت ایک ہی ٹکٹ کے روپے تھے۔ اسے مجبوراً اکیلا ممبئی آنا

پڑا۔ وہ سوچتا تھا وہ بھی اس سے دور ہو کر چین سے نہیں رہیں گے۔ اور کسی نہ کسی دن اس سے ملنے ممبئی ضرور آئیں گے۔ لیکن انہیں اپنی زمین، آسمان اور آب و ہوا ندا سے زیادہ عزیز تھی۔ درخت جہاں ہوتے ہیں ہمیشہ کے لئے وہیں کے ہوتے ہیں۔ جس مٹی سے پھوٹتے ہیں اسی میں مٹی بن جاتے ہیں۔ ندا خود ہی ان سے ملنے جاتا رہا۔ یہ سلسلہ ان دونوں درختوں کی زندگی تک جاری رہا۔ وہ اب جہاں تھے وہاں نہیں ہیں۔ ان کی زمینوں پر ایک بڑی سی ہوٹل تعمیر ہو چکی ہے۔ ندا جب بھی ادھر جاتا ہے اسی ہوٹل کے کسی کمرے میں قیام کرتا ہے اور وہ جواب نہیں ہیں، ان کے ہونے کو محسوس کرتا ہے۔

ان پیڑوں کی چڑیاں، طوطے، کبوتر اور کوّے نہ جانے اب کہاں ہوں گے۔ تنکا تنکا جوڑ کے پھر سے کہیں آشیانے بنا رہے ہونگے۔ وہ پہلے کی طرح ایک خاندان کے افراد کی طرح ایک ہی درخت میں ہونگے یا ملکی تقسیم میں ہندو مسلمان بن کر فاصلوں میں بکھر گئے ہونگے۔ کہتے ہیں پرندوں میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اس لئے شاید انہیں اپنے پیڑوں سے بچھڑنے کا دکھ بھی نہیں ہوتا ہوگا۔ لیکن انسان جس ماحول میں رچا بسا ہوتا ہے، اسے آسانی سے نہیں بھولتا۔

ہوٹل کے فرش کی منوں مٹی کے نیچے دبے نیم کی شاخ سے اڑ کر ایک کوّا آکر منڈیر پر بیٹھتا ہے اور اسکول کے لئے تیار ہو کر ناشتہ کرتے پپو کی رکابی میں سے پورا بسکٹ لے کر چلا جاتا ہے۔ پپو حیرت سے اسے دیکھتا ہے اور غصہ میں انگلش میڈیم میں سیکھی ہوئی گالیاں دیتا ہے۔ باسٹرڈ، سن آف بچ...... قمر طلعت صحن میں گیلے بالوں کو تولیے سے جھٹکتی ہوئی مڑتی ہے۔ بد معاش کسے گالیاں دے رہا ہے۔ بہت بگڑ گیا ہے۔ جو منہ میں آتا ہے وہ بول دیتا ہے۔

ہاں بولوں گا اور بولوں گا۔ پپو کہتا ہے۔

بولے گا تو مار بھی کھائے گا۔ سمجھا۔ صاحب کے لاڈ نے بہت بد تمیز کر دیا ہے تجھے۔

ہاں کر دیا ہے۔ تم کون ہوتی ہو۔ پپو غصہ میں بولتا ہے۔

قمر طلعت آگے بڑھ کر سر پر ہلکا سا چپت لگاتی ہے اور مسکراتے ہوئے کہتی ہے۔ میں یہ

ہوتی ہوں..... پپو رونے لگتا ہے۔ پپو کے رونے کی آواز کو سن کر، ہاتھ کی سنگر مشین پر چادر کے کونے سیتی ہوئی، جمیل فاطمہ دالان سے صحن میں آتی ہیں اور اسے گود میں اٹھاتی ہیں۔ کیا بات ہے پپو، کیوں رو رہا ہے۔ پپو بسورتے ہوئے کہتا ہے۔ میرا بسکٹ کوا لے گیا، اسے کچھ نہیں کہا اور مجھے مارا انہوں نے!

کس نے مارا میرے بیٹے کو، جمیل فاطمہ اس کے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھتی ہیں۔

قمر آنٹی نے مارا۔ پپو قمر طلعت کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے۔

جمیل فاطمہ قمر طلعت پر برسنا شروع کر دیتی ہیں۔ مرتضٰی حسن دعا ڈبا ئیوی اندر سے کالی سرج کی شیروانی اور علی گڑھی کٹ پاجامہ پہنے باہر نکلتے ہیں۔ پپو کو روزانہ صبح انگلش میڈیم اسکول میں لے جانے کی ذمہ داری انہیں کی ہے۔ جمیل فاطمہ پپو کو بہلاتی ہیں اور قمر اور کوے کو سزا دینے کے وعدہ کے ساتھ اسے چومتے ہوئے رخصت کرتی ہیں۔ مرتضٰی حسن اپنے بینت کو ہوا میں اٹھاتے ہیں اور منڈیر پر بسکٹ کھاتے کوے کو اڑاتے ہیں۔ کوا آدھا بسکٹ نیچے پھینک کر اڑ جاتا ہے جسے دیکھ کر پپو خوشی سے تالیاں بجاتا ہے۔

پپو محلہ کے ایک قصائی کا پہلوٹی کا بیٹا ہے۔ اس کے باپ کا نام سیدو ہے۔ شادی کے تین برس تک جب یہ پیدا نہیں ہوئے تو باپ کو اپنی بیوی کی زرخیزی پر شک ہونے لگا۔ اس شک نے دوسرے نکاح کی شرعی اجازت کا استعمال کرنا چاہا تو جمیل فاطمہ پپو کی ماں کو کئی مقامی درگاہوں اور دور پاس کے تعویز گنڈے والوں کے پاس لے جانے لگیں۔ ان میں سے کسی درگاہ یا تعویذ کے اثر سے چوتھے سال یہ نمودار ہو گئے۔ اس کی ماں نے اسکے پیدا ہوتے ہی اسے جمیل فاطمہ کے حوالے کر دیا۔ جمیل فاطمہ ہی اس کی سب کچھ تھیں۔ اس کا رشتہ اپنی ماں سے صرف دودھ تک محدود تھا۔ صبح سے رات تک وہ جمیل فاطمہ کے گھر کا کھلونا تھا جس سے وہ اور ان کے پانچ چھوٹے بڑے لڑکے مصطفٰی حسن، مقتدٰی حسن، مجتبٰی حسن، مبتدا حسن، تسلیم فاضلی اور تین لڑکیاں قمر طلعت، سیدہ، اور جاوید باری باری کھیلتے تھے۔ جمیل فاطمہ آٹھ بچوں کی پرورش کے بعد بھی ممتا کا ایک بڑا حصہ اپنے اندر بچائے ہوئے تھیں جس کا

واحد حقدار اب پپو تھا۔ پپو قصائی کے گھر ضرور پیدا ہوا ہے لیکن بڑا ہو کر وہ گوشت کا دھندا نہیں کرے گا یہ جمیل فاطمہ نے طے کر لیا تھا۔ جمیل فاطمہ کے اپنے بچے پبلک اسکولوں میں پڑھتے تھے لیکن پپو کے لئے انہوں نے چرچ کے انگلش میڈیم اسکول کا انتخاب کیا تھا۔ اس کے جوتے، موزے اور یونیفارم وہی خرید کر لاتی تھیں اور ہر روز نماز کے بعد پہلے اسے تیار کر کے اسکول روانہ کرتی تھیں، پھر کسی دوسرے کام کو ہاتھ لگاتی تھیں۔ پپو کا اپنے گھر جانا قریب قریب بند ہو گیا تھا۔ اسکے دوسرے بہن بھائی، اسے صاحبہ کا ہی بیٹا سمجھتے تھے اور اسی طرح اس کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اس کی ماں اپنی برادری کی کسی خوشی یا غم کی تقریب میں اسے لے جانے کے لئے آزاد نہیں تھی، اس کے لئے جمیل فاطمہ کی اجازت کی ضرورت ہوتی تھی۔ جمیل فاطمہ اس اجازت میں کافی عقل سے کام لیتی تھیں۔ ان کا خیال ہے جس گھر میں وہ پیدا ہوا ہے، اس گھر کے یا ایسے ہی گھروں کے دوسرے افراد سے زیادہ میل جول پپو کے ادب و آداب پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ پپو کا باپ سیدو بھی جمیل فاطمہ کے طبقاتی رویہ کو قبول کر کے پپو کے ساتھ نہایت احترام سے پیش آتا تھا۔ پپو کا اس کی گوشت کی دوکان پر جانا منع تھا لیکن آتے جاتے کبھی اتفاق سے وہ اپنے کسی بھائی یا بہن کو دیکھ کر وہاں رک جاتا تو سیدو فوراً بول پڑتا "بڑے صاحب تم یہاں کیسے۔ تمہاری صاحبہ نے دیکھ لیا تو آفت آجائے گی۔ بھیا میں قصائی ہوں اور تم صاحبہ اور بابو جی کے بیٹے ہو۔ یہاں نہیں آیا کرو بڑے صاحب"

۶۴-۱۹۶۳ء میں پپو آٹھ سال کا ہو جاتا ہے۔ گورا چٹا، انگریزی بولتا ہوا۔ جمیل فاطمہ کا نیا بیٹا۔ وہ شام کو پابندی سے اسے پڑھاتی تھیں۔ اسے اچھی طرح پڑھانے کے لئے، انہوں نے ماسٹر ریاض جیوری سے اپنی بھولی ہوئی انگلش کو دوبارہ تازہ کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ پپو کا چرچ کے اسکول میں آخری سال تھا اس کے بعد اسے مغزی کے بڑے اسکول میں داخل کرانا تھا۔ اس کے بعد اسے کالج جانا تھا، کالج کے بعد میڈیکل میں بھرتی ہونا تھا۔ اس کے بعد......!

محلہ کی ایک بازار کی طرف کھلتی گلی کے نکڑ پر دوپٹوں اور ساڑیوں کو نئے نئے رنگوں میں سجانے والے ایک رنگ ریز کا دن دہاڑے قتل ہوتا ہے۔ اِدھر اُدھر کئی گھر لٹتے ہیں۔

چھوٹے بڑے گھر علاقوں کے بڑے بڑے گھروں میں اکٹھا ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ پپو کی ماں جمیل فاطمہ کی اجازت کے بغیر اپنا گھر چھوڑ کر شہر کے کسی محفوظ علاقہ میں اپنے دوسرے بچوں کیساتھ پپو کو بھی لے جاتی ہے اور جمیل فاطمہ اپنے لڑکے لڑکیوں کے ساتھ کراچی رخصت ہو جاتی ہیں...... کراچی جاکر بھی وہ پپو سے دور نہیں ہوتیں۔ شروع میں وہ اسے اپنے پاس بلانے کی کوشش کرتی ہیں، جب یہ ممکن نہیں ہوتا تو وہ پابندی سے اس کی پرورش اور تعلیم کے تعلق سے اپنی ہدایتیں پپو کے ماں باپ کو لکھ کر بھیجتی رہتی ہیں۔ لیکن ان پر عمل کرنا ان کی حیثیت سے بہت زیادہ تھا۔ ایک سال بعد ہی پپو اسکول چھوڑ کر گھر بیٹھ جاتا ہے اور پھر باپ کے ساتھ، اسکے کاروبار میں ہاتھ بٹانے لگتا ہے۔

پپو اب بڑا ہو گیا ہے۔ وہ اب گوالیار میں گوشت کی ایک مشہور دوکان کا مالک ہے۔ اسے اب جب بھی جمیل فاطمہ کی یاد زیادہ ستاتی ہے تو بنا اطلاع کے وہ ندا کے پاس ممبئی آجاتا ہے۔ اور دو چار دن یوں ہی گذار کے واپس چلا جاتا ہے۔ ہندوستان میں ندا کے قریبی رشتہ میں، ندا کی ماں کے اس بیٹے کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ پپو کے دو بیٹے ہیں۔ ندا چھوٹے بیٹے کو اپنے ساتھ ممبئی میں رکھنا چاہتا ہے۔ مالتی بھی اس فیصلہ سے متفق ہے۔ ندا جمیل فاطمہ کے ادھورے خواب کو اس بچہ میں پورا کرنے کا آرزومند ہے لیکن اس کی ماں بچے کو اپنے سے دور کرنے کے لئے راضی نہیں ہوتی۔ پپو ایک بار اسے چھوڑنے کے ارادہ سے یہاں لاتا بھی ہے لیکن پپو کے رخصت ہوتے وقت، وہ ہنستے ہنستے اچانک رونے لگتا ہے اور مجبوراً باپ کو اسے واپس لے جانا پڑتا ہے۔

دیکھا ہوا سا کچھ ہے تو سوچا ہوا سا کچھ
ہر وقت میرے ساتھ ہے الجھا ہوا سا کچھ
ہوتا ہے یوں بھی راستہ کھلتا نہیں کہیں
جنگل سا پھیل جاتا ہے کھویا ہوا سا کچھ
ساحل کی گیلی ریت پر بچوں کے کھیل سا

ہر وقت مجھ میں بستا، بکھرتا ہوا سا کچھ
فرصت نے آج گھر کو سجایا کچھ اس طرح
ہر شے سے مسکراتا ہے روتا ہوا سا کچھ
دھندلی سی ایک یاد کسی قبر کا دیا
اور میرے آس پاس چمکتا ہوا سا کچھ

ندا کے احتجاج کے باوجود کمپاؤنڈ کا پیپل کا درخت کٹ چکا ہے۔ گوالیار کے نیم اور املی، اپنی زمین چھوڑ کر کہیں اور نہیں جانا چاہتے تھے۔ اس لئے ہوٹل کی کلہاڑی کا شکار ہوئے اور اسے یہ جہاں ہے وہاں کے بجائے کہیں اور کیوں نہیں ہے، اس لئے سزا کا مستحق ٹھہرایا گیا۔ اس پیڑ کے کٹنے سے ندا کی صبح کا وہ "آدھا گھنٹہ" سونا ہو گیا ہے جو روزانہ اسکے نیچے کھڑا ہو کر مختلف سمتوں میں سفر کرتا تھا۔ ندا کے کئی اہم فیصلوں میں اس کے مشوروں کا بھی عمل دخل رہا ہے۔ وہ ندا کی ان باتوں کا بھی رازدار تھا جنہیں وہ قریب سے قریب دوست کو بھی سنانے سے ڈرتا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ندا کے اپنے آپ سے تعلقات شروع سے کشیدہ ہیں۔

وہ اپنے ساتھ رہتا ضرور ہے لیکن اپنے آپ کو زیادہ پسند نہیں کرتا۔ اسی لئے اپنی تنہائی کو وہ ہر وقت غیر ضروری آوازوں سے آباد رکھتا ہے۔ اس کی ایک عجیب الجھن ہے۔ وہ جیسا ہے اس سے مختلف اپنے آپ کو دیکھنا اور دکھانا چاہتا ہے اور کیونکہ ایسا ممکن نہیں ہے اس لئے وہ اپنے آپ سے خفا ہے۔ اس خفگی نے اسے برسوں سے آئینہ سے دور کر رکھا ہے۔ اس درخت کو یہ بھی علم تھا وہ جس کے ساتھ جب تک رہتا ہے اس کے ساتھ نہیں ہوتا۔ وہ جہاں ہوتا ہے وہاں نہیں ہوتا، جہاں نہیں ہوتا وہاں ہوتا ہے۔ اس کی پسند و ناپسند بھی اسی لحاظ سے ایک دوسرے سے الجھی ہوئی ہیں۔ وہ جسے پسند کرتا ہے اسے ناپسند کرتا ہے اور جو اسے ناپسند ہے اسے پسند کرنے کی وجہ تلاش کرتا رہتا ہے۔ پائی ہوئی چیز کو کھونا اور کھو کر اسے پھر تلاش کرنا اس کی ہمیشہ کی عادت ہے۔

اس پیڑ کے نیچے تیس منٹ کے چھوٹے سے وقفہ میں وہ ایک ساتھ کئی سمتوں

میں ہزاروں میل کا فاصلہ طے کرتا تھا۔ ان فاصلوں میں حال، ماضی اور مستقبل ساتھ ساتھ سفر کرتے تھے۔ کبھی وہ عراق میں کسی دم توڑتے فوجی کے ساتھ دم توڑ رہا ہوتا تھا کبھی نیویارک کے ایک کسی Gay کلب میں عورت کو عورت اور مرد کو مرد سے بغل گیر ہوتے دیکھ رہا ہوتا تھا۔ کبھی رتھ یاترا کی پھیلائی ہوئی دہشت میں مایوس اذانوں کو سن رہا ہوتا تھا، کبھی بنگلہ دیش کے سیلاب میں ٹوٹتے پھوٹتے مکانوں اور دوکانوں کو دیکھ رہا ہوتا تھا۔ کبھی کوئی لڑکی سڑک پر سامنے سے آتی اور گذر جاتی لیکن ندا اور پیپل کچھ دیر پھر بھی اسے اپنے سے دور نہیں جانے دیتے تھے۔ اس کے بارے میں دیر تک باتیں کرتے رہتے تھے۔

ندا سوچتا ہے یہ پیڑ جہاں تھا وہاں ہی کیوں تھا؟ کہیں اور بھی ہو سکتا تھا۔ وہ اپنے سوال کا خود جواب دیتا ہے، جواب سے پھر سوال ابھرتا ہے۔ مگر یہ پیڑ کے اختیار میں کہاں؟ کوئی کہاں پیدا ہونا چاہتا ہے، یہ پیدا ہونے والے کی منشاء کے بجائے پیدا کرنے والے کے اختیار میں ہے۔ پیدائش کی طرح موت پر بھی اسی کا قبضہ ہے۔ اگر اس کا اختیار ہوتا تو وہ بھی بلڈنگ کی دیوار کے پاس اُگنے کے بجائے کسی مندر کے قریب کی زمین کا انتخاب کرتا اور عقیدت مندوں کی عقیدت کی علامت بنتا۔ جیسے رحمت علی بھائی کے پیسوں سے بنے ہوئے ہنومان مندر پر سایہ کرتا پیپل کا چھتنار درخت!

ندا کی گیلری کے سامنے کا مولسری کا پیڑ بھی گرایا جا چکا ہے۔ مچھیروں کے دیوتا وٹھل کے مندر میں برسوں پھول چڑھانے کے باوجود وہ دیوتا کو خوش نہیں کر سکا۔ جب مندر کے ٹرسٹ کے ممبروں نے مندر کے احاطے کو پھیلانے اور اس پر دو منزلیں اور چڑھانے کا پلان بنایا تو بھگوان کی اجازت سے پہلے اسے ہی کاٹ گرایا۔ اس درخت کے کٹ جانے سے، ندا کے کچن کی کھڑکی پر ٹھیک نو بجے آنے والے اس کے چار کوّے دوست بھی کئی دنوں سے لاپتہ ہیں۔

ممبئی سے آہستہ آہستہ درخت، پرندے، چوپائے اور گھروں کے آنگن اور کھیل کے میدان رخصت ہوتے جا رہے ہیں۔ سمندر کو بھی مسلسل ڈرا دھمکا کر اس کی زمین کو ہتھیایا

جارہاہے اور اس پر عمارتوں کا جنگل بسایا جارہا ہے۔ الگ الگ طرح کے پرانے بنگلے ایک جیسے چہروں کے فلیٹوں میں تبدیل ہو رہے ہیں جن کی پہچان ناموں کے بجائے نمبروں سے کی جاتی ہے۔ ہانگ کانگ کے چین میں شامل ہونے کی بات چل رہی ہے۔ وہاں بسے تجارت پیشہ ہندوستانیوں کو چین کی اشتراکی پالیسیوں سے خطرہ ہے۔ اس خطرے نے ممبئی میں زمین کے بھاؤ ضرورت سے زیادہ بڑھا دیئے ہیں۔ گورنمنٹ اور بلڈرس کے خفیہ سمجھوتوں نے ممبئی کے رقبہ کو دور دور تک پھیلا دیا ہے۔ سنیما گھروں کو توڑ کر بزنس کمپلیکسوں میں تبدیل کیا جارہا ہے۔ غیر ملکی سرمائے نے، ہر بڑے شہر کو بازار بنا دیا ہے۔ آدمی کے پیروں میں پہیے اور سروں پر پنکھے لگ چکے ہیں۔ وہ بنا ارادہ کے چل رہا ہے، بنا مرضی کے اڑ رہا ہے۔ شہرتیں ذہانتوں سے دور ہو کر اشتہاروں میں جاگ رہی ہیں۔ سیاستیں دیش بھکتی سے الگ ہو کر دولتوں کے پیچھے بھاگ رہی ہیں۔

تجارتی کلچر نے مذہبوں کو مقدس کتابوں اور عمارتوں سے نکال کر دوکانوں کی اشیاء میں ڈھال دیا ہے۔ رامائن کے رام اور گیتا کے کرشن ٹی وی سیریل میں اداکاری دکھا رہے ہیں۔ قرآنی آیات کے پاسبان خدا اور رسول کے ناموں سے اپنا اپنا بیوپار سجا رہے ہیں، محمدیہ رستوراں الحمد جنرل اسٹور۔ مٹھی بھر لوگ بے شمار لوگوں کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ عوامی بے چینیاں دن بہ دن بڑھتی جارہی ہیں۔ جن کے ڈر سے ہر شعبہ کار ہنما اپنے ارد گرد کئی کئی محافظوں کو اپنے ساتھ رکھنے پر مجبور ہے۔

امیری اور بہت امیری اور غریبی اور بہت غریبی کے روز بہ روز بڑھتے فاصلوں نے ممبئی کی فضاؤں کو خوف سے بھر دیا ہے۔ یہ خوف ممبئی کا کردار بنتا جارہا ہے۔ ندا جب سے ممبئی میں آیا ہے، تب سے شاخوں میں کھلنے والے پھولوں کی گنتی مسلسل کم ہوتی جارہی ہے اور ان کی نقل کے پلاسٹک کے رنگ برنگے پھولوں سے کمرے زیادہ سجائے جارہے ہیں!

ہوا کے تیز جھونکے سے کٹے ہوئے مولسری کے درخت سے بہت سارے پھول، مندر کی طرف کھلنے والی ندا کی گیلری میں آکر گرتے ہیں۔ ندا کی چھوٹی بہن کی بڑی بڑی غلافی

آنکھوں اور گلابی ریشم جیسی رنگت والی پانچ سال کی بیٹی اپنی عمر کی پہلی نماز پڑھ رہی ہے۔ اس کی ماں نماز کی آیتیں دہرا رہی ہے اور وہ آیتوں کے مطابق رکوع اور سجدہ کے لئے کبھی گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کے جھکتی ہے، کبھی پیشانی سے جاء نماز کو چھوتی ہے۔ عربی الفاظ کی قرأت میں اس کے ہاتھوں کی کانچ کی بہت ساری چوڑیوں اور پیروں کی پازیب کے گھنگروؤں کی کھنک بھی شامل ہو گئی ہے۔ وہ دائیں طرف سلام پھیرتے ہوئے گیلری کی طرف دیکھتی ہے۔ شاید نماز پڑھتے ہوئے اس نے پھولوں کی خاموش آہٹوں کو سن لیا تھا۔ ماں کے ٹوکنے پر وہ گیلری سے نظر ہٹا کر سلام کے لئے جلدی جلدی دائیں بائیں منہ پھیرتی ہے اور پھر اٹھ کر بھاگتی ہوئی گیلری میں پہونچ جاتی ہے۔ اس کی ماں جاوید مسرت، جاء نماز کا کونا موڑتی ہے۔ آج ماریہ کی پانچویں سالگرہ کا دن ہے! وہ اپنے چھوٹے، کھنکتے ہاتھوں سے گیلری میں بکھرے ہوئے گلابی ڈنٹھلوں کے برف جیسے مولسری کے پھولوں کو ایک جگہ سمیٹ کر مولسری کے پیڑ سے باتیں کرنے لگتی ہے!

تم بہت اچھے ہو۔ تمہارے پھول بھی بہت اچھے ہیں۔ میں جانتی ہوں تمہیں پتہ ہے تم نے میری سالگرہ پر جو پھول دیئے ہیں، ان سب کو میں کراچی لے جاؤنگی...... ماریہ کی ماں دوپٹے سے اپنی ہنسی روکتے ہوئے اس سے پوچھتی ہے!

"کس سے باتیں کر رہی ہو بڑی بی؟"

"ان سے۔ وہ سامنے سینکڑوں پھولوں سے ہنستے ہوئے پیڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیتی ہے۔ ماموں نے میری سالگرہ پر ابھی تک کچھ نہیں دیا۔ انہوں نے تو اتنے سارے پھول بھیجے ہیں میرے لئے۔"

اچھاجی! میرے بھائی کا مقابلہ تم اس درخت سے کرتی ہو۔ یہ تمہارا کون لگتا ہے......

تم انہیں بھائی بنالو، تو یہ بھی ماموں ہو جائیں گے۔ ماریہ معصومی سے کہتی ہے۔

"نوج، میں اس پیڑ کو بھائی کیوں بناؤں۔ اللہ نے مجھے پانچ بھائی دیئے ہیں...... جاوید اسے چڑاتے ہوئے کہتی ہے...... تم نہیں بناؤ، میں تو انہیں ماموں بنا چکی ہوں۔ اب میرے

دو ماموں ہیں۔ ایک شاعر ماموں، ایک پھولوں والے ماموں اس رشتہ کا علم شاید مولسری کے درخت کو بھی ہو چکا تھا۔ ماریہ جب تک ندا کے گھر میں رہی وہ ہر صبح بلاناغہ اس کے لئے پھول بھیجتا رہا۔ اور ماریہ بھی اس سے اپنی، اپنی سہیلیوں اور کراچی میں چھوڑی ہوئی گڑیوں کی باتیں کرتی رہی۔ دو ہفتوں کے بعد ماریہ اپنی ماں کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ جاتے وقت وہ پیڑ کو سلام کرتی ہے اور گیلری میں بچھے ہوئے اس کے پھولوں کو چن کر اپنے ساتھ لے جاتی ہے......

ندا کے ڈرائنگ روم میں رکھی ماریہ اپنی تصویر سے نکل کر باہر آتی ہے وہ اب کافی بڑی ہو چکی ہے۔ تصویر میں وہ پانچ سال کی تھی۔ کراچی میں گلشن اقبال کے ایک فلیٹ میں وہ سولہواں سال پورا کر کے سترہویں سال سے گذر رہی ہے...... ندا اسے اس کے پھولوں والے ماموں کے سانحہ پر تعزیت کا خط لکھتا ہے۔ ہر خط کی طرح اس خط کا جواب بھی وہ فوراً لکھ کر بھیجتی ہے۔ اس جواب میں ہندوپاک کے تنازعات کی خبریں جو پاکستان کے اخباروں میں بڑھا چڑھا کر چھپتی ہیں، ان کے تعلق سے خوف وہراس کا اظہار زیادہ ہوتا ہے لیکن ہندوستان کے ایک مندر کے قریب جو اس کا ایک پھولوں والا ماموں تھا، اور جواب کٹ چکا ہے اس کے بارے میں کچھ نہیں لکھتی، وہ اب بڑی ہو گئی ہے عمر کے ساتھ اس کے رشتوں کی نوعیتیں بھی بدل گئی تھیں۔ وہ اب پھولوں سے باتیں نہیں کرتی، انہیں اپنے بالوں میں لگاتی ہے۔

چاک کر کے میرے سینے کا کنول
اڑ گئے
پیڑ سمندر آگاش
میری بے نور صداؤں کے اسیر
اب کوئی دیو
نہ پتھر

نہ چراغ
بند کمرہ ہیں نگاہیں میری
اب نہ بادل نہ ہوائیں میری
کھو گئیں چاروں دشائیں میری
بجھ گیا درد کے ماتھے پہ چمکتا تارا
اب نہ مہکار
نہ دستار
نہ قصہ
نہ خمار
وقت کی آنکھ ہے خالی، کوئی میزان نہیں
اب کسی رنگ کی پہچان نہیں

جب زندگی کسی کو زیادہ بھگاتی ہے تو اس میں وقت کے احساس کو زائل کر دیتی ہے۔ بھاگنے والا، جب بھاگتے بھاگتے، تھک کر کہیں بیٹھتا ہے اور مڑ کر پیچھے دیکھتا ہے تو اسے حیرت ہوتی ہے کہ اتنی جلدی اتنا سارا وقت کیسے گذر گیا۔ پھر وہ اپنی آنکھوں پر چشمہ درست کر کے غور سے دیکھتا ہے تو اسے سب کچھ بدلا بدلا نظر آتا ہے۔ یہ سب کچھ بدلا ہوا نہ ندا کو پہچانتا ہے نہ وہ اسے جانتا ہے وہ اپنی ہی دنیا میں اجنبی بن جاتا ہے۔

کچھ اس حقیقت کو قبول کر لیتے ہیں، لیکن انہیں کے ساتھ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو گذرے ہوئے وقت کو بندریا کے مرے ہوئے بچے کی طرح خود سے الگ نہیں کر پاتے اور ہر نئی خوبی میں کوئی نہ کوئی خامی تلاش کرتے رہتے ہیں۔ آدمی کی پسند و ناپسند پر، اسکے عہد کے مزاج کی چھاپ ہوتی ہے۔ اس بات کو ٹیکسی یا آٹو رکشا کے ٹیپ ریکارڈوں میں بجنے والے فلمی گانوں کے انتخاب میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ہر ڈرائیور کا انتخاب اس کی عمر کے حساب سے طے ہوتا ہے۔ کوئی سہگل کا فین ہوتا ہے، کوئی طلعت محمود کی آواز میں جو لرزہ ہے اسے

سراہتا ہے۔ کوئی محمد رفیع کو سنتا سناتا ہے، کوئی ان سب کو چھوڑ کر صرف تیز ردم کے نئی آوازوں کے گانے جاتا ہے۔

میڈیکل سائنس کی ترقی نے ایک ہی عہد میں کئی نسلوں کو ایک دوسرے کا ہم سفر بنادیا ہے۔ حالات کی تیز رفتاری نے ایک دنیا کو کئی دنیاؤں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ہر دنیا کا جغرافیہ اور آب وہوا عمروں کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہے پہلے کی طرح سچائیاں اجتماعی نہیں ہیں انفرادی ہو گئی ہیں۔ مزاجوں کے تضادات زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں ہیں۔

ندا کا ایک گانا بھپیؔ لہری کے ساتھ ریکارڈ ہوتا ہے۔ وہ گھر میں گانا سنتا ہے تو اسے اس کا میوزک زیادہ پر شور محسوس ہوتا ہے، اسے جس قسم کا دھیما اور میٹھے سروں کا سنگیت پسند ہے یہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ اسے یہ گیت اچھا نہیں لگتا۔ لیکن اسی فاسٹ میوزک پر پاس بیٹھا ہوا پڑوس کا ایک پانچ سال کا سندھی لڑکا آپ ہی آپ جھوم جھوم کر تالیاں بجاتا ہے۔ اور جب گانا ختم ہو جاتا ہے تو اسے پھر سے سننے کی ضد کرتا ہے۔ ندا اپنے ٹیپ ریکارڈ سے کیسیٹ نکال کر اس بچے کے حوالے کر دیتا ہے جسے وہ گھر لے جا کر کئی بار بجاتا ہے اور ندا کے بوڑھے ہوتے ٹیسٹ کا مذاق اڑاتا ہے۔

ندا کو بچوں سے بہت لگاؤ ہے۔ بچے بھی اس کے بہت جلدی دوست بن جاتے ہیں۔ وہ اب تک جہاں جہاں رہا تھا ان بلڈنگوں کے اکثر بچوں سے اس کی دوستی رہی ہے۔ بچے بڑے ہو کر اسے بھولتے جاتے ہیں لیکن ان کے ساتھ جو وقت گذرتا ہے وہ ندا کے ذہن میں محفوظ رہتا ہے۔ یہ سندھی لڑکا ندا کے گھر کے سامنے رہتا ہے۔ اس کا گھر کا نام رمیش ہے لیکن ندا اسے پانڈو پکارتا ہے۔ گول مٹول یہ بچہ ندا سے اتنی بار پانڈو سنتا ہے کہ اپنے اصلی نام کو بھول جاتا ہے۔ ایک بار اس کی ماں شکایتاً کہتی بھی ہے،

"آپ نے جب سے اسے پانڈو کہنا شروع کیا ہے یہ اپنے نام سے جواب ہی نہیں دیتا"

پانڈو ندا سے بہت ہل گیا ہے۔ اس کا زیادہ وقت ندا کے گھر میں گذرتا ہے۔ وہ جب بھی اپنے گھر سے ندا کے یہاں آتا ہے، ندا اسے پاس بلا کر کڑاک کہہ کے اس کی چڈی

اتار دیتا ہے۔ پہلی بار جب اس کے ساتھ ایسا ہوا تھا تو وہ بسور کے رونے لگا تھا۔ لیکن ٹافی ملتے ہی وہ حادثہ کو بھول جاتا ہے۔ پھر جب جب اس کے ساتھ اس طرح 'کڑاک' ہوتا ہے تو وہ مسکراتے ہوئے ٹافی کے لئے ہاتھ پھیلا دیتا۔ کئی مہینوں اس طرح ٹافیاں لے کر وہ تھوڑا سمجھدار ہو جاتا ہے۔ ایک دن وہ آتا ہے تو دروازے سے ہی اپنے ہاتھ میں چھپی ایک ٹافی دکھاتے ہوئے کہتا ہے۔ انکل آج میں نہیں تم کڑاک ہو گے۔ اس کے اچانک اس جملے سے ندا کو لگتا ہے رمیش بڑا ہو گیا ہے۔ بچے دیکھتے دیکھتے اونچے پورے ہو جاتے ہیں۔ بچے بڑے ہوتے جاتے ہیں، اور اسی حساب سے انکے ساتھ کھیلنے والے چھوٹے ہوتے جاتے ہیں۔ عمر کے ساتھ آدمی کے تحیر اور تخیل میں ہوش مندی شامل ہوتی جاتی ہے کچھ اس ہوش مندی کے ساتھ بچپن کے تحیر اور تخیل کو بھی شاداب رکھتے ہیں۔ میرؔ و فراقؔ ادب میں اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ میرؔ کے پلکیں جھپکاتے لہجے اور فراقؔ کے احساس جمال میں صدیوں بوڑھی دنیا، اپنے نئے پن کو نہیں کھوتی، فراقؔ کا شعر ہے۔

ہزار بار زمانہ ادھر سے گذرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگذر پھر بھی

☆☆☆

ممبئی کے ایک علاقہ فورٹ کی ایک برساتی رات میں ایک بھیگے ہوئے پیڑ کی اوٹ سے ایک نوجوان نکل کر ندا سے کوئی پتہ پوچھتا ہے۔ وہ انکل کہہ کر ندا کو مخاطب کرتا ہے تو اچانک اسے خیال آتا ہے نہ جانے کتنے برسوں سے وہ اپنے لئے لاپتہ تھا۔ اس ایک لمحہ میں بیس سال کا طویل عرصہ گذر جاتا ہے۔ اس ایک لمحہ میں غائب بیس سال جینے کے بعد جب وہ دوسرے حاضر لمحہ میں واپس آتا ہے تو اسے لگتا ہے موت جو پہلے اس سے کوسوں دور تھی اب اس کی آہٹوں سے راستوں کے خاموش گوشے بھر گئے ہیں۔ چلتے راستوں میں جب بھی سناٹے آتے ہیں ان کی گونج سنائی دیتی ہے۔ اس وقت وہ ایسے ہی سناٹے سے گذر رہا ہوتا ہے۔ اسے باری باری وہ دوست یاد آتے ہیں جو وقت کے بہاؤ سے کٹ کر یادوں کے فریموں میں تصویریں بن چکے ہیں۔

حسن نعیم محفل میں اپنی نئی غزل سنا رہے ہیں، غزل کا ہر مصرع ہونٹوں سے باہر آنے سے پہلے اعلان کرتا ہے، پہلا خدائے غزل میر تقی میرؔ، دوسرا بابائے غزل مرزا غالبؔ تیسرا دانائے غزل حسن نعیم۔ باقی سب عین، نون میم، ان کی وجہ سے ممبئی کی ادبی محفلوں میں

نوک جھونک کی تہذیب زندہ ہے انہیں اپنی غزل سے دیوانگی کی حد تک عشق ہے۔ ندا کی ان سے پہلی ملاقات ممبئی میں ہوئی تھی، اس وقت وہ فارن سروس میں تھے اور امریکہ سے ہندوستان آئے تھے۔ ان کی غزل کی داد دینے والوں میں ان دنوں ظ۔ انصاری اور باقر مہدی کے ساتھ مجروح اور کیفی بھی شامل تھے۔ اس داد سے مطمئن ہو کر وہ دلی میں اپنا گھر بار چھوڑ کر ممبئی میں ہمیشہ کے لئے بس گئے تو ان کو سراہنے والوں کی گنتی بتدریج کم ہوتی گئی۔ لیکن اس کے باوجود نہ انہیں اپنی تنہائی کا غم ہوا نہ اپنی غزل پر ان کا اعتماد کم ہوا۔

کچھ اصولوں کا نشہ تھا کچھ مقدس خواب تھے
ہر زمانہ میں شہادت کے یہی اسباب تھے

ندا جب بھی دہلی جاتا ہے اس کے پروگرام میں کمار پاشی سے بھی ایک ملاقات شامل ہوتی تھی۔ پاشی سے اس کی شناسائی گوالیار کے دنوں سے تھی۔ اس نے ندا کی ابتدائی شاعری پر ایک مختصر سا مضمون لکھا تھا۔ جو تخلیق میں چھپا تھا۔ وہ ندا سے ملنے گوالیار آیا تھا۔ اسے کسی ہوٹل میں ٹھہرانے اور گوالیار کی مشہور دیسی شراب "آشا" پلانے کا انتظام ندا اپنے ایک مقامی دوست سرفراز سے کرواتا ہے۔ سرفراز کو شعر کہنا نہیں آتا تھا لیکن شاعر بننے کا شوق تھا۔ وہ روز ندا سے اپنے لئے شعر کہلواتا تھا اور مقامی ہندی اخباروں میں چھپواتا تھا۔ اس کے صلہ میں وہ ندا کی پان سگریٹ سے تواضع کرتا رہتا تھا۔ شام کو کمار پاشی، ندا اور سرفراز نشہ کی ترنگ میں نئی سڑک سے گذرتے ہیں۔ ندا اور پاشی باتوں میں مصروف تھے کہ اچانک اک زور کی آواز ہوتی ہے۔ ندا مڑ کے دیکھتا ہے سرفراز کا چہرہ سر سے نکلتے تازہ خون سے تربتر تھا اور اس کے پاس ایک لنگی بنیان پہنے دبلا پتلا ادھیڑ آدمی کھڑا تھا۔ یہ سرفراز کا باپ تھا جو موچی محلہ میں درزی کا کام کرتا تھا۔ سرفراز کمار پاشی کی مہمان نوازی کی خاطر باپ کی غیر موجودگی میں سلائی کی مشین کسی ساہوکار کے یہاں گروی رکھ کر سو روپے کا بندوبست کرتا ہے اور لکڑی کی کھڑاؤں سے لہولہان ہوتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد وہ کئی دن کے لئے غائب ہو جاتا ہے۔

دہلی کے ارون ہاسپٹل کے ایک گورنمنٹ کوارٹر پر ندا دستک دیتا ہے۔ پاشی گھر

میں نہیں تھا۔ اس کی اردھانگنی چندر کانتا ندا کو پہچان کر ضد کر کے اندر بلا لیتی ہے اور عام بیویوں کی طرح گھر کے تعلق سے پاشی کی غیر ذمہ داریوں کی شکایت کرتی ہے۔

بھائی صاحب! لڑکیاں بڑی ہوتی جا رہی ہیں، مگر انہیں کوئی فکر ہی نہیں ہے۔ وہ شکایتاً کہتی ہے۔ چائے پیتے ہوئے ندا جواباً کہتا ہے! "بھابھی انہیں غیر ذمہ داریوں کی وجہ سے ہی شاید وہ صاحب اسلوب جدید شاعر ہے۔

مگر ان کی اس شاعری سے پریوار کا کتنا نقصان ہوتا ہے۔ وہ طنزاً زور دے کر بولتی ہے۔

آپ کو پریوار کے نقصان کی پڑی ہے۔ اس شاعری سے اُردو کا کتنا نقصان ہو رہا ہے، اس کے بارے میں بھی سوچیئے۔ ندا کے مذاق پر وہ غصہ بھول کر ہنسنے لگتی ہے۔ پاشی گھر میں داخل ہوتے ہوئے ندا کا جملہ سن چکا ہے۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولتا ہے۔ حضور مذاق میں چاہے کچھ کہہ لو، جب سنجیدگی سے سوچو گے تو یہی بولو گے۔

ہر صنفِ سخن کو پاشی جی اک طرز نئی دی ہے ہم نے......!

ہر اک سے الگ، ہر اک سے جدا ہر شعر میں عکس اپنا ہی تو ہے

دوسروں کے لئے وحید اختر کے منہ پر ہمیشہ ایک ہی لفظ رہتا ہے۔ جاہل۔ جب دوسرا لفظ استعمال کرتے ہیں تو احمق کہتے ہیں۔ ان دو لفظوں سے ان کے بیشتر بزرگ اور معاصرین نوازے جا چکے ہیں۔ اچھے شاعر، اچھے نقاد۔ ایران سے ہندوستان آتے ہوئے جہاز کے حادثہ میں بیوی کی موت نے زندگی سے ان کے رشتے کی نوعیت بدل دی۔ اس حادثہ کے عوض امریکہ سے حاصل ہوئی دولت، ان کے رہن سہن میں دولتمندانہ وقار تو پیدا کر دیتی ہے لیکن تنہائی کو سلیقے سے برتنے کا شعور چھین لیتی ہے۔ رات دن کی مسلسل شراب سے گردوں کے عارضہ کا شکار ہوتے ہیں اور گھر پر ہی ڈائی لیسز کی مشین لگا کر اپنا علاج خود کرتے ہیں ان کی بیماری کی خبر سن کر ندا دہلی سے انہیں دیکھنے علی گڑھ جاتا ہے۔ وہ اپنے نئے بڑے سے گھر کے ایک کمرے میں شراب کا گلاس سامنے رکھے اپنی بیماری کو بہلاتے نظر آتے ہیں اور کچھ دن کے بعد بیوی کے تعاقب میں وقت سے پہلے دنیا چھوڑ جاتے ہیں۔

ٹھہری ہے تو اک چہرہ پر ٹھہری رہی برسوں
بھٹکی ہے تو یہ آنکھ بھٹکتی ہی رہی ہے

مخدوم کے بعد حیدر آباد میں جدید لب ولہجہ کو کلاسیکی نظم وضبط کے ساتھ اپنانے والوں میں شاذ تمکنت اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ نمایاں ہیں، خوش لباس، خوش مزاج۔ اختر شیرانی، فراق، فیض اور اختر الایمان کے اثرات سے انہوں نے اپنی آواز کو معتبر اور مقبول بنایا ہے۔ مصرعوں کی تراش خراش اور عورت اور مرد کے مانوس رویوں کا رومانوی مزاج ان کا شعری کردار ہے۔ جدت کو اس حد تک ہی اپناتے ہیں جس حد تک وہ قارئین کی سماعتی عادتوں کا احترام فرماتے ہیں۔ شاذ کو اپنا کلام سحر س سے سننے کا بہت شوق ہے۔ اس شوق نے ان کی شعری لفظیات کے شخصی آہنگ میں کہیں کہیں عمومیت بھی ابھار دی ہے۔ شاذ نے شعری ضرورت کے لئے ایک محبوبہ ضرور تلاش کی تھی لیکن اپنے مرکز نگاہ ہمیشہ وہ خود رہتے تھے۔ انہوں نے اپنے ذہن میں جو اپنی تصویر بنالی تھی اسے ہر جگہ اپنے ساتھ لئے پھرتے تھے۔ جب کوئی اس تصویر کے بجائے ان سے ملنے کی کوشش کرتا تھا تو وہ ناراض ہو جاتے تھے اور اس غم کو شراب سے بہلاتے ہیں۔ یہ شراب نوشی آہستہ آہستہ شعر گوئی کی طرح ان کی عادت بن جاتی ہے، وہ نشہ میں اکثر اپنا ایک شعر بار بار دہراتے ہیں۔

میرا ضمیر بہت ہے مری سزا کے لئے
تو دوست ہے تو نصیحت نہ کر خدا کے لئے

دہلی میں کناٹ پلیس کی ایک عمارت کی پانچویں منزل کی چھت پر عمیق حنفی، محمود ہاشمی، زبیر رضوی اور دوسرے دوست جمع ہیں۔ ندا اپنی کوئی نئی نظم سناتا ہے جس کی داد عمیق حنفی اس طرح دیتے ہیں کہ اپنی شعری بیاض اٹھا کر پانچویں منزل سے نیچے پھینک دیتے ہیں۔

ایک بار کوٹہ (راجستھان) کے ایک مشاعرہ کے بعد، مشاعرہ میں اپنی ہوٹنگ سے ناراض ہو کر عمیق ندا کے کمرے میں آتے ہیں اور بلند آواز میں اعلان فرماتے ہیں "آئندہ میں بھی اسٹیج سے مزاحیہ شاعری سناؤں گا اور انشاء اللہ تم سے زیادہ کامیاب ہو کر دکھاؤں گا۔

عمیق حنفی کا مطالعہ کافی وسیع تھا۔ ہندی، اردو، سنسکرت اور انگریزی سے بہ یک وقت ان کی قربت نے ان کی شاعری کو موضوعی تنوع ہی نہیں بخشا، لسانی جرأتوں کی وسعت بھی عطا کی تھی۔ وہ توازن سے زیادہ اجتہاد کے شاعر تھے۔ عمیق حنفی جدید شعری ادب میں نئے امکانات کی جستجو کی علامت تھے۔

یوں ہوا ہے چاک ملبوس یقیں ملتا نہیں
پھینک دینا بھی ہے مشکل دوسرا ملتا نہیں

دلی کافی ہاؤس میں باقیؔ اپنی غزلوں سے زیادہ اپنی گونج دار قہقہوں کے لئے مشہور تھا۔ اس کے قہقہے دوپہر کے جنگلوں کی طرح گنجان اور وحشیانہ ہوتے تھے۔ وہ ہنستا تھا تو لگتا ہے ایک جنگل ٹکڑے ٹکڑے ہو کر چاروں طرف بکھر رہا ہے۔ کافی ہاؤس میں اپنے دوستوں کو کافی پلانے، اور دوسروں کے شعر سننے اور اپنے نئے شعر سنانے کا وقت وہ ہر شام گھر سے طے کر کے چلتا تھا۔ وہ جب بھی ملتا تھا کسی عجلت میں محصور ہوتا تھا۔ بات کرتے کرتے وہ اچانک گھڑی دیکھ کر کھڑا ہو جاتا تھا اور باہر آ کر کناٹ پلیس کے سرکل کا ایک بے مقصد سا طواف کر کے غائب ہو جاتا تھا۔ باقیؔ کی غزل اس کی جسمانی ساخت کی طرح اپنی مضبوط کاٹھی اور خوش لباسی سے پہچانی جاتی ہے۔ اس کے پاس کہنے کو تو زیادہ نہیں ہے مگر جو ہے وہ اس کا اپنا ہے۔ اس کی غزل موضوع و اظہار کے کلیشیز سے دور ہے اس کی دنیا، رقبہ کے لحاظ سے چھوٹی ضرور ہے لیکن اس کی مصوری میں اس نے جو رنگ استعمال کئے ہیں وہ آرائشی ہوتے ہوئے بھی سریت آمیز ہیں۔ باقیؔ کی ادارت میں ماہنامہ تخلیق کا 'جدید نظم' نمبر ہندوستان میں جدید شاعری کے ابتدائی دنوں کا ایک اہم ادبی واقعہ ہے۔

وہ ٹوٹتے ہوئے رشتوں کا حرفِ آخر تھا
کہ چپ سی لگ گئی دونوں کو بات کرتے ہوئے

وحید اختر اور شاذ کے ساتھ عزیز قیسی بھی سلیمان اریب کے مشہور ماہنامہ صبا کے نئے لکھنے والوں میں تھے۔ ہندوستان میں محمود ایاز کے سوغات سے پہلے جدید شاعری کی احتجاجی

آوازیں اسی رسالے نے مشہور کی تھیں۔ عزیز قیسی نسلاً پٹھان تھے۔ ان کی نفرتوں اور محبتوں میں شدتوں کا رنگ زیادہ تھا۔ کسی سے خوش ہوتے تھے تو اسے سات خون معاف فرما دیتے تھے، ناراض ہوتے تو معمولی بات پر بھی ہاتھ اٹھا دیتے تھے۔ 'نئے کلاسیک' جو مرا ٹھواڑا یونیورسٹی نے شائع کی تھی اس میں عزیز قیسی کے بارے میں لکھا ہے۔

قیسی کے یہاں کلاسیکی رجحان ترقی پسند مزاج اور جدید احساس نے مل جل کر ایک ایسے لہجہ کو جنم دیا ہے جو الہانی کتابوں کے لہجے کے قریب ہے۔

قیسی شاعری کے ساتھ تنقیدی نثر اور فکشن بھی لکھتے تھے۔ ان کی شاعری انفرادی رنگ کے بغیر نئے پرانے کئی اسالیب سے آراستہ ہے۔ انسانی اقدار پر ترقی پسندانہ اعتبار ان کا شعری مزاج ہے......

ازل درد ہے اور ابد درد ہے
درد ہی ابتدا درد ہی اپنی حد ہے
مگر کون ہے جو مرا سورۂ دل سنے

☆☆☆

برسات تیز ہو گئی ہے۔ ندا پیڑ کے نیچے سے نکل کر بھاگتا ہے اور ایک دوکان کے سائبان تلے پناہ لیتا ہے۔ وہ برائلر چکن کی دوکان ہے۔ دوکان میں چاروں طرف لکڑی کے چوکھٹے دیواروں میں نصب ہیں۔ ہر چوکھٹے میں اوپر نیچے کئی خانے ہیں۔ ہر خانہ میں مختلف وزن کے چھوٹے بڑے چکن بند ہیں۔ ایک گاہک آتا ہے اور اسکے آتے ہی ایک ہاتھ ان میں سے کسی ایک خانے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتا ہے۔ خانہ کا انتخاب اتفاقی ہے۔ یہ اتفاق اس کو دوسرے خانے میں بھی داخل کر سکتا تھا۔ ہاتھ کے اندر جاتے ہی اس خانے میں بند مرغے مرغیوں میں ہلچل ہوتی ہے۔ وہ اس ہاتھ کی پھیلتی سکڑتی انگلیوں سے بچ کر ادھر ادھر ہونے لگتے ہیں۔ پنجے جست بھرتے ہیں، پر پھڑپھڑاتے ہیں، ہنا آنکھوں کے اس ہاتھ کی گرفت میں جو آتا ہے وہی باہر نکال لیا جاتا ہے۔ جالی دار خانوں میں قید پرندے اپنی ساکت آنکھوں سے اس ہاتھ کی گرفت میں اپنے ساتھی کو دیکھتے ہیں، اور پھر خاموش ہو کر گھومنے لگتے ہیں۔ ان سارے مرغے اور مرغیوں کو باری باری اس ہاتھ کی زد میں آنا اور گرینائٹ کے کالے پتھر پر کلمہ سنتے ہوئے قصائی کے ہاتھوں حلال ہونا ہے۔ صبح کے نو بجے سے رات کے نو بجے تک چاندی کی انگوٹھی والا یہ ہاتھ اپنے کام میں مصروف رہتا ہے۔ اس سے فرار نا ممکن تھا۔ کوئی پہلے اسکے شکنجے میں آتا ہے کوئی بعد میں۔ کوئی سورج غروب ہونے تک دانہ چگنے اور پانی پینے کے لئے آزاد ہے۔ کوئی دوکان کے بند ہو جانے تک جالی سے باہر کا نظارہ کرتا ہے۔ یہ خانے کبھی خالی نہیں ہوتے۔ جتنے خالی ہوتے ہیں، اتنے ہی پھر سے بھر دیئے جاتے ہیں۔ ان کی آوازوں اور پروں کی پھڑپھڑاہٹوں سے دوکان کی فضا دن رات آباد رہتی ہے۔ ٹھیک نو بجے دوکاندار، دکان کا شٹر گرانے کے لئے اٹھتا ہے۔ ندا کو لگتا ہے، اب رات بھر

کے لئے باقی کے پرندے محفوظ ہیں مگر دوکاندار کے اٹھتے ہی ایک اور گاہک آجاتا ہے اور دن بھر کا مصروف ہاتھ پھر سے کئی خانوں میں سے کسی ایک خانے کا اتفاق بن جاتا ہے۔ اور یہ اتفاق گرینائٹ کے کالے پتھر پر کچھ دیر تڑپ کر خاموش ہو جاتا ہے۔

پانی کے تھمتے ہی ندا تیز قدموں سے سڑک کو کراس کرتا ہے۔ لیکن فٹ پاتھ پر پہونچتے ہی وہ اچانک گھبرا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اسے لگتا ہے قصائی کا ہاتھ اس کے جسم سے نکل کر اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ وہ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے اور اپنی اس احمقانہ سوچ پر ہنس کر بس کی تلاش میں آگے بڑھ جاتا ہے۔ بس کے لمبے کیو میں یہی وہم پھر اسے گھیر لیتا ہے۔ مگر اس بار وہ ایک ہاتھ کئی ہاتھوں میں تبدیل ہو کر کیو کے ہر مسافر کے برابر کھڑا نظر آتا ہے۔

بس آتی ہے اور انجن کی تیز روشنی میں پھر سے سب کچھ صاف دکھائی دینے لگتا ہے۔ قصائی کا ہاتھ پھر سے قصائی کے پاس پہنچ جاتا ہے ندا اس وقت اپنے گھر سے کافی دور ہے لیکن اسے معلوم ہے، بس اسے کہاں تک لے جائے گی اور وہ جہاں اترے گا وہاں سے اس کا گھر کس طرف ہے؟

اس کے اندر اچانک ایک خوف سر اٹھاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے اس کی یادداشت کا ٹیپ اگر چلتے چلتے کبھی اچانک بے صوت ہو گیا تو کیا ہوگا۔ اپنا نام ہو یا گھر کا پتہ اسی کے سہارے تو اسے اپنے ہونے کا احساس ہر وقت یاد رہتا ہے اسی کی وجہ سے اس کا رشتہ ماضی و حال سے قائم ہے۔ اسی یادداشت کے ٹیپ میں وہ زبان ہے جو وہ بولتا ہے، اسی میں وہ خواب ہیں جو اس کے ہم سفر ہیں، اسی میں وہ رشتے ناطے اور مسائل ہیں جو اس کی شخصیت ہے۔ انسانی زندگی بھی چھوٹے بڑے کل پرزوں سے بنی ایک مشین ہی ہے۔ اتنے سارے پرزوں میں نہ جانے کب کون کام کرنا چھوڑ دے اور آدمی چلتے چلتے جو ہے اس سے مختلف ہو جائے۔ ان بے معنی خیالات کو خود سے دور کرنے کے لئے وہ بس میں بیٹھے ہوئے مسافروں کو دیکھنے لگتا ہے۔

ان میں ہر ایک کے چہرہ کی ساخت اور پہناوے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان چہروں اور پہناووں سے وہ ان علاقوں کے بارے میں سوچتا ہے جو اپنے الگ الگ رنگوں سے پہچانے جاتے ہیں راجستھان کے گہرے سرخ رنگ، گجرات کے ہلکے پیلے رنگ، پنجاب کے شوخ گلابی اور کالے رنگ۔ ان رنگوں میں ندا کا بھی اپنا رنگ ہے! اس رنگ سے ہی اس کا

دوسرے رنگوں سے رشتہ ہے۔

یہ زندگی

آج جو تمہارے

بدن کی چھوٹی بڑی نسوں میں

مچل رہی ہے

تمہارے پیروں سے چل رہی ہے

تمہاری آواز میں

گلے سے نکل رہی ہے

تمہارے لفظوں میں ڈھل رہی ہے

یہ زندگی

جانے کتنی صدیوں سے

یونہی شکلیں بدل رہی ہے

بدلتی شکلوں بدلتے جسموں میں

چلتا پھرتا یہ اک شرارہ

جو اس گھڑی نام ہے تمہارا

اسی سے ساری چہل پہل ہے

اسی سے روشن ہے ہر نظارہ

ستارے توڑو، یا گھر بساؤ

علم اٹھاؤ یا سر جھکاؤ

تمہاری آنکھوں کی روشنی تک ہے کھیل سارا

یہ کھیل

ہوگا نہیں دوبارا......

جمیل فاطمہ کے مرنے میں ابھی پانچ سال باقی ہیں۔ عمر نے انھیں کافی کمزور اور بوڑھا کر دیا ہے۔ لیکن ان کے ارادے اور خواب اب بھی پہلے جیسے ہیں۔ ان کا ایک بیٹا سعودی عرب میں کنگ ہاسپٹل میں ڈاکٹر ہے۔ مجتبیٰ احسن فاضلی۔ اس کی آمدنی اچھی خاصی ہے۔ وہ ہر سال کراچی آتا ہے اور جمیل فاطمہ کے نام کے اکاؤنٹ میں ڈالر جمع کرتا رہتا ہے۔ ان کے آنے جانے کے لئے اس نے ایک امپورٹیڈ کار بھی خرید کر دے دی ہے ان کا دوسرا بیٹا پاکستان کے شپنگ کارپوریشن میں اعلیٰ عہدہ پر ہے، نام ہے مصطفیٰ حسن، اس کی تنخواہ بھی ہر مہینہ ان کا بینک بیلنس بڑھا رہی ہے۔ تیسرا بیٹا شاعر ہے، اچھے ترنم میں مشاعرے پڑھتا ہے نام ہے صبا فاضلی سب سے چھوٹا تسلیم فاضلی پاکستانی فلم انڈسٹری میں نغمہ نگار ہے۔ وہ مصطفیٰ حسن کے بعد گھر میں سب سے لاڈلا ہے۔ وہ جو کماتا ہے اسے خود اڑاتا ہے، جب بھی کراچی سے لاہور آتا ہے، وہ جمیل فاطمہ یا مرتضیٰ حسن سے کچھ نہ کچھ لے کر جاتا ہے۔ ان پانچ سالوں میں جمیل فاطمہ کے سارے کام نام بہ نام ان کے ذہن میں درج ہیں۔ بڑے لڑکے اور بڑی لڑکی کی شادی کرنا ہے۔ ان کے لئے مناسب خاندانوں کی تلاش جاری ہے، ناظم آباد میں ایک کئی کمروں کا بنگلہ بنوانا ہے۔ اس بنگلے میں سب ایک ساتھ رہیں گے۔ ایک بار ممبئی میں ندا سے ملنے آنا ہے، اس کے بعد حج کے لئے جانا ہے۔ اسی کے ساتھ ہونے والی شادیوں کی تیاریاں ہیں۔ گہنوں کی خریداری، لباسوں کی سلائی کڑھائی، کچھ دنوں سے لاہور کے اخبارات میں تسلیم فاضلی کے کسی ایکٹریس سے معاشقہ کی خبریں شائع ہو رہی تھیں۔ ان خبروں سے ان کی پریشانی نے طے شدہ کاموں میں ایک مصروفیت کا اور اضافہ کر دیا تھا۔ وہ وقت نکال کر لاہور بھی جائیں گی اور اس ایکٹریس سے اپنے بیٹے کو دور کر کے خاندانی روایت کی حفاظت

فرمائیں گی۔ انہیں اپنے آپ پر اعتماد ہے۔ گھر میں اب تک جو ہو تا رہا ہے وہ دیر سویر انہیں کے منصوبوں کے مطابق ہوا تھا۔ وہ جب بھی جس کام کا بیڑا اٹھاتی ہیں خدا کے کرم سے اسے پورا کر دکھاتی ہیں۔

بنگلہ کی تعمیر شروع ہو چکی ہے۔ وہ روز ناشتہ کر کے لیاقت آباد کے اپنے پرانے گھر سے کار میں بینک جاتی ہیں اور وہاں سے روپے لے کر واپس ناظم آباد آتی ہیں۔ شام تک وہ وہیں رہتی ہیں۔ ہاتھ میں چھتری لئے وہ دن بھر ادھر سے ادھر گھومتی رہتی ہیں۔ فرشوں کے سنگ مرمر، محرابوں کے ڈیزائن، بنگلے کے باغ کا فوارہ اور اس میں پیڑ پودوں کا انتخاب سب انہیں کی پسند سے طے ہوتا ہے۔ گھر میں کسی اور کو دخل اندازی کی اجازت نہیں تھا۔

بنگلہ کی تعمیر کے دوران کئی مزدوروں سے ان کی دوستی ہو جاتی ہے۔ وہ تعمیر کی نگرانی کے ساتھ ان کے نجی (خانگی) مسائل بھی حل کرتی رہتی ہیں۔ ان میں سے کچھ تیج تہواروں میں لیاقت آباد بھی آتے رہتے ہیں۔ ایک مزدور کا بے ماں کا بچہ رفیق ان سے کافی ہل گیا ہے۔ پہلی بیوی کے مرنے کے بعد اس کے باپ نے دوسری شادی کر لی تھی۔ سوتیلی ماں کا سلوک اس کے ساتھ کچھ اچھا نہیں تھا۔ جمیل فاطمہ کو جب اس کا علم ہوتا ہے تو وہ اسے اپنے ساتھ رکھ لیتی ہیں۔ رفیق کو انہوں نے اسکول میں داخل کرادیا ہے۔ فرصت کے اوقات میں وہ گھر میں چھوٹے موٹے کام بھی کرتا ہے۔ مہینے میں ایک دوبار اب وہ رفیق کے اسکول بھی جانے لگی تھیں۔ یہ پتہ لگانے کہ اس کی پڑھائی ٹھیک سے ہو رہی ہے یا نہیں۔

لطیف کارپینٹر کی بیماری سے بھی وہ پریشان ہیں۔ ایک دن دروازہ کے لئے آری سے لکڑی چیرتے ہوئے وہ چکر کھا کے گر جاتا ہے۔ جمیل فاطمہ یہ دیکھ کر گھبرا اٹھتی ہیں۔ ان کی گھبراہٹ دیکھ کر دوسرے مزدور انہیں تسلی دیتے ہوئے کہتے ہیں۔ ماں جی۔ آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔ ایسے چکر اسے اکثر آتے ہیں، کچھ دیر میں ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن جمیل فاطمہ کو ان کی بات پر یقین نہیں آتا۔ وہ اپنا کام چھوڑ کر کار میں اسے سرکاری ہاسپٹل لے جاتی ہیں۔ ہاسپٹل میں ڈاکٹر اس کا معائنہ کرتے ہیں اور کچھ دن اسے ہاسپٹل میں رکھتے ہیں۔ لطیف میاں کا علاج

ہو رہا ہے۔ وہ صاف ستھرے بستر پر آرام سے ہیں۔ لیکن جمیل فاطمہ کو ان کی بیماری کافی مہنگی پڑتی ہے۔ لطیف میاں اپنے گھر میں اکیلے کمانے والے ہیں۔ ان کی بیوی روزانہ ان کی بے کام کی مزدوری وصول کرنے آجاتی ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر نے ان کے مرض کے لئے جو دوائیاں تجویز کی تھیں وہ کم ہی دوکانوں پر دستیاب تھیں وہ جس دوکان میں جاتی ہیں، دوکان والا نسخہ دیکھ کر کسی دوسری دوکان کا پتہ بتا دیتا ہے۔ جمیل فاطمہ کی فکر سے گھر کے دیگر افراد بھی فکر مند ہیں۔ دوائیاں مہنگی بھی ہیں اور نایاب بھی، ان کے لئے وہ کبھی لاہور میں تسلیم کو فون کرتی ہیں کبھی سعودی عرب میں ڈاکٹر فاضلی سے بات کرتی ہیں۔ جب تک دوائیاں نہیں آجاتیں انہیں چین نہیں ہوتا۔ مکان بننے تک ان کے میل جول کا دائرہ کافی بڑھ جاتا ہے۔ اپنے اس رویہ سے وہ خود بھی پریشان ہوتی ہیں اور اپنے ساتھ گھر کے دیگر افراد کو بھی پریشان کرتی ہیں۔

نئے مکان میں منتقل ہونے کے بعد بیٹے بیٹی کی شادیوں کا وقت آجاتا ہے۔ جس گھر سے وہ بہو لاتی ہیں، اسی کے بڑے بھائی سے اپنی بیٹی بیاہتی ہیں۔ شادی کی تقریبات میں رشتہ داروں کی تعداد کم ہوتی ہے مکان بنانے والے مزدوروں اور مزدورنوں کی گنتی زیادہ ہوتی ہے۔ دولہا دلہن کے جوڑوں کے ساتھ ان کے لئے بھی نئے کپڑے بنائے جاتے ہیں۔ شادیوں سے فارغ ہو کر پہلے وہ لاہور جاتی ہیں اور وہاں سے اکیلی ممبئی آتی ہیں۔ ممبئی میں انکے دو بیٹے ہیں۔ صبا فاضلی اور ندا فاضلی۔ صبا، ندا سے پہلے ممبئی میں تھے۔ فلم انڈسٹری سے وابستہ تھے۔ ممبئی میں ایک فلم بھی پروڈیوس کر چکے ہیں۔ فلم ناکام ہوتی ہے، لیکن فلم کی ہیروئن سے عشق شروع ہو جاتا ہے۔ جمیل فاطمہ کی خاندانی روایت اس عشق کے بھی آڑے آتی ہے اور انہیں سمجھا بجھا کر اپنے ساتھ لے جانے پر راضی کر لیتی ہیں۔ ندا پہلے کی طرح اس بار بھی ان کے ساتھ نہیں جاتا۔ ممبئی میں اپنے مختصر قیام کے دوران وہ ندا کے کئی دوستوں سے ملتی ہیں اور ان سے اسے سمجھانے کو کہتی ہیں لیکن ندا خود اپنے آپ کو نہیں سمجھا پاتا۔ جمیل فاطمہ اپنے انتقال سے ایک مہینہ پہلے اپنے بنائے ہوئے نئے گھر میں پہونچ جاتی ہیں۔ انہوں نے

اپنے ذمہ جو کام طے کئے تھے، ان میں ایک کو چھوڑ کے باقی سب پورے ہو چکے ہیں۔ صرف ندا ان کے ساتھ نہیں تھا۔ لیکن اس غم نے بھی انہیں ناامید نہیں کیا۔ انہیں خدا کی ذات پر بھروسہ ہے کہ وہ ان کی دوسری گذارشوں کی طرح یہ آرزو بھی ایک نہ ایک دن پوری کر دے گا۔ ایک مہینہ کی قلیل مدت میں انہوں نے اگلے کئی سالوں کے کام سوچ لئے ہیں۔ ان کئی کاموں میں ایک ضروری کام اپنی بیٹی قمر طلعت کو لے کر اگلے سال ہندوستان آنا بھی تھا۔ قمر طلعت شادی کے تین چار سال بعد بھی ماں بننے سے محروم تھی۔ اس مسئلہ کا حل، اس کے شوہر کی ماں اپنے بیٹے کی دوسری شادی میں سوچنے لگی تھی۔ جمیل فاطمہ، اسے روکنے کے لئے قمر طلعت کو گوالیار کی اسی درگاہ کی زیارت کو لے جانا چاہتی ہیں جس کی برکت سے پپو کی ماں حاملہ ہوئی تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ وہ دوسرے بہت سے خوابوں کی طرح یہ آرزو بھی نامکمل چھوڑ کر رخصت ہو جاتی ہیں۔

اگر قبرستان میں الگ الگ کتبے نہ ہوں
تو ہر قبر میں
ایک ہی غم سویا ہوتا ہے
کسی بیٹے کی ماں
کسی بہن کا بھائی
کسی عاشق کی محبوبہ
تم کسی بھی قبر پر فاتحہ پڑھ کے چلے جاؤ

ندا جب پہلی بار کراچی جاتا ہے تو ایرپورٹ سے سیدھا جمیل فاطمہ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جاتا ہے، دوسری دفعہ وہ جتنے دن وہاں قیام کرتا ہے ہر روز قبرستان جانے کا ارادہ کرتا ہے لیکن دوستوں اور رشتہ داروں سے ملنے جلنے میں ہی سارا وقت نکل جاتا ہے وہاں جانے کی نوبت نہیں آتی۔ تیسری بار نہ وہ وہاں جانے کے بارے میں سوچتا ہے نہ کوئی اس سے وہاں چلنے کو کہتا ہے۔ جمیل فاطمہ اب کبھی کبھار بات چیت میں شامل ہونے آتی ہیں پھر واپس اپنی گمشدہ

قبر میں چلی جاتی ہیں۔

جمیل فاطمہ کی ایک خالہ زاد بہن دہلی میں ہے۔ وہ کچھ دن کے لئے کسی کام سے ممبئی آتی ہیں۔ وہ فون کر کے ندا کو جمبور کے پانجراپول کے علاقہ میں بلاتی ہیں۔ ندا ان سے کئی سالوں بعد ملتا ہے۔ وہ ندا کو دیکھتے ہی رونے لگتی ہیں اور کہتی ہیں۔ ''کم بخت تو جمیل باجی سے بھلے ہی دور رہا ہو لیکن وہ مرنے کے بعد بھی تیرے ساتھ ہی ہیں۔ وہی مسکراہٹ، وہی آنکھیں، وہی نقشہ۔ اب کیسے بھاگے گا تو ان سے'' وہ تجھ سے باہر نہیں خود تجھ میں ہیں۔

ندا نے اب سے پہلے اپنے بارے میں اس طرح نہیں سوچا تھا۔ وہ خود سے قریب ہو کر جب غور کرتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے صرف اوپری شباہت سے ہی اس کی ماں اسکے ساتھ نہیں ہے، اس کی عادتیں، اسکے سوچ کے طریقے، اس کا مزاج اور پسند و ناپسند کے پیمانے بھی تھوڑی بہت کمی بیشی کے ساتھ ویسے ہی ہیں۔ ایک ہی وجود میں وہ کچھ جمیل فاطمہ ہے کچھ مرتضٰی حسن ہے۔ ان دونوں کے درمیان وہ کہاں ہے؟ اس سوال کا جواب وہ اپنے آپ کو میر کے مصرع سے دیتا ہے۔

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی.........!

اس کے باوجود وہ خارج و باطن کے تضاد میں اپنے آپ کو تلاش کرتا ہے۔ اسے یاد آتا ہے وہ جیسا پہلے تھا ویسا اب نہیں ہے۔ شروع میں وہ ماں باپ سے جتنا دور تھا، اب اتنا ہی قریب ہے۔ عمر کے ساتھ آدمی اپنی ماں اور باپ خود بن جاتا ہے۔ دریدا نے اس بنیادی تبدیلی کے دفاع میں ایک جگہ لکھا ہے۔ شاید میں بوڑھا ہو رہا ہوں۔ کیونکہ میں آہستہ آہستہ اپنے موروثی یہودی اثرات کے قریب ہوتا جا رہا ہوں..... ندا اب عمر کی اس منزل میں ہے جب آدمی باہر کا لمبا فاصلہ طے کر کے واپس گھر میں لوٹتا ہے۔

نئی نئی آنکھیں ہوں تو ہر منظر اچھا لگتا ہے
کچھ دن شہر میں گھومے لیکن اب گھر اچھا لگتا ہے

دوپہر کے کھانے کا وقت ہے۔ ندا اپنی لکھنے کی میز سے کھانے کی میز پر پہونچتا ہے اور جو سامنے رکھ دیا جاتا ہے خاموشی سے کھانے لگتا ہے۔ ندا بنا بولے سامنے بیٹھی مالتی سے کہتا ہے۔

میں جب سے اپنے گھر والوں سے جدا ہوا ہوں، میں نے جب بھی کھایا ہے، کم یا زیادہ کھایا ہے، کبھی اچھی طرح سیر ہو کے نہیں کھایا۔ پیٹ بھر جاتا ہے لیکن بھوک نہیں مٹتی۔

مالتی بغیر بولے ندا سے کہتی ہے۔

میں نے اپنی ماں سے ایک سے ایک بڑھیا پکوان سیکھے ہیں۔ میری ماں بہت اچھا کھانا بناتی تھیں ان کے ہاتھ کا سواد سارے راج کوٹ (گجرات) میں مشہور تھا۔

ندا بنا بولے کہتا ہے۔

مسور کی دال میں لہسن کا بگھار، ارہر میں سوکھی کیری کی کھٹائی اور سرسوں کے تیل میں نئی فصل کے چھوٹے آلو اور ہری میتھی کا ذائقہ بہت خوشگوار ہوتا ہے۔ صاحبہ ایسے ہی بناتی تھیں۔

مالتی بنا بولے ندا سے کہتی ہے۔

میں جو بھی بناتی ہوں تمہیں پسند ہی نہیں آتا۔ اس لئے میں نے وقت خراب کرنا چھوڑ دیا ہے۔

ندا بنا بولے مالتی سے کہتا ہے۔

کتری پیاز، باریک ہری مرچ اور زیرہ والی تلی ہوئی بیسن کی روٹی کھائے اسے کئی سال ہو گئے، صاحبہ کے ہاتھ کی وہ روٹیاں، پودینہ ہری مرچ اور کیت کی چٹنی کے ساتھ سات سمندر پار چلی گئی ہیں۔ انہیں کھانے کے لئے مجھے ممبئی سے کراچی کے ایک علاقہ گلشن اقبال میں قمر طلعت کے پاس جانا پڑتا ہے۔

مالتی بنا بولے ندا سے کہتی ہے۔

میں جب سے تمہارے یہاں آئی ہوں۔ اپنے گھر کی رسوئی بھولتی جا رہی ہوں۔ تمہارے مزاج کے نمک مرچ نے میرا ذائقہ بھی خراب کر دیا ہے۔

ندا ان دنوں بنا بولے زیادہ بولتا ہے۔ یہ خاموش گفتگو اس کے اندر مسلسل جاری رہتی ہے۔ لفظوں سے وہ صرف وہی بولتا ہے جو دوسرے اس سے سننا چاہتے ہیں۔

کچھ طبیعت ہی ملی تھی ایسی چین سے جینے کی صورت نہ ہوئی
جس کو چاہا اسے اپنا نہ سکے جو ملا اس سے محبت نہ ہوئی

ندا کے گھر میں مالتی کا ایک لکڑی کا مندر ہے۔ اس میں گنیش کی مورتی کے ساتھ، اس کی مرحومہ ماں کا چوکھٹا بند تصویر بھی رکھی ہے۔ وہ روز صبح پوجا کرتے وقت گنیش کے ساتھ اس تصویر کے شیشہ پر بھی گلال لگاتی ہے۔ ماں مرنے کے بعد بھی اس کی عبادت میں شامل ہے۔ اسی طرح جیسے جمیل فاطمہ ندا کے وجود کا حصہ ہے......!

☆☆☆

رحمت بھائی دودھ سے جل چکے ہیں اس لئے چھاچھ کو بھی پھونک کر پیتے ہیں۔ ہنومان مندر کے پجاری پردیپ کی وعدہ خلافی نے انہیں زیادہ دور اندیش بنادیا ہے۔ جب ہم وطن دوست دھوکہ دے سکتا ہے تو دوسروں کا کیا بھروسہ۔ وہ دھندہ کرنا چاہتے ہیں لیکن سوچ سمجھ کر۔ دوسرا مندر بنانے کا خیال اب ان کے ذہن سے نکل چکا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس کے لئے انہوں نے کوشش نہ کی ہو۔ اپنے گاؤں میں وہ اپنے ایک پنڈت دوست کے ایک پوجا پاٹ سے واقف لڑکے کو ممبئی آنے کے لئے تیار بھی کر لیتے ہیں۔ لین دین سب طے ہو چکا تھا۔ وہ بھی اپنے رحمت چاچا کے ساتھ کام کرنے سے خوش تھا۔ لیکن کافی دوڑ دھوپ کے بعد بھی انہیں کوئی مناسب پوجا استھل نہیں ملتا اور وہ کسی دوسرے روزگار کی کھوج میں لگ جاتے ہیں۔ انہی دنوں ان کی ملاقات، ایک دن ندا کے یہاں انل واجپئی سے ہوتی ہے۔ انل کافی تیز اور چرب زبان ہے۔ دو چار ملاقاتوں میں ہی وہ رحمت بھائی کو شیشہ میں اتار لیتا ہے۔ رحمت بھائی کے فائنانس اور انل کے ڈائریکشن میں جین مندروں پر ایک ڈاکیومنٹری کا پلان بنتا ہے۔ ڈاکیومنٹری کے بکنے کے بعد رحمت بھائی کی رقم چوگنی ہو جائے گی۔ فائدہ کے ساتھ شہرت بھی ملے گی۔ اس ایک ڈاکیومنٹری کے بعد فلم بنائی جائے گی۔ اس میں ان کا نام فلمساز کے روپ میں ہوگا۔ پھر نیا فلیٹ، نئی کار، نئی شان، پھر وہ پردیپ کو بتائیں گے کہ ممبئی میں

کیسے پیسہ کمایا جاتا ہے۔ انل نے انہیں اتنے خوابوں سے لاد دیا ہے کہ انہیں اپنا پیسہ بھی اب خود پر بوجھ لگنے لگتا ہے۔ وہ ہونے والے فائدے کے نشہ میں انل کو اپنی پونجی کے سیاہ سفید کا مالک بنا دیتے ہیں۔

انل کی ندا سے پہلی ملاقات باندرہ کے سینٹ جونس اسکول کے سامنے ایک پان کی دوکان پر ہوئی تھی جہاں اس کا لڑکا نویں کلاس کا سٹوڈنٹ ہے۔ وہ ہر روز اسے دن میں ایک بار دیکھنے کے لئے وہاں آکر کھڑا رہتا تھا۔ اسکے بیٹے کا نام شہاب ہے۔ انل اسے دیکھ کر آواز دیتا ہے۔ لیکن شہاب اس کی آواز سنتے ہی اسکول کے اندر بھاگ جاتا تھا۔ انل کا بیٹا مسلمان تھا اس کی ماں اور رشتہ داروں نے اسے ہندو باپ سے دور رہنے کی تلقین کی ہے۔ انل کا یہ پرانا غم شراب کی محفل میں اکثر نئے آنسوؤں میں چھلکتا ہے۔ ان آنسوؤں کی ہم دردی میں ندا ایک بار زرینہ سے اس کے گھر میں ملتا ہے۔ وہ کھوئی کھوئی، ہونق سی محسوس ہوتی ہے۔ سوال کچھ ہوتا ہے جواب کچھ دیتی ہے۔ ندا کو جو اپنے ساتھ یہاں لاتا ہے وہ بتاتا ہے وہ پہلے ایسی نہیں تھی۔ اس میں یہ تبدیلی چند سال میں ہی آئی ہے۔ اب رات دن نماز پڑھتی ہے اور دن میں کئی کئی بار نہاتی ہے۔ اس کے بیٹے کی دیکھ بھال بھی ماموں زاد بھائی کے ذمہ ہے۔ انل واجپی جب ہدیل کھنڈ کے کسی علاقہ سے ممبئی میں روزگار کی تلاش میں آیا تھا اس وقت زرینہ نیشنل کالج میں بی اے کے آخری سال کی طالبہ تھی۔ اس کا شمار کالج کی ذہین طالبات میں تھا۔ پڑھائی کے علاوہ کالج کے ڈراموں اور دوسرے فنکشنوں میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیتی تھی۔ انل کی ممبئی میں پہلی نوکری زرینہ کے باپ کے جنرل اسٹور میں سیلس مین کی حیثیت سے ہوتی ہے۔ زرینہ کا باپ کچھ دنوں بیمار ہو کر گھر میں آرام کرتا ہے اس کی غیر موجودگی میں زرینہ کا دوکان میں آنا جانا بڑھ جاتا ہے۔ زرینہ جس عمر میں تھی اس میں حرارتوں کو جسارتوں تک پہونچنے میں دیر نہیں لگتی باپ کے تندرست ہونے تک زرینہ انل کے ساتھ اتنی دور نکل چکی ہوتی ہے کہ باپ کی بوڑھی آواز اس تک نہیں پہونچ پاتی۔ وہ دن بہ دن آگے ہی بڑھتی جاتی ہے۔ جب اس کی رفتار پر پابندیاں لگائی جاتی ہیں تو بغاوتیں سر اٹھاتی ہیں۔ زرینہ اپنے باپ کی

اکلوتی بیٹی ہے بڑی جائداد اور موٹے بینک بیلنس کی اکیلی وارث۔ انل اس کے باپ کے اصرار پر اپنا نام بدلنے کو تیار ہو جاتا ہے اور اس کے بعد وہ اسلم بن کر زرینہ کے گھر میں شفٹ ہو جاتا ہے۔ زرینہ کے باپ کے انتقال کے بعد وہ ایک فلاپ فلم بنا کر پہلے دوکان کو ٹھکانے لگاتا ہے، پھر پہلی فلم کے نقصان کو دوسری فلم سے بھرپائی کرنے کے لئے برسوں کی جمع کی ہوئی زرینہ کے باپ کی کمائی کو اڑاتا ہے۔ فلمسازی میں ناکام ہونے کے بعد اسلم ترقی کا دوسرا آسان راستہ اختیار کرتا ہے اور بھارتیہ جنتا پارٹی میں شامل ہو جاتا ہے۔ اور الیکشن لڑتا ہے وہ اسلم سے دوبارہ انل واجپئی بن کر صبح شام قریب کے مندر جانے لگتا ہے۔ ماتھے پر ٹیکا لگانے لگتا ہے۔ چاروں طرف سے مسلمانوں سے گھرے ایک پرانے جوہرے مسلمان گھر میں، اسلم کی یہ اچانک تبدیلی موضوع بحث بنتی ہے۔ زرینہ کچھ دنوں اس تماشہ کی خاموش تماشائی بنی رہتی ہے۔ پھر اپنی کم عمری کی بھول کو آٹھ سال کے بیٹے کی ماں کی پختہ عمر سے سدھارنے کا فیصلہ کرلیتی ہے۔ اس مشکل فیصلہ کو آسان بنانے میں اس کے رشتہ دار سرگرم تھے۔ انل اس مسئلہ کو بھی تجارتی سوجھ بوجھ سے حل کرتا ہے۔ اور جوگیشوری میں ایک دوروم کا فلیٹ اپنے نام لکھوالیتا ہے۔ اس فلیٹ میں اب اسکے ساتھ نائٹ کلب کی ایک ڈانسر رہتی ہے۔ انل نے کئی سال پہلے اسے اپنی ایک فلم میں ہیروئن بنانے کا وعدہ کیا تھا۔ فلم تو اب تک نہیں بنی لیکن اس وعدہ نے ڈانسر کی کمائی میں انل کو مستقل ساجھے دار ضرور بنادیا ہے۔

ڈاکیومینٹری میں رحمت بھائی کا سارا سرمایہ خرچ ہو جاتا ہے لیکن وہ ابھی تکمیل سے کوسوں دور ہے۔ رحمت بھائی اسے مکمل کرنے کے لئے ادھر اُدھر سے ادھار اٹھاتے ہیں، بیوی کے زیورات داؤں پر لگاتے ہیں پھر بھی بات نہیں بن پاتی۔ جب انل کو ان کے قلاش ہونے کا یقین ہو جاتا ہے تو وہ ان سے کترانے لگتا ہے کئی دن کی تلاش کے بعد ایک دن وہ انہیں سینٹ جونس اسکول کے سامنے کی پان کی دوکان کے قریب سگریٹ پھونکتا مل جاتا ہے۔ وہ سیدھے اس کے سامنے کھڑے ہو کر بولتے ہیں۔

انل میں بہت پریشان ہوں۔ میرے پاس جو کچھ تھا وہ سب تمہیں دے چکا ہوں۔ اب

مجھے تمہارے ساتھ کام نہیں کرنا۔ میری رقم مجھے واپس کردو۔

''تم نے پیسہ اپنی مرضی سے ڈاکیومینٹری میں لگایا ہے۔ مجھے ادھار نہیں دیا ہے جو میں واپس کروں''۔ انل کہتا ہے

تم بے ایمان ہو۔ میں نے اپنی مرضی سے پیسہ نہیں لگایا ہے، تم نے مجھے بے وقوف بنایا ہے۔ رحمت بھائی چیختے ہوئے کہتے ہیں۔

انل رحمت بھائی کے غصہ کو دیکھتے ہوئے تھوڑا نرم ہو کر کہتا ہے ارے رحمت بھائی ناراض کیوں ہوتے ہو۔ تمہارا پیسہ کہیں نہیں جانے والا کل گھر آجانا اور حساب کرلینا۔ اس واقعہ کے تین دن بعد رحمت علی ایک حادثہ کا شکار ہو کر مرنے والے ہیں۔ ان کے منصوبے کئی سال پر محیط ہیں۔ لیکن مہلت صرف تین دن کی ہے۔ جس سے وہ بے خبر تھے۔ اس بے خبری میں وہ اپنے بیٹے کے بارے میں سوچتے ہیں۔ وہ ابھی گیارہ برس کا ہے۔ چار سال میں وہ سیکنڈری کا امتحان پاس کرلے گا۔ پڑھائی کے بعد وہ کیا کرے گا۔ یہ بھی انہوں نے سوچ لیا ہے۔ ایک فلم کے ڈائریکٹر سے وہ اس کے بارے میں بات کر چکے تھے۔ اس نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ تعلیم ختم ہونے کے بعد اسے اپنے ساتھ اسسٹنٹ رکھ لے گا۔ وہ انل کے ساتھ جس شعبہ میں ناکام ہوئے ہیں وہ اس میں بہت نام کمائے گا۔ وہ یہ بھی سوچتے ہیں کہ جس مکان میں پچھلے کئی سال سے مقیم ہیں، اس کے اردگرد کا ماحول اچھا نہیں ہے ۔ پچھلے فسادات میں وہ یہاں کافی خوف وہراس سے گذرے تھے۔ اس مکان کو بیچ کر جو رقم ہاتھ آئے گی اس کے ایک چوتھائی میں وہ میرا روڈ یا یاری روڈ کے مسلم علاقہ میں موجودہ مکان سے بڑا مکان خرید لیں گے۔ باقی کے پیسوں سے کوئی دوکان کھول لیں گے۔ انہیں درزی کا کام آتا ہے۔ دو تین مشینیں لگالیں گے۔ انل کی بے ایمانی سے وہ واقف ہو چکے تھے۔

اس کے لئے بھی وہ اپنے ذہن میں پلان بنا چکے تھے۔ اگر وہ ان کی رقم لوٹانے میں آناکانی کرتا ہے تو وہ بیس پرسنٹ کے کمیشن میں یہ کیس ماہم کے کسی بھائی کو دیدیں گے...... تین لاکھ میں ساٹھ ہزار کا چونا لگے گا لیکن پوری رقم کے ڈوبنے سے بچ جائیں گے۔ اس ملنے والی

رقم کو ادھر اُدھر ضائع کرنے کے جائے وہ یو ٹی آئی کی ماہانہ اسکیم میں جمع کر دیں گے۔ ہر مہینہ کچھ نہ کچھ گھر میں آتا رہے گا اور پونجی بھی محفوظ رہے گی۔ مکان کو بیچنے کے لئے وہ باندرہ کے ایک ایجنٹ سے بات کرتے ہیں۔ پھر بینک سے پیسہ لے کر بیوی کے زیور واپس لاتے ہیں۔ بیوی زیوروں کی واپسی پر بہت خوش ہے۔ آج تیسرا دن ہے۔ وہ نہا دھو کر کھانا کھاتے ہیں اور آخری بار گھر سے نکلتے ہیں۔ انل کے گھر اس کے کہنے کے مطابق وہ دوبار جا چکے تھے لیکن ہر بار اس کے گھر میں ڈانسر لڑکی اس کے گھر میں نہ ہونے کی اطلاع دیتی تھی۔ تیسری بار وہ پھر اسکے گھر جانے والے ہیں۔ اس بار بھی وہ نہیں ملا تو وہ اس سے پیسہ نکلوانے کا وہی طریقہ استعمال کرنے والے ہیں جو انہوں نے پہلے سوچ رکھا ہے۔ تیسرے دن وہ انل کے گھر میں انل سے ملتے ہیں اور اسے آخری چیلنج دے کر اسکوٹر پر واپس لوٹتے ہیں۔ راستے میں انہیں پردیپ ملتا ہے۔ اسے دیکھ کر وہ بے دھیانی میں اسکوٹر روکتے ہیں اور پھر اسے تھوڑی دیر گھور کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ وہ ایک لحہ میں اسے اپنا ہم وطن دوست سمجھتے ہیں لیکن دوسرے لحہ مندر میں اس کی بے ایمانی کو یاد کر کے اس سے منہ پھیر لیتے ہیں...... وہ سوچتے ہیں، اس سے وہ اب اسی وقت ملیں گے جب ان کے حالات اس سے بہتر ہو جائیں گے۔ لیکن جوگیشوری ہائی وے پر وہ ٹرک کا حادثہ ان کے انتظار میں ہے جس کے بعد سب کچھ ختم ہونے والا ہے۔ ان کا اسکوٹر قدرت کی گھڑی کے مطابق ٹھیک وقت پر سامنے آتے ٹرک سے ٹکراتا ہے۔ اور وہ دو تین دن اپنی ٹوٹی ہڈیوں کا درد و کرب بھگت کر بے ہوشی کے عالم میں ہی گذر جاتے ہیں۔ ان کے آخر وقت میں رحمت علی کی بیوی اور بیٹے کے ساتھ پردیپ بھی ان کے سرہانے ہوتا ہے۔ رحمت علی کے بعد وہ ان کے گھر کی کفالت کرتا ہے اور ان کی زندگی میں جس ساجھے داری کو وہ ختم کر چکا تھا، اسے ان کی بیوی اور بیٹے کے ساتھ پھر سے بحال کر دیتا ہے۔

نیند کے گہرے اندھیرے غار سے پھر
روشنی پھوٹی

کھلا آکاش

رستے جگمگائے

اوس میں بھیگی ہوا کی آہٹوں سے

آشیانوں میں پرندے چہچہائے

پھر ملی بے نور آنکھوں کو بصارت

پھر ملی بے صوت کانوں کو سماعت

پھر ملی بے جان سانسوں کو حرارت

کھول کر کھڑکی!

موذن کی صدا پر

زندگی نے پھر نیا سپنا لکھا ہے

جشن کا پرچم اٹھائے

پھر نیا سورج اگا ہے

ایک دن پھر اور جینے کو ملا ہے

☆☆☆

کمال امروہی رضیہ سلطان بنا رہے ہیں۔ انہوں نے اس فلم میں آخری دو گانے لکھوانے کے لئے ندا کو یاد کیا ہے۔ اس فلم کے گانے جاں نثار لکھ رہے تھے۔ لیکن اپنے بہت سے دوسرے کاموں کی طرح اس فلم کے گیت بھی وہ پورے نہیں کر پائے۔ کمال صاحب نے یوں تو نخشب سے ساحر لدھیانوی تک سبھی کے ساتھ کام کیا ہے۔ لیکن مزاجاً انہیں جو شاعر پسند تھے ان میں جاں نثار اختر اور کیف بھوپالی تھے۔ جاں نثار کے انتقال کے بعد اس فہرست میں ندا کا نام بھی شامل کر لیا جاتا ہے۔ کمال امروہی کے دن کے سارے کام ان کی اپنی جیب گھڑی سے طے ہوتے تھے جو ہمیشہ دوسری گھڑیوں سے پندرہ منٹ آگے ہوتی تھی۔ اس فرق کا ان کا اپنا جواز بھی تھا۔

"صاحب وقت تیز قدم ہے اور آدمی ست قدم ہے۔ اپنی گھڑی کو مقررہ وقت سے آگے کر کے میں نے ایک تو اپنی ست رفتاری کو وقت کا ہم قدم بنالیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ مجھے جہاں بھی بلایا جاتا ہے عام گھڑیوں کے وقت سے بلایا جاتا ہے اور میں اپنے وقت سے جاتا ہوں۔ اس لئے کسی تقریب میں پانچ دس منٹ سے زیادہ دیر نہیں ہوتی۔"

ندا اپنی گھڑی کے حساب سے ان سے ملنے کمالستان پہونچتا ہے۔ اور مسلسل آدھا گھنٹہ ان کے جاگنے کا انتظار کرتا ہے۔ وہ دوپہر کے کھانے کے بعد ایک گھنٹہ آرام کے عادی تھے۔ اس نیند سے جاگنے کے بعد وہ فوراً کسی سے ملنا پسند نہیں کرتے۔ آنکھ کھلتے ہی پہلے وہ اپنے گنبد

نما کمرے میں بستر کے سامنے کی کرسی پر کسی حسینہ کی مسکراہٹ کا دیدار فرماتے تھے، پھر منتظر افراد کو اندر بلاتے تھے۔ یہ حسینہ اور مسکراہٹ باری باری اپنا چہرہ اور لباس بدلتی رہتی تھی۔ ہر تیسرے چوتھے دن چہروں کی تبدیلی کا ان کا اپنا جواز بھی ہے۔

''صاحب ایک چہرہ کو بار بار لگاتار دیکھنے سے ایک تو حسن کی کشش کم ہوتی ہے، دوسرے، دیکھنے والے کی بینائی بھی کمزور ہوتی ہے۔ یکسانیت کو خدا بھی پسند نہیں کرتا۔ اسی لئے ہر دور میں دنیا پہلے سے مختلف دکھائی دیتی ہے''۔

دوپہر کی اس مختصر سی حسن پرستی کے لئے، چار اچھے چہرے مہرے کی کم عمر لڑکیوں کی تنخواہیں ڈائریکشن کے اخراجات میں شامل تھیں ندا جب اندر داخل ہوتا ہے تو کمال صاحب اکیلے نہیں ہوتے۔ ان کے چار پانچ اسسٹنٹ بھی ان کے ساتھ تھے۔ ان سب کا تعلق امروہہ سے تھا۔ برسوں کی صحبت نے انہیں کمال صاحب کا ہم مزاج بنادیا تھا۔ کمال صاحب ہنستے ہیں تو سب ایک ساتھ ہنستے ہیں۔ بولتے بولتے جب وہ خاموش ہوتے ہیں تو سب آدھے ادھورے جملے ہوا میں معلق چھوڑ کر چپ ہو جاتے ہیں۔ کمال صاحب کی ہر بات کو دھیان سے سننا اور پھر سر ہلا کر ان سے اتفاق کرنا بھی ان کے فرائض میں شامل تھا۔ ان میں سے کوئی اپنی رائے کے لئے آزاد نہیں تھا۔ کمال صاحب کی کوئی بات یا خیال اس وقت تک درست ہوتا ہے جب تک وہ خود اس کی تردید نہیں کرتے۔ ندا کے اندر آنے کے وقت وہ چاندی کی ایک نقشین ڈبیا سے پان نکال کر، سونے کی سلائی سے اس میں کتھا چونا لگاتے ہیں اور اسے منہ میں رکھ اپنے ماضی کا ایک واقعہ دہراتے ہیں۔

''صاحب اس وقت سہراب مودی کا ڈنکا بج رہا تھا۔ میں انہیں ایک تاریخی کہانی سنانے گیا تھا۔ تو صاحب جیسے ہی میں ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ تو وہ میری کم عمری کو دیکھ کر حیرت میں پڑ گئے۔ ان کی خاموشی کو توڑتے ہوئے میں نے کہا۔ سہراب صاحب میں دیکھنے کی نہیں، سننے کی شئے ہوں۔ اس ایک جملے سے وہ اتنا متاثر ہوئے کہ میری کہانی سنے بغیر انہوں نے مجھے اپنی فلم پکار کیلئے بحیثیت مکالمہ نگار رکھ لیا۔'' اس واقعہ کے بعد وہ ہنستے ہیں۔ حسب

روایت ان کے ساتھ سارے اسسٹنٹ بھی ہنستے ہیں۔ پھر اچانک خاموش ہو کر ندا سے مخاطب ہوتے ہیں۔

ندا صاحب آپ کو میں نے اس لئے زحمت دی ہے کہ مجھے رضیہ سلطان کے آخری دو گیت اور ریکارڈ کرنے ہیں۔ ان کے لئے مجھے گیت کار نہیں مکمل شاعر کی ضرورت ہے اور آپ کی صلاحیت سے میں واقف ہوں۔ اسی لئے یاد کیا ہے۔

شکریہ! میں کوشش کرونگا کہ آپ کے معیار کو مطمئن کر سکوں۔ ندا جواباً کہتا ہے۔

"جی" "لیکن صاحب ادبی شاعری اور فلمی شاعری میں کافی فرق ہے۔ رضیہ سلطان میں نغمات تحریر کرنے کے لئے، میرے مزاج کی پہچان لازمی ہے۔ جاں نثار اختر بہت خوبیوں کے شاعر تھے۔ وہ میرے مزاج کو پہچان گئے تھے۔ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے...... کمال صاحب اپنے مخصوص انداز اور آواز میں سمجھاتے ہیں"۔

ندا مسکراتے ہوئے کہتا ہے۔ آپ کے مزاج کی پہچان کی شرط انہیں کافی مہنگی پڑی۔ میں کوشش کروں گا زندہ رہتے ہوئے اس ذمہ داری کو نبھاؤں......

اس بات پر کمال صاحب نہیں ہنستے۔ ان کے اسسٹنٹ ہنستے ہیں۔ لیکن ہنستے ہنستے کمال صاحب کی سنجیدگی کو دیکھ کر، فوراً خاموش بھی ہو جاتے ہیں۔ اسی دوران، رضیہ سلطان کی آرٹ ڈائریکٹر شمیم دو پینٹنگز لے کر آتی ہے۔ ان میں بہت سے زیورات پہنے اونٹ نظر آتے ہیں۔ جب یہ تصویریں کمال صاحب کے سامنے رکھی جاتی ہیں تو وہ ان کی لمبائی چوڑائی دیکھ کر بھڑک اٹھتے ہیں۔

"یہ کیا بنا لائی ہیں آپ، رضیہ سلطان ملکہ ہندوستان کے اونٹ اور اتنے چھوٹے۔ ہر عمل میں مقام اور مرتبہ کا احترام ضروری ہے۔ لے جایئے انہیں اور رضیہ سلطان کے مقام کے لحاظ سے ان کی سواری کی لمبائی چوڑائی کا تعین کیجئے، ان کے زیورات کی مصوری میں بھی ملکہ کی عظمت کا خیال رکھیے......"

رضیہ سلطان میں دھرمیندر ہیرو ہے۔ وہ اس میں حبشی غلام کا رول کر رہا ہے۔ وہ

جب بھی سیٹ پر آتا ہے، میک اپ مین اس کے گورے رنگ پر سیاہی پوت دیتا ہے۔ کمال صاحب ایک شاٹ کی تیاری میں پورا دن لگا دیتے ہیں۔ کبھی پورے دن کی محنت کے بعد بھی شاٹ مکمل نہیں ہوتا اور ہیرو دن بھر اپنی روسیاہی کا عذاب جھیلتا رہتا ہے۔ لوگوں کی زبانی سنا ہے کہ وہ اس کی روسیائی ہی کے ذریعے میناکماری سے اس کی آشنائی کا انتقام لے رہے تھے۔

کمال صاحب اپنے لڑکے اور لڑکی سے الگ، اپنی تیسری بیوی کے ساتھ رہتے ہیں۔ یہ بیوی ان کی بیٹی کی عمر سے بھی ایک دو سال چھوٹی ہے۔ اس کی شباہت کہیں کہیں سے میناکماری سے ملتی ہے۔ وہ کمال صاحب کے پاس اداکاری کے لئے آئی تھی، لیکن یہ اتفاقی شباہت، اسے ان کی گھرداری کی ذمہ داری سونپ دیتی ہے۔ کمال صاحب اب جس محفل میں بلائے جاتے ہیں، نئی بیگم کو بھی اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ ایسی ہی ایک محفل میں ندا کمال صاحب کا تعارف ایک بار سریندر پرکاش سے کراتا ہے۔ سریندر پرکاش، انہیں خوش کرنے کے لئے نہایت سعادت مندی سے پوچھتا ہے۔

"حضور چائے نوش فرمائیے گا"

"کیا مضائقہ ہے" کمال صاحب مسکراتے ہوئے کہتے ہیں۔

سریندر لپک کر بھائی داس کے ٹی اسٹال سے دو گرم چائے کے گلاس اٹھا لاتا ہے۔ ایک کمال صاحب کو دیتا ہے اور دوسرا ان کے ساتھ کھڑی میناکماری کی شباہت والی لڑکی کو تھما دیتا ہے۔ وہ جیسے ہی گلاس ہاتھ میں لیتی ہے تو بے ساختہ بول پڑتی ہے۔ ہائے اللہ بہت گرم ہے۔

سریندر پرکاش یہ جملہ سن کر اپنی جیب سے رومال نکال کر اسے پیش کرتا ہے۔

بیوی کی تائید میں کمال صاحب بھی فرماتے ہیں۔ "واقعی بہت گرم ہے"

اس بار کمال صاحب کے جملہ کے جواب میں سریندر (بنا یہ جانے بغیر کے ان کے ساتھ جو لڑکی ہے وہ کوئی اداکارہ نہیں، ان کی نئی اہلیہ ہے) لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"وہ تو کم عمر ہیں حضور، آپ کی بزرگی تو گرم و سرد کی سرحد پار کر چکی ہے۔

کمال صاحب جملہ کے طنز کو مزاح میں بدلتے ہوئے ندا کو مخاطب کر کے جوش کے دو مصرع سناتے ہیں۔

معشوق کہیں آپ ہمارے ہیں بزرگ
ناچیز کو وہ دن نہ دکھانا یارب

وہ مصرعے سنا کر قہقہہ لگاتے ہیں اور انکے قہقہہ کو ایک ساتھ سب دہراتے ہیں۔ ندا سریندر پرکاش کے اس عمل پر بعد میں جب اسے برا بھلا کہتا ہے تو وہ ایک مختصر سا جواب دے کر خاموش ہو جاتا ہے "یار میں کیا کروں۔ میرے منہ پر جب کوئی بات آجاتی ہے تو وہ رو کے نہیں رُکتی۔

'رضیہ سلطان' کمال صاحب کی آخری فلم ہے۔ اس کے بعد بھی وہ ایک فلم کا پلان بناتے ہیں۔ تین گانے بھی ریکارڈ ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی دن بہ دن خراب ہوتی صحت اسے شروع نہیں ہونے دیتی۔ ان کے دونوں بیٹے اور بیٹی بھی ان کی فلم سازی سے متفق نہیں تھے۔ وہ جب بار بار انہیں ان کے بڑھاپے کا احساس دلاتے تھے تو واقعی بوڑھے ہو جاتے تھے۔ بوڑھا ہونے کے بعد، پہلے وہ جوان بیوی کو طلاق دے کر، اسے اپنے کسی ہم عمر سے شادی کرنے کے لئے آزاد کرتے ہیں۔ اس کے نئے شریک حیات کے انتخاب میں کمال صاحب کی پسند بھی شامل ہوتی ہے...... بیوی کو بیٹی کی طرح رخصت کرنے کے بعد وہ وصیت تیار کرتے ہیں اور پھر اپنی کار اور فلیٹ کی چابیاں سابق اہلیہ کے حوالے کر کے اپنے بیٹوں کے گھر منتقل ہو جاتے ہیں۔ برسوں کی دبی گھٹی بیماریاں، ہر وقت فلمی منظر ناموں کی تراش خراش اور کمالستان کی ترتیب و تزئین اور محفل آرائیوں میں مصروف رہنے والے کمال صاحب کو بستر پر دیکھ کر، ایک ساتھ گھیر لیتی ہیں۔ وہ جانی انجانی ان کئی بیماریوں کے نرغے میں زندگی کی آخری لڑائی لڑ رہے ہیں۔ اس علالت میں بھی ان کی مسکراہٹ اور آواز کی انفرادیت پہلے کی طرح برقرار ہے۔ وہ شروع سے خوش پوشی اور خود آرائشی کے آدمی رہے ہیں۔ آئینہ سے ان کی دوستی ہمیشہ کی مانند اب بھی قائم تھی۔ سامنے دیوار پر کلنڈر کو دیکھ کر

اچانک انہیں خیال آتا ہے کہ وہ کافی عرصہ سے بستر پر ہیں۔ اس خیال کے ساتھ ہی ان کا ہاتھ اپنے چہرہ پر بڑھتی ہوئی داڑھی پر پھرنے لگتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو دیکھنے کے لئے آئینہ طلب کرتے ہیں۔ مگر اس میں وہ جیسے نظر آتے ہیں، اسے پسند نہیں کرتے

”نہیں صاحب یہ تو کمال امروہی نہیں ہے۔ وہ خود کو دیکھتے ہوئے کہتے ہیں اور سرہانے بیٹھی اپنی بیٹی سے حجام بلانے کی فرمائش کرتے ہیں۔ حجام آتا ہے اور شیو کرتا ہے۔ وہ دوبارہ آئینہ دیکھتے ہیں۔ اور اپنے ہی عکس سے مسکراتے ہوئے کہتے ہیں۔

”جی ہاں۔ انہیں ہم جانتے ہیں۔ آداب عرض کمال امروہی صاحب!“ ایک لمبے سفر کی داستان کے یہ آخری الفاظ تھے۔

چڑیا نے اڑ کے کہا، میرا ہے آکاش
بولا شکرا ڈال سے، یوں ہی ہوتا کاش

☆☆☆

آدمی آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ اپنے حصہ کی اچھائی برائی سے زندگی بھر جو جٹاتا ہے، اپنی پسند اور مزاج سے اسے سجاتا ہے۔ میز کی جگہ، کرسیوں کے ڈیزائن، پردوں کے رنگ، ڈرائنگ روم کی نشست، تحائف وانعامات کی ترتیب سب کچھ دوسرے ہاتھوں کی تبدیلیوں کیلئے چھوڑ جاتا ہے۔ اور خود دیوار پر تصویر بن کر مسکراتا رہتا ہے۔ کمال امروہی بولتے زیادہ تھے سنتے کم تھے۔ ندا جب ان سے ملا تھا وہ سننے کے دور سے گذر کر بولنے کے حصار میں آچکے تھے۔ ہر آدمی کے پاس باتوں کا تھوڑا سا سرمایہ ہوتا ہے جسے وہ نئے نئے لفظوں میں بار بار دہراتا ہے۔ مرنے کے بعد بھی ان کی تصویر اس عادت کی اسیر تھی۔ گھر والے ان باتوں کو کئی بار سن چکے ہوتے ہیں۔ اس لئے تصویر ان کے لئے خاموش ہو جاتی ہے۔ گھر والوں سے وہ پہلے ہی سے نالاں تھے۔ کیونکہ انہوں نے ان کی زندگی میں ہی اپنی سماعتوں کو دوسری آوازوں میں مصروف کر لیا تھا۔ اس لئے اب وہ ندا یا ایسے ہی کسی دوسرے فرماں بردار سامع کا دیوار پر ٹنگے انتظار کرتے رہتے تھے۔ اور پھر بولنا شروع کر دیتے تھے۔

''صاحب کھانا' پکانا اور کھلانا بڑے شائستہ فن ہیں۔ ان فنوں کی فنکاری یونہی ہاتھ نہیں آتی اس میں کئی نسلوں کے تجربے شامل ہوتے ہیں۔ پہلے باورچی وراثت سے مہارت حاصل

کرتے تھے۔ آج تو ہر کام ٹریننگ سے ہوتا ہے۔" یہی وجہ ہے ہاتھوں سے سواد غائب ہو گیا ہے"۔

"اڑد کی دال جو ہم نے امروہہ میں کھائی ہے وہ ممبئی میں کبھی نصیب نہیں ہوئی...... بنتی بھی بڑے اہتمام سے تھی۔ چھلکوں کی اڑد کی دال کو مٹکے کے ٹھنڈے پانی سے دھویا جاتا تھا۔ دھونے کے بعد تانبے کے قلعی شدہ تسلے میں بھگویا جاتا تھا۔ پھر باریک ململ سے ڈھک کر چھت کی کھلی ہوا میں رکھا جاتا تھا۔ رات بھر بھیگنے کے بعد دال سے چھلکے الگ ہو جاتے تھے تو انہیں پانی سے نتھارا جاتا تھا۔ پھر چھلنی میں رکھ کر چھینکے میں کچھ دیر ٹانگا جاتا تھا۔ جب دال پھریری ہو کر صاف شفاف اور پھول کر کبوتر کے انڈوں کی طرح بڑی ہو جاتی تو لکڑی کی دھیمی آنچ میں مٹی کی ہنڈیا میں پکائی جاتی۔ باریک ادرک، ہرا دھنیہ اور انگاروں جیسی چھوٹی سرخ مرچوں کے ساتھ، بعد میں گھر میں بنے اصلی گھی میں زیرے کا بگھار...... اس طرح تیار ہو کر جب دال دستر خوان پر آتی تو دیکھتے ہی بھوک بڑھ جاتی ...... ذائقہ ایسا کہ بکرے کا گوشت اور مرغے کا سالن بھی اسکے سامنے بے وقعت نظر آتے۔ پکانا ہو یا کھانا دونوں میں شوق و ذوق ہونا ضروری ہے۔"

"صاحب 'محل' اپنے ڈھنگ کی پہلی اور آخری فلم تھی۔ اس فلم کی کامیابی میں اس کے تھیم سانگ کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ فلم شروع ہو چکی تھی۔ لیکن یہ گانا کیسا ہو یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ نخشب نے کئی مکھڑے لکھے۔ اپنی جگہ وہ سب اچھے تھے۔ مگر میں جیسا چاہتا تھا ان میں سے کوئی ویسا نہیں تھا۔ یہ بھی سچ ہے میں جو چاہتا تھا وہ میرے ذہن میں بھی صاف نہیں تھا۔ نخشب کئی بار جھلائے بھی، ناراض بھی ہوئے لیکن میں بھی مجبور تھا۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ مدھوبالا کو کیا گانا ہے، لیکن لفظوں میں اس کی شکل کیا ہوگی اس کا علم مجھے نہیں تھا۔ میں بھی پریشان تھا نخشب بھی پریشان تھے۔ اور گانا ریکارڈ کرنا تھا...... ! مدھوبالا بہت حسین خاتون تھیں۔ خدا نے انہیں بڑی احتیاط سے بنایا تھا۔ میر تقی میر نے شاید انہیں جیسی کسی حسینہ کو دیکھ کر کہا تھا۔

جس جائے سراپا یہ نظر جائے ہے اس کے
آتا ہے یہی جی میں یہیں عمر بسر ہو

تو صاحب ایک دن میں نے انہیں گھر پر بلایا۔ اور لگاتار دو تین گھنٹے انہیں دیکھتا رہا۔ مسکراتے ہوئے، چلتے ہوئے، آنکھوں سے بولتے ہوئے، ہاتھوں سے سوچتے ہوئے، پیروں سے زمین پر کچھ کھوجتے ہوئے! ان کے جانے کے بعد جب سویا تو بڑی اچھی نیند آئی۔ حسن کا بھی نشہ ہوتا ہے...... مگر کچھ ہی دیر بعد اچانک آنکھ کھل گئی...... اور میرے ہونٹوں سے لفظ نکلنے لگے۔ آئے گا، آئے گا، آئے گا آنے والا۔ ان لفظوں کے ملتے ہی میں فوراً دوسرے کمرے میں گیا جہاں کھیم چند سوئے ہوئے تھے۔ انہیں جگا کر میں نے جیسے ہی یہ لفظ سنائے تو وہ اچھل پڑے اور باقی کا گیت انہوں نے پورا کر دیا۔ یہ گیت دراصل مدھوبالا کے حسن کی دین ہے۔ لیکن انہوں نے اپنے حسن کی قدر نہیں کی اور ایک مسخرے سے شادی کر کے خدا کی عنایت کی توہین کی۔ اسی لئے خدا نے جلدی انہیں اپنے پاس بلا لیا۔

"صاحب دولت و شہرت اچھے اچھوں کا دماغ خراب کر دیتی ہے۔ ان کے ہوتے ہوئے بھی انسان انسان رہے، اس کے لئے بڑی تہذیب کی ضرورت ہوتی ہے۔ جسم میں وراثت کا خون ہونا چاہیئے۔ مہ جبیں کا تعلق معمولی گھرانے سے تھا۔ جس پر اُن کی فنکاری نے نقاب ڈال دیا تھا۔ اُن کی آواز اور اداکاری لاجواب تھی۔ ان کے ماں باپ اسٹیج پر ناچ گا کر گذارا کرتے تھے۔ مہ جبیں کو مینا کماری میں نے بنایا لیکن ان میں جو خون تھا اسے بدل نہیں پایا، یہ ممکن بھی نہیں تھا۔ اس خون نے رنگ دکھایا اور وہ وقت سے پہلے رخصت ہو گئیں۔ ان کی اداکاری اور آواز قدرت کی نعمتیں تھیں لیکن وہ پاؤں جن کی تعریف میں مشہور مکالمہ ہے۔ آپ کے پاؤں بہت خوبصورت ہیں انہیں زمین پر نہ رکھیے، میلے ہو جائیں گے مہ جبیں کے نہیں تھے۔ یہ مکالمہ اُن پیروں کا عطیہ ہے جنہیں میں نے چندیری کے ایک کوٹھے پر دیکھا تھا۔ وہ ایک خوبصورت رقاصہ تھیں۔ دورانِ رقص ان کے پاؤں بجلیوں کی طرح کوندتے تھے۔ وہ میرا پہلا عشق تھا۔ اسکے بعد تو عمر ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں، نے زندگی بھر پریشان

رکھا۔ اور کئی عشق کیے۔ میں عاشق میں عاشق کم ہوا محبوب زیادہ بنا''۔

ندا جاتا تو تھا جون سے ملنے۔ لیکن وہاں پہونچتے ہی وہ تصویر اسے گھیر لیتی تھی۔ اور بار بار پہلے کی سنی وہی باتیں دہراتی رہتی! جو ندا کی یادداشت میں محفوظ تھیں۔

کمال امروہی کے پڑ سے کے لئے جون ایلیا کراچی سے ممبئی آئے ہوئے تھے۔ ایک مجموعہ کلام ایک دو سال پہلے شائع ہوا تھا۔ اس میں مشاعروں کی شوخیوں کے ساتھ اچھی غزلیں بھی شامل ہیں۔ شاعری شروع کرنے سے کتاب کی اشاعت تک جتنا بیاض میں محفوظ تھا، وہ سب بنا کسی انتخاب کے 'شاید' کے حوالے کر دیا۔ زبان و بیان پر قدرت موروثی ہے۔ زود گوئی بھی رئیس امروہی جیسی ہے۔ لیکن مجموعہ میں شعری ذہانت پر کتاب کی ضخامت حاوی ہو گئی، اور کتاب وقت سے پہلے کھوئی بازار میں جاگتی رہی جاگنے والوں کے لیے سو گئی۔ نہ جون ایلیا نے اپنے آپ کو ڈھنگ سے پہچانا، اور نہ قارئین نے انہیں جاننے کی طرح جانا۔ مشاعرہ میں پڑھنے کا انداز پاپ سنگر جیسا ہے۔ بیٹھ کے پڑھتے ہیں۔ تو بیٹھے بیٹھے چاروں سمتوں کا سفر کرتے ہیں۔ کبھی سر کو پاؤں کے انگوٹھے سے لگاتے ہیں کبھی چھاتی پیٹ کر شعر کو پرتاثیر بناتے ہیں۔ کھڑے ہو کر شعر سناتے ہیں تو برجو مہاراج جیسے کتھک کے بھاؤ دکھاتے ہیں۔ اور خود تماشہ بن کر محفل کو تماشہ بناتے ہیں۔ شراب کم پیتے ہیں، نشہ کا احساس زیادہ جگاتے ہیں۔ اس سب کے باوجود جب شعر مشاعرہ میں نہیں جاگتا تو سامعین سے ایسی گفتگو فرماتے ہیں کہ لوگ ان کے شعروں کے بجائے ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ اور بالوں کے بھر اوپر تالیاں جاتے ہیں۔ جون کو خوش کرنے کے لئے یہ کافی ہیں۔ وہ اسے اپنی کامیابی سمجھتے ہیں۔

جون ایلیا کی شاعری کا مجموعی مزاج رومانوی ہے۔ جسے وہ شعر میں زبان کی ڈرامائیت اور داخلی ایمائیت سے پُر لطف اور پر اثر بناتے ہیں۔ وہ ایک ساتھ امروہہ اور کراچی میں رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کراچی میں رہتے ہوئے وہ امروہہ کو یاد کرتے ہیں اور جب امروہہ میں ہوتے ہیں تو کچھ دن بعد کراچی کے لئے آنسو بہاتے ہیں۔ وہ منقسم برِ صغیر کا چلتا پھرتا ایک مرثیہ ہیں، مشترکہ تہذیب کا یہ بٹوارہ ان کا کرب ہے جو ان کی شاعری میں جہاں تہاں جھلکتا

ہے۔ درد بن کر کسکتا ہے۔ انہوں نے اپنے امروہہ سے جس وقت ہجرت کی تھی اس وقت ان کا شہر ان کی طرح کافی جوان اور چونچال تھا۔ اب جب وہ آدھی صدی سے زیادہ عرصہ گذار کر بالوں میں خضاب لگانے لگے ہیں۔ ان کے شہر کے بھی اب نہ منہ میں دانت ہیں، نہ پیٹ میں آنت ہے۔ ایک بار وہ کافی عرصہ کے بعد اپنے بچھڑے ہوئے امروہہ سے ملنے آئے۔

گاڑی سے اترتے ہی پلیٹ فارم پر لیٹ کر زمین سے ماتھا ٹکرانے لگے۔ انہیں اس حالت میں دیکھ کر اچھی خاصی بھیڑ جمع گئی۔ اور جون اپنی دھن میں دونوں ہاتھوں سے زمین سے دھول سمیٹ کر اپنے بالوں میں ڈالتے رہے۔ اور ہائے امروہہ، میرے امروہہ کہہ کر آنسو بہاتے رہے۔

مشکل سے اُٹھا کر آگے بڑھائے گئے۔ ایک نے کمر میں ہاتھ ڈالا دوسرے نے بازو تھاما۔ مگر جیسے ہی اسٹیشن سے باہر آئے، فوراً آزاد ہو کر کبھی کسی درخت سے لپٹ کر زار زار روتے تھے کبھی کسی پرانے مکان کو دیکھ کر بے اختیار ہوتے تھے۔ دو چار دن امروہہ میں قیام کر کے اپنے امروہہ کو ڈھونڈتے ہیں، جب وہ دور پاس کہیں نہیں ملتا تو گھبرا کر دہلی آجاتے ہیں۔ چھوڑا ہوا شہر کچھ دن جانے والے کا انتظار کرتا ہے۔ بعد میں وہ بھی اٹھ کر کہیں اور چلا جاتا ہے جون کا خوبصورت شعر ہے۔

نظریہ بار ہوجاتے ہیں منظر، جہاں رہئیو وہاں اکثر نہ رہئیو

ناسٹیلجیا تخلیقی ذہن کی بڑی قوت ہوتی ہے۔ لیکن جب یہ شخصی ہوتا ہے تو اکہرا ہو جاتا ہے۔ اچھے ادب میں نجی یادیں تہذیب وثقافت اور انکے طویل اتہاس سے رشتہ جوڑ کر لسانی وزمانی دائروں سے آزاد ہوتی ہیں۔ ہمارے ادب کا ایک بڑا حصہ اس آگہی سے محروم ہے۔ حال سے بے اطمینانی اور ماضی کی پاسبانی، کے محدود رویہ نے الفاظ کی قوت گویائی کو بھی محدود کر دیا ہے۔ اختر شیرانی لاہور میں بیٹھ کر ٹونک کے کسی ہم وطن سے مل کر پرانی یادوں کا (او دیس سے آنے والے بتا کس حال میں ہیں یارانِ وطن) ماتم کرتے ہیں اور انتظار حسین بلند شہر کے ایک چھوٹے سے اپنے پچاس سال پرانے قصبہ ڈبائی کا غم کرتے ہیں۔ ٹونک زمینی رقبہ کے

لحاظ سے ڈبائی سے کافی بڑا ہے۔ لیکن تخلیقی اعتبار سے وہ اختر شیرانی کے ٹونک سے زیادہ وسیع اور تہہ دار لگتا ہے۔ قرۃ العین اور انتظار نے اپنے اپنے غموں کے حوالے سے پورے معاشرے کا مرثیہ لکھا ہے' جب کہ اختر نے اپنی سلمیٰ اور ریحانہ کی طرح اپنے ٹونک کو بھی محض اکہرے رنگوں سے رچا ہے۔ الفاظ ادیب یا شاعر کی شخصیت کے ساتھ چھوٹے بڑے ہوتے ہیں۔ شخصیت جیسی ہوتی ہے ویسی ہی الفاظ میں منعکس ہوتی ہے۔ پابلو نرودا نے اپنی سرگذشت میں اپنے تخلیقی عمل سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''اسٹائل صرف آدمی تک ہی محدود نہیں ہوتا۔ اس میں وہ سب کچھ شامل ہوتا ہے جو اس کے اِرد گرد ہے۔ اگر وہ ہوائیں جن میں وہ سانس لیتا ہے۔ اس کی شاعری میں نہیں سرسراتی تو وہ شاعری مردہ ہوتی ہے۔ کیونکہ بنا سانس کے کوئی زندگی ممکن نہیں''۔

جون ایلیا نے اپنی خداداد صلاحیت سے وہ کام نہیں لیا۔ جس کی ان سے توقع تھی۔ ان کے بوہیمین مزاج نے، انہیں اپنی تنہائیوں کا سیاح تو بنا دیا، لیکن ان تنہائیوں کو اپنے عہد کے اتار چڑھاؤ سے آباد نہیں ہونے دیا۔ ممکن ہے یہ سودا امتحانی کے لفظوں میں وہ اپنی دفاع میں کہیں۔

''میری وراثت کی تہمت کا مجھے کیوں قصوروار ٹھہرایا جائے''

یا میر کا وہ مشہور مصرع دہرائیں

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی

ان کی شاعری کا فکری دائرہ محدود سہی، لیکن ان کے لہجہ کے بے تکلف تیور اور گنگا جمنی شعری زبان کی بے ساختگی نے ان میں ایک قسم کی انفرادی لٹک پیدا کی ہے۔ جون کو سنتے یا پڑھتے وقت، مطلع سے مقطع تک پوری غزل کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔ وہ سامنے کے شعر کہتے کہتے کب کوئی اچھا شعر نکال لیں اس کی اطلاع سامع یا قاری کو اسی وقت ملتی ہے جب وہ شعر سامنے آتا ہے ذرا سی بھول چوک سے ان کا سامع اچھے شعر سے محروم ہو سکتا ہے۔ جون ایلیا کراچی میں بہت مقبول شاعر ہیں ان کے مجموعہ کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ان

کی زمینیں اکثر شاعروں کو پر کشش محسوس ہوتی ہیں۔ ان کی بے اعتدالی اور آزاد خیالی سے بزرگان بھلے ہی ناخوش ہوں، لیکن نئے ادیب اور شاعر ان سے قریب بھی ہیں اور انکے مداح بھی ہیں۔

حسب معمول سورج غروب ہوتے ہی فون کی گھنٹی بجتی ہے اور ریسیور اٹھاتے ہی جانی پہچانی آواز سنائی دیتی ہے۔ جانی شام ہو گئی، ساری چہل پہل کھو گئی۔ جلدی یہاں آؤ اور مجھے یہاں کے ماتمی ماحول سے باہر لے جاؤ، یہ آواز جون ایلیا کی ہوتی ہے۔ ندا ان کیلئے ایک اچھی محفل سجاتا ہے۔ اوسوال گیسٹ ہاؤس میں شہر کے کئی صنعت کار جمع ہوتے ہیں۔ جون ہوش تک کسی سے ہاتھ ملاتے ہیں، کسی سے بتیاتے ہیں، کسی کو دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی شراب شباب پر آتی ہے وہ صوفہ سے اتر کے فرش پر بیٹھ جاتے ہیں اور پھر پاؤں پھیلا کر لیٹ جاتے ہیں۔ کچھ دیر خاموشی سے چھت کو دیکھتے ہیں، پھر اچانک زور سے چلاتے ہیں۔

"ہندوؤں تم پر لعنت ہے۔ تم نے مجھے پاکستان میں مرنے کے لئے بھیج دیا اور خود یہاں رہ کر عیش کی زندگی بتا رہے ہو۔ جانی یہ تم نے میرے ساتھ بڑی ناانصافی کی ہے۔ اسے میں معاف نہیں کرونگا۔"

اتنا کہہ کر ان کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں اور وہ پھر سے گویا ہوتے ہیں۔ جانی مجھے یہاں بلا لو۔ بلا لو۔ اور وہاں کے جہنم سے بچا لو۔ بچالو، اپنی جذباتیت میں وہ بھول جاتے ہیں، جہنم ایک نہیں دونوں ہیں۔ صنعت کار جو شاعری سننے اور اس سے لطف لینے آئے تھے جون کی مدہوشی سے گھبرا کر ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ اور پھر ایک ایک کر کے چلے جاتے ہیں۔ سب کے چلے جانے کے بعد دو چار نوکروں کی مدد سے انہیں اٹھایا گیا، نیچے لایا گیا اور پھر اسی طرح گھر پہونچایا گیا۔ گیسٹ ہاؤس سے گھر تک، پانچ منٹ کے پیدل سفر کے دوران وہ بے ہوشی کے عالم میں بار بار ایک جملے کو دہراتے رہے۔ "جانی میں بہت اکیلا ہوں، بہت تنہا ہوں" جون آج کل کراچی میں اپنی بیوی سے الگ ہو کر اکیلی زندگی جی رہا ہے۔ اور اسی جدائی میں بے حساب پی رہا ہے۔

بے نام سا یہ درد ٹھہر کیوں نہیں جاتا
جو بیت گیا ہے وہ گذر کیوں نہیں جاتا

سب کچھ تو ہے کیا ڈھونڈتی رہتی ہیں نگاہیں
کیا بات ہے میں وقت پہ گھر کیوں نہیں جاتا

وہ ایک ہی چہرہ تو نہیں سارے جہاں میں
جو دور ہے وہ دل سے اتر کیوں نہیں جاتا

میں اپنی ہی الجھی ہوئی راہوں کا تماشہ
جاتے ہیں جدھر سب میں ادھر کیوں نہیں جاتا

وہ خواب جو برسوں سے نہ چہرہ نہ بدن ہے
وہ خواب ہواؤں میں بکھر کیوں نہیں جاتا

☆☆☆

بہت آگے گئے چلنے کو کچھ تیار بیٹھے ہیں
غنیمت ہے جو ہم صورت یہاں دوچار بیٹھے ہیں

ممبئی جیسی آج ہے پہلے ایسی نہیں تھی۔ اُردو کے شعری وافسانوی ادب کی پچھلے پچاس سال کی تاریخ شہر کے مختلف علاقوں میں چلتی پھرتی نظر آتی تھی۔ ان میں سے زیادہ کا تعلق فلم انڈسٹری سے تھا۔ فلموں میں ادیب وشاعر کی کامیابی رمی کے کھیل کی طرح ہوتی ہے۔ جس کو جب تک اچھے پتے ملتے رہتے ہیں، وہ کھیل کھیلتا رہتا ہے۔ یہاں ذہانت سے زیادہ قسمت کو کسوٹی بنایا جاتا ہے۔ ہر فلم کامیاب ہونے کے لئے بنائی جاتی ہے۔ لیکن اس کی کامیابی یا ناکامی کا آخری فیصلہ ریلیز ہونے کے بعد تماشائی ہی سناتے ہیں اور جب کوئی فلم کامیاب ہو جاتی ہے تو اس سے منسلک تمام افراد اس کامیابی کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ادیبوں اور شاعروں میں جو کامیاب ہوتے ہیں انہیں فلمیں ملتی رہتی ہیں۔ جو کوشش کے باوجود ناکام ہوتے ہیں وہ پورے طور سے ادب سے جڑ جاتے ہیں۔ یہاں نہ کامیابی کا کوئی فارمولا ہوتا ہے نہ ناکامی کی وجہ، پریم چند ہوں یا جوش، سردار ہوں یا قرۃ العین حیدر سب یہاں اپنی قسمت آزما چکے ہیں اور ناکام ہو کر ادب کو اپنا چکے ہیں۔

وقت دنوں، مہینوں اور سالوں میں گذرتا ہے۔ لیکن جب گذر جاتا ہے تو لمحوں میں سمٹ جاتا ہے۔ ایک ایک پل میں ہزاروں چاند سورج سما جاتے ہیں۔ سارا گذرا ہوا جے

گذرے ہوئے کافی عرصہ گذر چکا ہوتا ہے، ابھی حال کا دیکھا ہوا منظر محسوس ہوتا ہے۔

کرشن چندر کھار میں ایک بنگلے نما فلیٹ میں رہتے ہیں۔ وہ کبھی کبھی ادبی جلسوں یا محفلوں میں نظر آتے ہیں۔ ان کے نام کے ساتھ ہر جگہ ایشیا کا عظیم افسانہ نگار، کا تعارفی خطاب جوڑا جاتا ہے۔ یہ لقب ان کے نام کو کس کی دین ہے، یہ تو نہیں معلوم۔ لیکن کرشن جی کے افسانوی ادب کے مطالعہ سے اس بات کا احساس ضرور ہوتا ہے، کہ اچھے قصیدہ کے لئے مبالغہ آرائی کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ترقی پسندی کا وہ دور تھا جب ایک دوسرے کو عظیم بنانے کے لئے القاب و آداب کی رائج لغت میں نت نئے اضافے فرمائے جا رہے تھے۔

ایشیا اس وقت تک دنیا کا ایک پچھڑا ہوا حصہ تھا۔ جرمن، فرانس، انگلینڈ، روس اور امریکہ کی طرح انڈونیشیا، ملیشیا، کوریا، چین، کولمبیا، جاپان وغیرہ ہماری ادبی آگہی میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ اور اب بھی نہیں ہیں اس کے علاوہ برِ صغیر کی علاقائی ادبی تہذیبوں سے بھی ہمارا رشتہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ شو شنکر پلئی، سبرامنیم، بشیر وائی کم، ماستی وغیرہ سے ہم ناواقف تھے۔ لیکن اس عدم واقفیت کے باوجود انہیں ایشیا کا عظیم افسانہ نگار بنا دیا گیا تھا۔

کرشن چندر کی نثر چرب زبان ضرور ہے لیکن چرہ مہرہ سے دیدہ زیب بھی ہے۔ ان کی نثری شگفتگی نے انکے پڑھنے والوں کے حلقہ کو مقابلتہً وسیع کیا ہے۔ اس حلقہ کو اور بڑا کرنے کے لئے انہوں نے نہ صرف اردو کے ساتھ ہندی رسم الخط میں بھی چھپنا شروع کیا بلکہ اپنے قلم کی رفتار بھی تیز کی اور اپنے معیار سے بھی سمجھوتہ کیا۔ فلم انڈسٹری میں ناکام ہونے کے بعد ادب کو انہوں نے ذریعۂ معاش بنا لیا ہے۔ بازار میں ان کا مقابلہ اب بیدی، منٹو یا عصمت سے نہیں عوامی پسند کے رائٹر گلشن نندہ سے تھا۔

کرشن چندر کے چھوٹے بھائی مہندر ناتھ نے جو خود بھی مشہور افسانہ نگار تھے ممبئی کے افسانوں کی ایک کتاب خود ایڈیٹ کر کے فلم رائٹرس ایسوسی ایشن کے لئے شائع کی تھی۔ اس میں کرشن چندر، عصمت، دھرم ویر بھارتی کے علاوہ اور بھی کئی اچھے افسانہ نگار شامل تھے۔ مگر اس کے سرورق پر گلشن نندہ کا نام دیا گیا تھا۔ کیونکہ بازار میں وہ سب سے زیادہ فروخت

ہونے والے مصنف تھے۔

آزاد میدان میں کتابوں کی پہلی نمائش میں ایک بورڈ لگا تھا۔ جس پر لکھا تھا۔ رابندر ناتھ ٹیگور اور گلشن نندہ sold in lakhs کرشن چندر کافی پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ خوشتر گرامی کے زمانے کے بیسویں صدی میں ان کی کہانیوں کے ساتھ کرشن چندر ایم اے لکھا جاتا تھا۔ ان کے گھر کی لائبریری دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے وہ جتنا لکھتے ہیں اتنا پڑھتے بھی ہیں، وہ اس پڑھائی سے دوسروں کی بے خبری سے فائدہ بھی اٹھاتے ہیں۔ ایک شام کو لنگنگ روڈ باندرہ میں وہ ندا کو شاپنگ کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ ندا کی بدحالی اور گستاخانہ مزاج کے باوجود اس کی شاعری کے بارے میں دوسرے ترقی پسندوں کے مقابلہ میں بہتر رائے رکھتے ہیں۔ یوں بھی وہ برائی سے گریز اور تعریف میں فیاضی کے قائل ہیں جاں نثار اختر کے قطعات و رباعیات کے مجموعہ گھر آنگن کے دیباچہ میں "جاں نثار کی شاعری کی گھریلو فضا سے بحث کرتے ہوئے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"جدید شاعروں میں ندا فاضلی نے اس طرف توجہ دی ہے۔ مگر موضوع کی شش جہتی کے بجائے یہاں خواب کی پرچھائیاں ہیں اور موضوع بھی دوسرا ہے۔ شاعر اپنے کھوئے ہوئے گھر کی تلاش میں، کنکریٹ کے کڑے حصاروں میں اپنے آنگن کی سوندھی مٹی کو ڈھونڈتا ہے اور شہر کی سڑکوں پر اپنے گاؤں کی گلیوں کے موڑ یاد کرتا ہے۔ یہ ایک ایسی تلاش کی ثنویت کا المیہ ہے جو اداسی میں ڈوب کر لکھا گیا ہے"

ندا کرشن جی سے ذرا بے تکلف ہے۔ وہ ان کے ہاتھ میں گلشن نندہ کے کئی ناول دیکھ کر پوچھ بیٹھتا ہے۔

"کرشن جی کالو بھگی، دو فرلانگ لمبی سڑک اور آدھا گھنٹے کا خدا جیسی بیشتر خوبصورت کہانیاں لکھنے کے بعد آپ کے ساتھ یہ کتابیں کس لئے؟ گلشن نندہ نے تو آپکی کتابیں پڑھ کر لکھنا سیکھا آپ کو ان کتابوں میں کیا ملے گا""

پتہ نہیں کیا ملے گا لیکن میں انہیں پڑھنا چاہتا ہوں" وہ سادگی سے جواب دیتے ہیں۔

لیکن کیوں ؟ان میں آپ جیسے مشہور اور بڑے افسانہ نگار کے لئے ہے ہی کیا جو پڑھیں گے۔ یہ تو لوکل ٹرینوں میں مونگ پھلی بیچنے والے لڑکوں کی زبان میں "ٹائم پاس" قسم کی کتابیں ہیں۔

کرشن جی مسکراتے ہوئے بولے۔ دیکھو میاں کامیابی یا شہرت بلاوجہ کسی کو نہیں ملتی۔اس کی کوئی سائنسی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ میرے سوچنے کا طریقہ مختلف ہے میری کتابیں ہزاروں میں بکتی ہیں جب کہ گلشن کی کتابیں ہندی اور اردو میں ایک ساتھ لاکھوں میں بکتی ہیں وہ کس لئے ؟ میں ان کو پڑھ کر اس راز سے واقف ہونا چاہتا ہوں جو ان کی مقبولیت کا کارن ہے۔ کوئی وجہ اس مقبولیت کی ضرور ہوگی۔

دلیل معقول تھی۔ ندا خاموش ہو گیا۔ لیکن کرشن جی کی زبانی یہ بات سن کر اسے تعجب ضرور ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد ایک شام کو کرشن جی یوں ہی پھر مل گئے۔ ندا کے ذہن میں ان سے پچھلی ملاقات محفوظ تھی۔ اس نے انہیں دیکھتے ہی پوچھا۔

"کرشن جی، پچھلی بار آپ جب ملے تھے تو آپ کے ساتھ کچھ کتابیں تھیں۔ کیا وہ آپ نے پڑھیں ؟ان کی مقبولیت کا راز معلوم ہوا"

"ہاں جی...... پڑھ تو لیں۔ پڑھنے کے بعد وہ وجہ بھی سمجھ میں آگئی جو ان کتابوں کی مقبولیت کا سبب ہے !لیکن ان کی طرح لکھنا آسان نہیں ہے !کافی محنت طلب کام ہے"۔

وہ کیسے ؟ ندا ان سے پوچھتا ہے۔

"بھئی ان کے یہاں گہری فکر یا سماجی شعور نام کی کوئی چیز نہیں۔ وہ پڑھنے والے کو اپنی عقل کے استعمال کی زحمت سے بھی دور رکھتے ہیں۔ ہاں ایک بات ضرور ہے۔ وہ جیسا بھی لکھتے ہیں اسے لفظوں میں تصویروں کی طرح دکھاتے ہیں۔ یہ فلمی منظر نامہ کا ڈھنگ ہے۔ وہ لکھتے ہی نہیں اسے دکھانے کی کوشش بھی کرتے ہیں"۔

"آپ نے بھی کئی فلمیں لکھی ہیں، دیکھی ہیں، آپ کے لیے اس طرح لکھنا کون سا مشکل ہے"؟

''کہنے اور کرنے میں فرق ہے ندا فاضلی، جب آگے پیچھے دوسری گاڑیاں ہوں تو کار کو ریورس گیر میں نہیں چلایا جاسکتا میں جب بھی اس طرح لکھنے کی کوشش کرتا ہوں، دو چار صفحات کے بعد ہی میرا کرشن چندر مجھ پر سوار ہو جاتا ہے۔ اور پھر میرا قلم میرے اختیار میں نہیں رہتا۔'' ان جیسا لکھنا اب میرے لئے ممکن نہیں۔ کرشن چندر گلشن نندہ کی نقل کرسکتا ہے لیکن پورے طور پر گلشن نہیں بن سکتا۔ میں نے جو پڑھا لکھا ہے اُسے بھلانا اب ممکن نہیں۔ کرشن چندر اپنے عہد میں اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ مشہور اور مقبول رائٹر تھے۔ ہندی اور اُردو کے اشاعت گھر ان کے آگے پیچھے پھرتے تھے۔ اس مقبولیت کی ساکھ کو برقرار رکھنے کے لیے وہ پابندی سے روزانہ لکھتے تھے۔ دفتر کے ملازم کی طرح وہ طے شدہ وقت پر قلم اٹھاتے تھے اور مقررہ وقت تک اس کا ساتھ نبھاتے تھے۔ ان کی لکھائی گھڑی کے مطابق ہوتی تھی۔ ادب اب ان کے شوق کی عادت بھی تھا اور پیشہ کی ضرورت بھی تھا۔ ان دو متضاد رویوں نے انہیں کافی تیز رفتار بنادیا تھا۔ پہلے جب ان کی کوئی کتاب آتی تھی، تو محفلوں اور رسالوں میں موضوع بحث بنتی تھی۔ بعد میں ان کی تعداد اتنی زیادہ ہونے لگی کہ خود انہیں ان سب کے نام مشکل سے یاد آتے تھے۔ وہ اپنے اکیلے قلم سے ایک ساتھ دو گھروں کی کفالت کرتے تھے ایک گھر وہ جو سلمیٰ صدیقی اور ان کے پہلے شوہر سے انکے بیٹے اور کرشن چندر کا مشترکہ گھر تھا۔ اور دوسرا وہ جو اب صرف ان کی پہلی بیوی اور انکے بچوں پر مشتمل تھا۔ پہلے گھر میں کرشن جی مسلمان تھے دوسرے مکان میں پہلے کی طرح ہندو تھے۔ وہ اپنے عہد میں سیکولرزم کی زندہ علامت تھے۔ یہی مذہبی رواداری ان کی تحریروں کی فنکاری بھی ہے۔ آدھے ہندو آدھے مسلمان۔ دوسری شادی کے لئے انہوں نے مسلم پرسنل لا میں پناہ لی تھی روایت ہے کہ کبیر داس جی کا تعلق بھی سماج کے دونوں طبقوں سے تھا۔ وہ جس کی عبادت کرتے تھے۔ اسے رحیم اور رام دونوں ناموں سے پکارتے تھے۔ انتقال کے بعد ان کا یہ رمسیہ اختلافی مسئلہ بن گیا۔ کوئی انہیں اپنے عقیدہ کے مطابق دفن کرنا چاہتا تھا، اور کوئی آگ کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ کبیر کی روحانی قوت نے اس نفاق کو اتفاق میں ایسے بدلا کہ وہ اپنے

شریر پر پڑی چادر کے اندر جسم سے پھول بن گئے۔ دونوں فرقوں نے اپنے اپنے مذاہب کے مطابق، ان پھولوں کو آپس میں بانٹ کر آدھوں کو دفن کر دیا باقی کو جلادیا......

کرشن چندر روح پر مادہ کو ترجیح دیتے تھے۔ وہ کمیونسٹ تھے، اندر باہر سے اس لئے جیسے تھے مرنے کے بعد بھی ویسے ہی رہے۔ اور آگ کو سونپ دیے گئے۔ آکٹیویوپاز نے اودے پور میں ایک دن کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے۔ اس کے آخری مصرعے یوں ہیں۔

آسمان ہمیں مٹاتا ہے
پانی ہمیں جلاتا ہے
میری آنکھیں کھلتی ہیں
اور میں دیکھتا ہوں
آج رات بہت سارے درختوں کا جنم ہوا ہے۔

کرشن جی اپنے عہد میں ایک لیجنڈ بن چکے تھے۔ اب ان کی تحریریں ادبی رسائل میں نظر نہیں آتیں۔ بازار میں بچی خریدی جاتی ہیں۔ ان کی عظمت کے اعتراف میں ان کی حیات میں ہی ایک شاندار جشن منایا گیا اور ایک بڑی رقم کی تھیلی بھی انہیں پیش کی گئی۔ اس جشن کی افتتاحی تقریر اندرا گاندھی نے کی۔ اور ساحر لدھیانوی نے کرشن جی کی مدح میں ایک نظم پڑھی۔ نظم کا پہلا مصرع تھا۔

کرشن نے وعدہ کیا تھا کہ وہ پھر آئیں گے

اس نظم میں اس تلمیح کے طرف اشارہ ہے جس کے مطابق دھرتی پر جب پاپ اور دکھ درد بڑھتے ہیں بھگوان کرشن نئے اوتار میں پرکٹ ہو کر سماج کو سدھارنے کی نئی دشا دکھاتے ہیں۔ یہ نظم دراصل جاں نثار اختر نے کہی تھی۔ مگر ان کے کسی مجموعہ میں یہ شامل نہیں ہے کرشن چندر کی عظمت اب کسی ادبی محفل میں شریک ہونے کے آڑے آتی ہے۔ وہ اب بڑے فنکشنوں میں ہی دور کا جلوہ بن کر دکھائی دیتے ہیں۔ کتابوں پر دیباچے لکھتے ہیں، جلسوں میں

تقریریں فرماتے ہیں اور اپنے گھر میں ہندی اُردو کے ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کی محفلیں سجاتے ہیں۔ جن کے رپورتاژ سلمیٰ صدیقی قلم بند کرتی ہیں۔ اور دھرم ویر بھارتی انہیں جلی سرخیوں کے ساتھ دھرم یگ میں چھاپتے ہیں۔

کرشن چندر کے برعکس راجندر سنگھ بیدی اپنے آپ کو ادب کی مقامی چہل پہل سے دور نہیں ہونے دیتے۔ وہ ہر محفل میں کسی سردار پگڑی، رنگی ہوئی داڑھی اور نئے نئے لطیفوں کے ساتھ نظر آجاتے ہیں۔ ان کی تخلیقی رفتار کرشن جی کے مقابلہ میں کم ہے۔ کرشن قلم برداشتہ لکھتے ہیں۔ ان کی تحریر اور قلم کے درمیان وقت حائل نہیں ہوتا۔ ایک بار لکھ کر دوبارہ دیکھنے کی نہ ان کے پاس فرصت ہے نہ انہیں اس کی عادت ہے۔ حضرت جی غمگین دہلوی کی حمد کا ایک مطلع ہے۔

حمد ہے میں نے جو کلام کیا　　　میں نے یوں حمد کو تمام کیا

بیدی کا لکھنے کا طریقہ مختلف ہے۔ وہ قلم کی سیاہی اور کاغذ کا جی کھول کر استعمال کرتے ہیں۔ وہ تھم تھم کر لکھتے ہیں۔ وہ ایک ہی تحریر کو کئی بار لکھ کر مطمئن ہوتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں جملے صرف چست اور تہ دار ہی نہیں ہوتے بلکہ نظم کے مصروں کی طرح ہر جملہ کہانی کے لئے ضروری بھی ہوتا ہے۔ کتابت یا طباعت کی تھوڑی سی کمی بیشی بھی اس میں کجی پیدا کر دیتی ہے۔

کہتے ہیں مشہور ناول مادام بوویری کو فلابیر نے کئی بار تراش خراش کے عمل سے گذار کر پبلشر کے حوالے کیا تھا۔ جب وہ شائع ہوا تو اسے فرانسیسی ادب کی تاریخ میں ایک اہم ادبی واقعہ قرار دیا گیا۔ اس عہد کے مستند نقادوں نے اس کی اہمیت کا اقرار کیا۔ لیکن فلابیر کی خود کی رائے اس کے بارے میں دوسروں سے مختلف تھی۔ اس نے کہا تھا۔ کاش میرے پاس اتنی دولت ہوتی کہ میں کتاب کی ساری کاپیاں خرید سکتا اور اسے نئے سرے سے دوبارہ لکھ کر شائع کرواتا۔

راجندر سنگھ بیدی بھی اپنی تخلیقات کو اپنے سے دور رکھ کر دیکھنے کے قائل ہیں۔ ان

کے تخلیقی عمل میں، تخلیق کار کے ساتھ ایک سخت ناقد بھی ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ وہ ادب کے بازار سے زیادہ اپنے معیار پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اسی لئے ان کا فن بتدریج ارتقا کا فن ہے بیدی نے انسانی رشتوں کی پیچیدگیوں کو جس دروں بینی کے ساتھ وسیع تہذیبی تناظر میں جانا پہچانا ہے۔ وہ اردو کے افسانوی ادب میں ایک نئی منزل کا سراغ ہے۔!

ممبئی میں بیدی سے ندا کی پہلی ملاقات تاڑدیو میں انکے فلم کے آفس میں ہوئی تھی۔ 'لفظوں کا پل' کے بعد ندا کی دوسری کتاب ملاقاتیں کے نام سے حال ہی میں نیو رائٹر پبلیکیشن کے ادارہ سے شائع ہوئی تھی۔ یہ ادارہ ندا نے ابراہیم نذیر کے تعاون سے قائم کیا تھا۔ اس ادارہ کا اشاعتی پروگرام کافی لمبا چوڑا تھا۔ لیکن حالات نے وقت سے پہلے اسے بند کر دیا۔ ملاقاتیں جب چھپ کر بازار میں آئی، تو ادارہ کی طرف سے بھنڈی بازار اور کرلا میں بڑے بڑے پوسٹر چسپاں کئے گئے۔ ان پوسٹروں میں جو عبارت درج تھی وہ یوں تھی۔

''ہو سکتا ہے ان ملاقاتوں میں کچھ چہرے آپ کے شناسا ہوتے ہوئے بھی آپ کی پہچان میں نہ آئیں۔ یہ بھی ممکن ہے آپ کو بھی دور سے دیکھے ہوئے ان چہروں کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ نہ ملا ہو۔

ان چہروں میں کچھ جدید ادیبوں کے ساتھ سردار جعفری، اختر الایمانؔ، خواجہ احمد عباس، جاں نثار اختر، ساحر لدھیانوی اور کیفی اعظمی جیسے مشہور نام بھی شامل ہیں۔ اس کتاب نے اس میں شامل بیشتر ادیبوں اور شاعروں کو کتاب کے مصنف کا مخالف بنادیا۔ محمد حسن نے اپنے رسالہ عصری ادب کے ایک شمارہ میں کسی کے نام سے ایک تبصرہ چھاپا جس میں ترقی پسند ادیبوں کے تعلق سے ندا فاضلی کے گستاخانہ اور رجعت پسندانہ رویہ پر کافی لعن طعن کی گئی۔ اس کتاب کے بارے میں عام رائے بھی اچھی نہیں تھی۔ ندا کام کی تلاش میں اپنے ایک دوست جگدیش سدھانہ کی معرفت بیدی سے ملتا ہے اور تعارف کے طور پر اپنی نئی کتاب انہیں پیش کرتا ہے۔ بیدی اس کے بارے میں پہلے سے سن چکے تھے۔ دوسروں کی طرح ان کی طنزیہ مسکراہٹ بھی ندا کے پاگل ہونے کی تصدیق کرتی ہے۔

ندا نے جب ان سے اپنی ضرورت کا اظہار کیا تو انہوں نے منہ میں نئی گلوری رکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ دیکھو بھائی میں جو فلم دستک کے نام سے بنا رہا ہوں۔ وہ ابھی دس تک ہی ہے بارہ تک نہیں پہونچی ہے۔ یعنی وہ تین چوتھائی بن چکی ہے۔ اس میں گیت مدن موہن کے ساتھ مجروح لکھ رہے ہیں اور مکالمے اور منظر نامہ میرے ہیں۔ تمہارے لئے اس میں بس ایک ہی کام نکل سکتا ہے۔ ابھی ابھی میں نے ایک سین لکھا ہے اس میں تمہیں ایک رول دیا جاسکتا ہے۔ ندا رول کے لفظ سے چونکتے ہوئے انہیں دیکھتا ہے۔ وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہیں۔

یہ سین ایک پاگل خانہ کا ہے۔ اس میں کئی پاگل کردار ہیں۔ اگر تم چاہو تو ان میں سے ایک تم بھی ہو سکتے ہو۔ ندا کو ان کی بات زیادہ بری نہیں لگی۔ ہر کسی سے بار بار ایسی باتیں سننے سے ان کی نشتریت اب کند ہو چکی تھی۔ اس نے صرف اتنا کہا۔ بیدی صاحب پاگل ہونے اور پاگل کی ایکٹنگ کرنے میں بہت فرق ہے۔ میں اس کام کیلئے شاید موزوں نہیں ہوں۔ آپ کو فرصت ملے تو اس کتاب کو ضرور پڑھیے۔ میرے لئے آپ کی رائے کی زیادہ اہمیت ہے۔"

ندا نے بیدی کی پیش کش قبول نہیں کی لیکن بیدی نے ندا کی کتاب پڑھنے کی فرصت بھی نکالی اور ایک ادبی محفل میں اپنی رائے کا اظہار بھی کیا۔ بیدی کی رائے انکے دیگر ہم عصروں سے مختلف بھی ہے، اور اس میں نئے لکھنے والوں کے ساتھ ان کے رویہ کا اظہار بھی ہے۔ تصدیق سہاوری نے اُن کی رائے کو اپنی کتاب بحث و تکرار، میں یوں قلم بند کیا ہے۔

"ہمارے ایک ادیب ہیں، ندا فاضلی انہوں نے 'ملاقاتیں' لکھی ہے۔ یہ کتاب میری نظر سے گذری ہے۔ مجھے بہت ہی شگفتگی کا احساس ہوا کہ جس طرح سے عام طریقہ سے لکھا جاتا ہے وہ اس سے الگ ہے۔ الفاظ وہی ہیں۔ وہی کلپنا، وہی گرامر لیکن اپنی شخصیت کے زور سے اتنا خوبصورت شگفتہ تاثر پیدا کیا ہے، کلاس کیت سے واقف ہونا ضروری ہے۔ نئی چیزوں میں کلاسیکت آجاتی ہے تو بڑی عمدہ بات ہے"

وہ دن ندا کی اقتصادی پریشانیوں کے تھے۔ نہ رہنے کی کوئی مناسب جگہ، نہ کھانے پینے

کا کوئی ڈھنگ کا انتظام صبح سے شام تک ادھر ادھر بھٹکنا اور رات کو دیر سے اس بستر تک پہونچنا جو لیٹتے ہی کرائے کا تقاضہ شروع کردیتا تھا۔ ایسے مخالف حالات میں یہ چند موافق جملے اس کی خود اعتمادی کو بحال کرنے میں کافی مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اگتے ہوئے پودوں کو وقت پر مناسب مٹی پانی اور ہوا نہ ملے تو وہ مرجھا جاتے ہیں۔

بیدی اور کرشن ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے ایک دوسرے سے کم ہی ملتے ہیں۔ دونوں کی ایک دوسرے سے کئی شکایتیں ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کرشن جی ان شکایتوں کو ادب و زندگی سے جوڑ کر اسے ترقی پسندی کا مسئلہ بنا کر اپنی محفلوں میں بار بار دہراتے ہیں۔ اور بیدی انہیں لطیفوں کا روپ دے کر خود بھی ہنستے ہیں اور دوسروں کو بھی ہنساتے ہیں۔ بیدی کرشن کے ادب پر خود کوئی رائے دینے سے احتیاط برتتے ہیں۔ لیکن ممبئی کے وہ نئے پرانے ادیب جو ان کی شہرت طلبی یا عوامی ترقی پسندی پر معترض تھے۔ انہیں اپنا ہم مزاج ضرور سمجھتے تھے۔ ان کے اِن ہم مزاجوں میں مدھوسدن اور باقر مہدی بھی شامل تھے۔

بیدی کا اپنی کہانیوں کے کرداروں سے رشتہ گھر کے افراد جیسا ہوتا ہے۔ وہ لکھتے وقت بھی ان کے دکھ سکھ میں شریک رہتے ہیں اور جب کہانی سناتے ہیں تو انہیں کے ساتھ ہی کبھی ہنستے ہیں کبھی زار زار روتے ہیں۔ بیدی کے پاس اپنے ہم عصروں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ آنسوؤں کا ذخیرہ تھا۔ اس ذخیرہ کو انہوں نے اپنے کرداروں پر اس طرح خرچ کیا کہ جب خود پر رونے کا وقت آیا تو انکے پاس کوئی آنسو نہیں تھا۔ جب آنسو ختم ہو جاتے ہیں تو آدمی ہنسنا بھی بھول جاتا ہے۔ ایسی ہی حالت میں ایک دن کھار میں اپنے گھر کے سامنے بیدی تنہا کھڑے نظر آجاتے ہیں۔ ندا کو انہیں پہچاننے میں تھوڑا وقت لگتا ہے۔ طویل بیماری نے ان کے سر سے پگڑی اور ڈاڑھی سے خضاب چھین لیا تھا۔ ندا کو دیکھتے ہی انہوں نے کہا

"یار بہت اکیلا محسوس کرتا ہوں میں۔ سارے دوست غائب ہو گئے ہیں۔ کوئی ملنے نہیں آتا۔ وقت ہو تو کچھ دیر میرے ساتھ بیٹھو۔"

ندا ان کے ساتھ دوسری منزل میں ان کے کمرے میں جاتا ہے۔ بیدی خاموش ہیں۔ ندا اس خاموشی میں کبھی چاروں طرف شیلفوں میں رکھی کتابوں کے نام پڑھتا ہے۔ کبھی میز پر آدھے لکھے کاغذ پر رکھے ہوئے کھلے قلم کو دیکھتا ہے۔ کبھی ہاتھ میں تسبیح لئے گرونانک کی تصویر کے نیچے بیٹھے ہوئے بیدی کو دیکھتا ہے۔ اچانک اسے محسوس ہوتا ہے بہت سارے قہقہے شریر بچوں کی طرح کمرے میں گھس آئے ہیں۔ زندگی سے بھرپور ان اجلے اجلے قہقہوں میں گرونانک کی آنکھیں، انگریزی اردو، پنجابی اور ہندی کی کتابیں، دیوار پر ٹنگی پگڑی سب شامل ہو جاتے ہیں۔ ان کیساتھ ہی اپنی تصویر سے نکل کر پہلے کے بیدی بھی جب وہ تندرست تھے، جب وہ پان کھاتے تھے اور سگریٹ پر سگریٹ سلگاتے تھے، بات بات پر قہقہے لگاتے تھے شریک ہو جاتے ہیں۔ بیدی ہنس رہے ہیں اور ہر ہنسی کے ساتھ وہ اپنا لباس اور وقت بھی تبدیل کرتے جاتے ہیں۔ ہر لباس کے ساتھ ان کے قہقہوں کا وقفہ اور کھنک بھی بدلتی جاتی ہے۔

سردار جعفری کے سہ ماہی گفتگو، کے لئے اپنی نئی کہانی پوسٹ کر کے وہ فون پر تاکید کرتے ہیں۔ ”سردار تمہارے کہنے پر میں نے ایک کہانی تمہیں بھیج تو دی ہے۔ لیکن میری خواہش ہے کہ تم اسے گفتگو کے گفت کے حصہ میں چھاپو اسکے دوسرے حصہ میں استعمال نہ کرو۔ اس کے لئے تمہیں اور بہت سے مل جائیں گے...... قہقہہ

فلم دستک مکمل ہو چکی ہے۔ اس کی ٹرائل میں ایک پنجابی ڈسٹری بیوٹر فلم میں کہانی کی دھیمی اسپیڈ سے اکتا کر پاس بیٹھے ہوئے فلم ساز اور ہدایت کار بیدی سے پوچھتا ہے۔ اجی بیدی صاحب اس فلم میں لڑائی وڑائی نہیں ہے۔ بیدی نہایت سنجیدگی سے کہتے ہیں۔ اس میں تو نہیں ہے، فلم کے ختم ہونے کے بعد باہر آیئے، ہم آپ لڑلیں گے۔ قہقہہ

اپنی فلم گرم کوٹ کے فلاپ ہو جانے کے بعد بیدی نئی فلم کا پلان بناتے ہیں اور ان دنوں کے کامیاب ہیرو بھارت بھوشن کو سائن کرنے ان کے گھر جاتے ہیں۔ گھنٹی بجانے پر دروازہ کھلتا ہے۔ بیدی پوچھتے ہیں۔ بھارت جی ہیں؟ دروازہ کھولنے والا کہتا ہے۔ وہ تو یہاں

سے شفٹ ہو گئے جی...... بیدی مسکراتے ہوئے اس سے کہتے ہیں۔ کمال ہے گرم کوٹ میری فلاپ ہوئی اور شفٹ انہیں ہونا پڑا...... قہقہہ

اختر الایمان کے پاس ایک بڑا سا السیشین کتا ہے۔ جس کے ساتھ وہ صبح اور شام پابندی سے پیڈ اسینڈ پر چہل قدمی کے لئے نکلتے ہیں بیدی ان سے فون پر پوچھتے ہیں۔ اختر میں شام کو تمہارے گھر آنا چاہتا ہوں۔ یہ بتاؤ تمہارا کتا تمہیں ٹہلا کر کب واپس لاتا ہے۔ قہقہہ

بیدی مسلسل قہقہوں سے تھک کر اپنی بیماری کے ساتھ ندا کے سامنے پھر سے اپنی موجودہ صورت میں بیٹھ جاتے ہیں۔ کئی لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ ویران آنکھوں سے ندا سے پوچھتے ہیں۔ آج کل کیا کر رہے ہو۔ کوئی کام ملا تمہیں؟ ندا جواباً کہتا ہے کام تو ملا، لیکن اب تک جتنی فلمیں ریلیز ہوئیں ان میں سے کوئی چلنے کی طرح نہیں چلی...... بیدی آہستہ سے کہتے ہیں۔ اچھا ہی ہے۔ جو فلموں میں چل جاتا ہے ادب سے نکل جاتا ہے...... یہ جملہ بول کر وہ کتابوں کے شیلف کے اس حصہ کی طرف دیکھنے لگے جہاں ان کی کتابیں سلسلہ وار رکھی ہوئی ہیں۔ دانہ ودام، گرہن، ایک باپ بکاؤ ہے، دستک، ایک چادر میلی سی...... کتابیں دیکھتے دیکھتے ان کی نظر میز پر ادھ لکھے کاغذ پر پڑتی ہے اور اسکے ساتھ ہی وہ کہتے ہیں۔ میں ایک ایسے آدمی کی تلاش میں ہوں جو میرے ساتھ بیٹھ سکے، میں بولوں اور وہ اسے لکھ سکے! اور میری ساری ادھوری کہانیاں پوری کر سکے:

وہ جو
پھٹے پرانے جوتے گانٹھ رہا ہے
وہ بھی میں ہوں

وہ جو
گھر گھر دھوپ کی چاندی بانٹ رہا ہے
وہ بھی میں ہوں

وہ جو

اڑتے پروں سے امبر پاٹ رہا ہے
وہ بھی میں ہوں
وہ جو
ہری بھری شاخوں کو کاٹ رہا ہے
وہ بھی میں ہوں

سورج چاند نگاہیں میری
سال مہینے راہیں میری
کل بھی مجھ میں
آج بھی مجھ میں
چاروں اور دِشائیں میری

اپنے اپنے آکاروں میں
جو بھی چاہے بھر لے مجھ کو
جس میں جتنا سما سکوں میں
اتنا اپنا کر لے مجھ کو

ہر چہرہ ہے میرا چہرہ
بے چہرہ اک درپن ہوں میں
پل پل روپ بدلنے والی
مٹی ہوں میں
جیون ہوں میں

بیدی کی رہائش گاہ اب ایک کلب کی شکل لے چکی ہے۔ اس جوے کے کلب کی دیکھ بھال ان کی بہو کرتی ہے۔ بیدی کی ساری کتابیں ایک مقامی لائبریری میں منتقل ہو چکی ہیں۔

☆☆☆

ممبئی کے ادبی ماحول میں، راہی معصوم رضا کی آمد کی خبر کی گونج ہے۔ یگانہ پر ان کی اہم تنقیدی کتاب، طلسم ہوش ربا پر انکا مقالہ، ان کے شعری مجموعے 'میں ایک پھیری والا' اور اجنبی شہر اجنبی راستے اور ان کے ساتھ 'آدھا گاؤں' جس کو آزادی کے بعد ہندی کے چند بہترین ناولوں میں شامل ہونے کا اعزاز حاصل ہے ان کی ادبی شناخت کے معتبر زاویے ہیں۔ ان کا یہ ناول کئی یونیورسٹیوں میں ہندی نصاب میں بھی ہے۔ بلونت سنگھ کے ناول دو اکال گڈھ کی مانند، اس سے بھی اردو والے کم واقف ہیں۔ اگر یہ اردو میں شائع ہوتا تو اردو کے گنتی کے ناولوں کی فہرست میں ایک کا اور اضافہ ہوتا ہے راہی خوش شکل، خوش لباس اور خوش مزاج انسان تھے۔

ایک زمانے میں مشاعرہ کے مقبول شاعر بھی تھے۔ جس محفل میں ہوتے اپنی خوش گفتاری سے مردوں سے زیادہ خواتین کو متوجہ کرتے۔ یوں تو داغ کی طرح ان کے نامۂ اعمال میں کئی پردہ نشینوں کے نام ہیں۔ لیکن ان کا آخری عشق جس کے لئے انہیں علی گڑھ چھوڑنا پڑا، اور جو عمر بھر ان کا ہم سفر رہا، اس نے ایک زبانی معاہدہ کے تحت ان پر کئی پابندیاں عائد کی تھیں۔ راہی جب ممبئی آئے تھے تو ان پابندیوں کے کڑے حصار میں تھے۔ وہ نہ اب مشاعروں میں کلام سنا سکتے تھے، نہ ادبی نشستوں میں اپنی گفتگو کا جادو جگا سکتے تھے۔ جن لوگوں کو اس خفیہ

ایجنڈے کا علم نہیں تھا۔ وہ ان سے ملنے جاتے ہیں، مدعو کرتے ہیں۔ لیکن ہر بار مایوس ہوتے ہیں۔ وہ اب جس راہ کے راہی ہیں اس کی منزل فلم انڈسٹری ہے۔ بھارت بھوشن کے بڑے بھائی فلم ساز آر چندرا ان کے سرپرستوں میں تھے۔ یہ وہی آر چندرا ہیں جنہوں نے میگھ ملہار بنائی تھی اور جس کی ناکامی کی وجہ سے بھارت بھوشن کو اپنے کشادہ بنگلے سے شفٹ ہو کر باندرہ لنکنگ روڈ کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں بسیرا کرنا پڑا۔ فلم انڈسٹری میں ایسے اتار چڑھاؤ روز کے تماشے ہیں۔

بابو راؤ اور بھگوان کی فلموں کی ایک زمانے میں بڑی دھوم تھی۔ ندا کے طالب علمی کے زمانہ میں اس جوڑی کے طلباء بہت عاشق تھے۔ کالج سے چھوٹنا اور بھگوان دادا کی کامیڈی اور بابو راؤ کی مار پیٹ سے بھرپور فلموں کے میٹنی شو دیکھنا، ان دنوں روز کا معمول تھا۔ اس جوڑی کے بابو راؤ کی لاش کو چیمبور میں چندہ سے اگنی کے سپرد کیا گیا۔ اور بھگوان دادا جو ایک زمانے میں پورے اسٹوڈیو کے مالک تھے، دادر اب میں ایک کھولی میں رہتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا جب ڈانسر ککو فلم کے تماش بینوں کے دل کی دھڑکن تھی۔ اس کا ڈانس فلموں کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا وہ جب لچکتی تھی تو دنیا اس کے ساتھ مٹکتی تھی۔ وہ طویل بیماری سے ٹوٹ پھوٹ کر، دوسروں کے رحم و کرم کی محتاج بنتی ہے اور اسی حالت میں اپنی تنہائیوں کا شکار ہو کر اللہ کو پیاری ہو جاتی ہے۔

این دتہ اپنے زمانے کے مشہور میوزک ڈائریکٹر تھے۔ ساحر لدھیانوی کے ساتھ فلم دھول کا پھول میں ان کی موسیقی کا ملک کے کونے کونے میں ہنگامہ تھا۔ 'تو ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا' اس فلم کا مقبول ترین گیت تھا۔ ایک دن آر ڈی برمن کے میوزک روم میں راج کپور کی فلم بیوی او بیوی کی سٹنگ تھی۔ اس فلم کے گیت ندا لکھ رہا تھا۔ اچانک گٹار، ہارمونیم اور ڈھولک کے آرکسٹرا میں باہر کی چیخ پکار کی آوازیں شامل ہو گئیں۔ یہ آوازیں این دتہ کی تھیں۔ وہ شراب کے لئے کچھ پیسے لینے اندر آنا چاہتے تھے۔ اور چوکیدار انکا حلیہ دیکھ کر انہیں اس کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ آر ڈی برمن کو جب

معلوم ہوا تو انہوں نے کچھ نوٹ دے کر انہیں باہر ہی سے رخصت کر دیا۔ ناسخ نے خوب کہا ہے۔

بگڑتے جاتے ہیں لاکھوں، ہزاروں بنتے جاتے ہیں
جہاں میں رات دن جاری خدا کا کارخانہ ہے

راہی جو بننا چاہتے تھے اس کے لئے انہوں نے ہر ممکن حربہ استعمال کیا۔ نئے نئے اختلافی مسئلے اٹھا کر لوگوں کو متوجہ کیا۔ ان میں ایک اردو رسم الخط کی مخالفت اور ناگری لپی کی وکالت تھا۔ دھرم ویر بھارتی کی ادارت میں دھرم یگ نے اس کو کافی ہوا دی۔ اور وہ ممبئی آنے کے کچھ دن بعد ہی ہر محفل میں بحث و مباحثہ کا موضوع بن گئے۔ اردو والے دشنام طرازی پر اتر آتے ہیں، ہندی اخبار اور رسالے ان کی روشن خیالی کے قصیدے گاتے ہیں۔ آزادی کے بعد ہندوستانی سیاست نے اردو اور ہندی کو جو مذہبوں سے جوڑنے کی بھول کی تھی، اور اردو کو مسلمان اور ہندی کو ہندو بنا دیا تھا، راہی اس سیاست سے خوب کھیلے۔ اس کھیل میں جو پتے ان کے ہاتھ میں تھے انہیں وہ قومی یکجہتی کے علامتوں کی طرح کھیل رہے تھے۔ یہ اور بات ہے ان کی قومی ایکتا کا تصور دوآبے تک محدود تھا۔ اس میں تمل، کنڑ، کشمیری، ڈوگری، مراٹھی، گجراتی، بنگالی وغیرہ کے علاقے شامل نہیں تھے۔ جو اپنے لسانی کردار اور لپی کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہوئے بھی ہماری وراثت کا حصہ ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان کی تقسیم جس دو قومی نظریہ کی بنیاد پر عمل میں آئی، وہ بھی اسی خطہ کی دین تھی۔ جس کا ثبوت برصغیر کی تقسیم کے کچھ سال بعد پاکستان ہی میں بنگالی مسلمانوں کا لسانی اختلاف تھا جو ہم مذہب ہونے کے باوجود اپنے تہذیبی تشخص کی قربانی دینے کو تیار نہیں تھے۔ راہی ذہین آدمی تھے۔ لیکن ان کی ذہانت لسانی مسائل کو وسیع تناظر میں رکھ کر دیکھنے سے قاصر تھی۔ یہ بھی ممکن ہے انہوں نے اپنی اس سوچ کو سوچے سمجھے پلان کے مطابق اپنی ضرورت بنا لیا ہو۔ ان کے اس عمل نے جو راستہ کھولا تھا اس پر وہ اتنے آگے نکل گئے کہ انہوں نے اردو میں لکھنا ہی ترک کر دیا۔ اجنبی شہر اجنبی راستے (اردو) کے بعد ان کا شعری مجموعہ "میں اک

پھیری والا" صرف ہندی میں ہی شائع ہوا۔ اس میں دیباچہ دھرم ویر بھارتی نے لکھا ہے۔ انہوں نے اپنا اہم ناول آدھا گاؤں بھی صرف ناگری لپی کے قارئین کے لئے لکھا۔ دوسرے ناول جن میں ٹوپی شکلا، ہمت جون پوری اور کٹرا بی آرزو اہم ہیں، بھی اُردو رسم الخط میں شائع نہیں ہوئے۔ راہی کے اس رویہ کو سراہتے ہوئے دھرم ویر بھارتی نے اپنی پستک شبد تا میں لکھا ہے۔ "کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سردار جعفری جیسے کٹر پنتھیوں میں ایک راہی معصوم رضا تھے جو اپنی مول مانیہ تاؤں پر اڈگ کھڑے رہے"۔ دھرم ویر بھارتی کی اس رائے کو انہوں نے فلم انڈسٹری خوب کیش کیا۔

راہی نے آدھا گاؤں میں اپنے بارے میں لکھا ہے

"مجھے جھوٹ میں سچ اور سچ میں جھوٹ کی ملاوٹ کی کلا آتی ہے"

راہی کی اس کلاکاری نے خوب گل کھلائے، اس کے ذریعہ مشکل کے دنوں میں انہوں نے پیسے بھی کمائے، فلم انڈسٹری میں اپنے پاؤں بھی جمائے اور اُردو کے اُن نقادوں کے قرض بھی چکائے جنھوں نے نہ کبھی ان کی شاعری کو مانا تھا اور نہ ان کی تنقید کو گردانا تھا۔ جب وہ 'وہ' بن گئے جو انہیں بننا تھا تو وہ ادبی محفلوں میں بھی آنے لگے، مشاعروں میں شعر بھی سنانے لگے اور اُردو رسم الخط میں اپنی شاعری بھی چھپوانے لگے۔ ان کا نیا شعری مجموعہ 'غریب شہر' ہے۔ جو اُردو میں چھپا ہے اور جس میں انکے مخصوص انداز و اسلوب کی کئی اچھی نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ ان نظموں کی امیجری گھریلو اور زمینی ہے۔ ان میں ہندی کا رس بھی ہے اور اُردو کا جس بھی ہے اس کتاب کو انہوں نے اپنی اکلوتی بیٹی مریم کے نام منسوب کیا ہے۔ اس کے انتساب میں انہوں نے لکھا ہے۔

مریم بیٹی تم ممبئی میں پیدا ہوئی تھیں اور یہ شاعری بھی میرے ممبئی آنے کے بعد کی ہے۔ اس لئے یہ مجموعہ تمہارے نام کرتا ہوں۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے، راہی جب اُردو رسم الخط کی مخالفت سے اُردو کی موافقت کی طرف آئے تو ان کی بیٹی بھی سردار جعفری، کیفی آعظمی، راجندر سنگھ بیدی وغیرہ کے بچوں کی طرح اُردو سے کوسوں دور ہو چکی تھی۔

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

ممبئی میں راہی نے دوسو سے زیادہ فلموں کے لئے مکالمے اور منظر نامے لکھے۔ مشہور سیریل مہابھارت میں انکے مکالموں میں جملوں کی ساخت اور ان میں لفظوں کے چناؤ کی سلیقہ مندی سے دوباتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ پہلی یہ کہ اچھی نثر لکھنے کے لئے لکھنے والے کا اچھا شاعر ہونا بھی ضروری ہے۔ اور دوسری یہ کہ اُردو اور ہندی اپنی اپنی لپیوں میں پرورش پائیں تو ایک دوسرے کی طاقت بن سکتی ہیں۔ راہی کی زبان کا حسن اسی امتزاج کی دین ہے۔

ممبئی کو راہی ضرور راس آئے لیکن راہی کو ممبئی کبھی راس نہیں آئی۔ وہ ممبئی میں رہتے ہوئے اپنے خالی لمحوں میں غازی پور (اتر پردیش) میں گھومتے پھرتے نظر آتے تھے۔ انہیں ممبئی نے جتنا دیا اس سے کہیں زیادہ چھین بھی لیا۔ جس کا ماتم وہ ممبئی میں لکھی ہر تحریر میں کرتے نظر آتے ہیں راہی اپنی نظم 'مرثیہ' میں اس درد کو یوں لکھتے ہیں۔

ایک چٹکی نیند کی ملتی نہیں
اپنے زخموں پر چھڑکنے کے لئے
ہائے ہم کس شہر میں مارے گئے
گھنٹیاں بجتی ہیں
زینہ پر قدم کی چاپ ہے
پھر کوئی بے چہرہ ہوگا
منہ میں ہوگی جس کے مکھن کی زباں
سینے میں ہوگا جس کے
اک پتھر کا دل
مسکرا کر
میرے دل کا اک ورق لے جائے گا......!

راہی نے یہاں آکر جو کھویا تھا اس کا انہیں احساس تھا۔ ان کے بیشتر ہم عصر تو ممبئی کی چمک دمک میں کبھی کبھی کے اس احساس کو بھی گنوا چکے ہیں۔

گھر کو کھوجیں رات دن، گھر سے نکلے پاؤں
وہ رستہ ہی کھو گیا جس رستہ تھا گاؤں

☆☆☆

ندا سردار جعفریؔ کے سہ ماہی گفتگو میں کام کر رہا تھا۔ اس کے دوسرے شمارہ میں فراق گورکھپوریؔ پر ایک گوشہ پلان کا کیا گیا تھا۔ فراقؔ پر مضمون کے لئے ظ۔ انصاری سے کہا جاتا ہے۔ وہ راضی ہو جاتے ہیں۔ سردار جعفریؔ اس کی اطلاع فراق صاحب کو دیتے ہیں۔ فراقؔ کا مختصر سا جواب آتا ہے۔

'انہوں نے مجھ سے پہلے کے حضرات پر کیا لکھا ہے، جو مجھ پر لکھنا چاہتے ہیں'۔

فراق کے خط سے پہلے ظ۔ انصاری مضمون تحریر کر چکے تھے۔ جعفریؔ صاحب جب انھیں فراقؔ کا خط دکھاتے ہیں، تو وہ اپنا مضمون واپس لے جاتے ہیں۔ اور فراقؔ صاحب کے طنز کے جواب میں مضمون کو دوبارہ گھٹا بڑھا کر لاتے ہیں۔ اس بار مضمون کا عنوان فراقؔ ہی کی ایک مشہور غزل کی ردیف، پھر بھی......! ہوتا ہے۔ مضمون اب صرف تعریفی نہیں رہا اس میں طنزیہ تیور بھی شامل ہو گئے تھے۔

جشن غالبؔ کے جلسہ میں ظ۔ انصاری تقریر کر رہے ہیں۔ سامعین سے کھلے میدان کی ساری کرسیاں بھری ہوئی ہیں۔ ندا باقر مہدیؔ کے ساتھ اسٹیج کے دائیں طرف پہلی صف میں بیٹھا ہے۔ ظ۔ انصاری بہت اچھے مقرر تھے۔ ان کی تقریر ایک ساتھ عامیانہ، عالمانہ، اور اداکارانہ ہوتی تھی۔ عوام کو باندھے رکھنے میں وہ آواز، الفاظ اور انداز تینوں سے کام لیتے تھے۔ موضوع پر آنے سے پہلے، وہ اپنی مصروفیات کے تعلق سے چند تمہیدی جملوں سے تقریر کا آغاز کرتے ہیں۔ جملے سے جملہ تراش رہے تھے۔ سب ہمہ تن گوش تھے۔

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ آج کل اردو دنیا پر غالبؔ ہیں۔ ہر چھوٹے بڑے شہر میں جلسے

منعقد کیے جارہے ہیں۔ یوں سمجھئے اس وقت جو میں آپ کے سامنے کھڑا ہوں، یہ صرف آپ حضرات کے ذوق وشوق کا احترام ہے ورنہ ظ انصاری جس ناچیز کا نام ہے، اسے آج کلکتہ میں ہونا تھا۔ اور اگر کلکتہ میں نہیں ہوتا تو واجد علی شاہ پیا کی بارہ دری میں ہوتا۔ اگر وہاں بھی نہیں ہوتا تو دلّی جو ایک شہر ہے عالم میں انتخاب میں ہو سکتا تھا۔ لیکن مجھے جہاں ہونا چاہئے تھا وہاں میں ہوں۔ ظ انصاری کے جملوں میں کئی بار ہونا اور ہوتا کی تکرار کو سن کر باقر مہدیؔ برجستہ غالبؔ کے ایک شعر کے آدھے مصرع کو اپنی اصلاح کے ساتھ ہوا میں اچھالتے ہیں ڈبویا تجھ کو ہونے نے'۔ ساری محفل قہقہہ زار بن جاتی ہے۔ ظ انصاری ایک پل کو خاموش ہو کر پھر سے شروع ہوتے ہیں......

سبحان اللہ کلام غالبؔ پر اصلاح کی جرأت ہمارے باقر مہدی کے علاوہ اور کون کر سکتا ہے۔ محفل میں دوبارہ پہلے سے زیادہ شور بھری تالیاں گونج اٹھتی ہیں۔

سورج غروب ہوتے ہی حسب معمول، بھنڈی بازار میں استاد خلیل کا غیر شادی شدہ کمرہ نئے پرانے ادیبوں اور شاعروں کی تلخ ذائقہ ٹھرّے سے مہمان نوازی کر رہا تھا۔ قاضی سلیم اپنی نئی نظم سنا رہے تھے۔ ان کی ایک عادت تھی۔ وہ جب نظم پڑھتے ہوئے کہیں سے بھولتے تھے تو خاموش ہو کر جیب سے قلم نکال کر اسے کسی کاغذ پر لکھنے لگتے تھے۔ جب پوری نظم کاغذ پر اتر آتی تھی تو اسے پھر شروع سے سناتے تھے۔ ان کے لکھنے کے دوران، اگر کوئی نادان جوان کے اس عمل سے ناواقف ہوتا تھا کسی اور سے سنانے کی فرمائش کر بیٹھتا۔ تو وہ اسے اپنی ہتک سمجھ کر یا تو ناراض ہو کر محفل چھوڑ کر باہر چلے جاتے تھے یا فرمائش پر سنانے والے کو اس کی ادبی اوقات سے متعارف کراتے تھے۔ اس بار ان کے طنز کا نشانہ ندا فاضلی تھا باقر ندا کے دفاع میں قاضی سلیم سے الجھ جاتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ محفل بکھر کے وقت سے پیشتر رخصت ہو، ظ۔ انصاری داخل ہوتے ہیں۔ اور ان کے آتے ہی ماحول پھر پہلے جیسا ہو جاتا ہے۔ ظ۔ انصاری کی زبان اور انداز بیان اچھے اچھوں کی منہ زوریوں کو بے لگام نہیں ہونے دیتے۔ وہ جب چاہتے ہیں محفل کو متوجہ کر لیتے ہیں۔ صرف باقر مہدی اس

دائرہ سے باہر ہیں۔ اب اختلاف ندا اور قاضی سلیم کو چھوڑ کر، ظ انصاری اور باقر مہدی کے درمیان بیٹھ جاتا ہے۔ باقر کے مسلسل روکنے ٹوکنے سے بھی جب ان کی گفتگو کا تسلسل نہیں ٹوٹتا تو باقر سامعین کے اجتماع سے اپنے آپ کو اٹھا کر باہر لے جاتے ہیں، ان کے جاتے ہی ظ۔ انصاری مسکراتے ہیں اور چھوٹی سی خاموشی کے بعد فرماتے ہیں۔ ''یگانہ نے چنگیزی بن کر اپنی ذہانت کا نقصان کیا اور ہمارے محترم دوست اسی مزاج کو اپنا کر خود کو ضائع کر رہے ہیں،

چت بھی اپنی ہے پٹ بھی اپنی ہے ، میں کہاں ہار ماننے والا

ظ۔ انصاری ایک میں کئی ہیں۔ ایک ہی شخصیت میں وہ تھوڑے تھوڑے بہت سے ہیں۔ انہوں نے اپنے اندر چھوٹے بڑے کئی کابک بنا رکھے ہیں۔ کسی میں وہ صحافی ہیں، کسی میں مقرر ہیں، کہیں وہ ناقد ہیں کہیں محقق ہیں، کبھی وہ مترجم ہیں، کبھی وہ ایڈیٹر ہیں ان کی شخصیت کی شناخت کے اتنے حوالے ہیں کہ وہ کسی ایک زاویے سے پوری طرح پہچان میں نہیں آپاتے۔ انہیں اس کا گلہ بھی ہے۔ جس کا اظہار بھی وہ نشستوں میں اکثر کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے، ان کے متلون مزاج نے کسی بھی روپ میں انہیں اتنی دیر نہیں ٹھہرنے دیا کہ وہ دیکھنے والوں کی نظر میں اچھی طرح سما سکیں۔ کبھی وہ پشکن اور چیخوف کے ساتھ ٹہلتے ہیں کبھی خسرو اور غالبؔ کے ساتھ چلتے ہیں۔ کبھی روسی اُردو لغت میں ڈھلتے ہیں، کبھی روز کے ایڈیٹوریل میں قطرہ قطرہ پگھلتے ہیں۔ وہ زندگی کی متضاد سمتوں میں بہ یک وقت سفر کرنے کے شوقین تھے۔ لیکن یہ شوق سفر کسی منزل کے یقین کے بغیر جاری تھا۔ انہوں نے اپنے معاصرین میں، ''مقابلۃً'' زیادہ لکھا ہے۔ لیکن الگ الگ راہوں میں اپنی مسلسل سیاحت کے باوجود جو وصف انہیں دوسروں سے ممتاز کرتا ہے اور انکے بھٹکاؤ میں ٹھہراؤ کا حسن پیدا کرتا ہے وہ ان کی خوبصورت نثر کا انفرادی اسلوب ہے۔ وہ ایک صاحب طرز نثر نگار ہیں۔ جو اپنے لفظوں کے چناؤ اور ان کے سبھاؤ سے الگ سے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ اپنی اس خوبی سے واقف بھی ہیں۔ شاید اسی لئے وہ جتنا انصاف اپنے موضوع سے کرتے ہیں، اس سے کہیں زیادہ توجہ جملوں کی نوک پلک سنوارنے میں فرماتے ہیں۔

ان دنوں چرچ گیٹ کا اسٹیشن کھار یا باندرہ سے دور ہوتے ہوئے بھی کافی نزدیک محسوس ہوتا تھا۔ اس نزدیکی کی وجہ اسٹیشن کے ارد گرد کی فضا، کھلا سمندر اور ماحول تھا۔ اسٹیشن کے دائیں گیٹ کے باہر کی گلی میں کیڈل کورٹ کی دوسری منزل میں عصمت چغتائی کا بسیرا تھا۔ سامنے گیٹ کے باہر سڑک پار کر کے ایشیاٹک نام کی ایرانی ہوٹل تھی جہاں سورج ڈھلتے ہی، ادب مصوری اور موسیقی سے جڑے ہوئے کئی ہم عمروں کا روز کا ڈیرا تھا۔ ان میں جگجیت سنگھ، جتندر بلو، رام اروڑا اور ندا فاضلی روز کے ملنے جلنے والوں میں تھے۔

جگجیت سنگھ ابھی اکیلے تھے۔ ہوٹل میں کھاتے ہیں اور کسی سستے سے ہوسٹل میں رہتے تھے۔ گنگانگر سے وہ سر پر جو پگڑی اور منہ پر داڑھی لے کر آئے تھے وہ اب بھی انکے ساتھ تھی۔ ان کی آواز بہت خوبصورت ہے۔ لیکن یہ آواز بھی مہدی حسن کی گائی ہوئی غزلوں کو دہرانے تک ہی محدود ہے۔ ابھی انہیں جگجیت سنگھ بننے میں کافی دیر ہے۔ مہدی کی غزلیں گانا ہی انکا ذریعہ معاش تھا۔ وہ مستقبل جو آج ان کا حال بن چکا ہے ابھی ان سے کوسوں دور تھا۔ اسے قریب لانے کے لئے وہ رات دن جدو جہد کر رہے تھے۔

آج کے جیتندر بلو، اپنے پرانے نام بلو بیدل کے نام سے جانے جاتے تھے۔ اُردو کے افسانہ نگار۔ ماہنامہ شمع میں کہانیاں شائع ہو چکی تھیں۔ کسی ڈائریکٹر کے ساتھ اسسٹنٹ تھے۔ اپنے اس کام سے وہ مطمئن نہیں تھے۔ اس بے اطمینانی کا حل وہ ہندوستان سے ہجرت

کر کے کسی طرح لندن میں بس جانے میں ڈھونڈ رہے تھے۔

رام اروڑا ہندی کے کسی اخبار سے منسلک ہے اور کہانیاں لکھتا ہے۔ پاکستان کے بننے کے بعد، اس کے خاندان کو مجبوراً لاہور چھوڑ کر ہندوستان آنا پڑا تھا۔ اپنی زمین سے بچھڑنے کا یہ زخم ابھی پوری طرح مندمل نہیں ہوا ہے۔ وہ ہوش میں دوسروں کی طرح ہنستا ہے مسکراتا ہے لیکن بیئر کا ایک گلاس پیتے ہی، ہر گفتگو کو ہندو مسلم میں تقسیم کر کے چیختا چلاتا ہے اور پھر اپنی اس حرکت پر آنسو بہاتا ہے۔ لوٹتے وقت وہ ایک دن باندرہ تک ندا کے ساتھ بس میں ہوتا ہے۔ راستہ بھر وہ خاموش رہتا ہے یا نشے کی غنودگی کے عالم میں ہوتا ہے۔ لیکن باندرہ کے آتے ہی وہ ندا کا ہاتھ تھام کر کہتا ہے۔

سالے مسلمان۔ میں جانتا ہوں تو بے روزگار ہے۔ جب بھی تجھے پیسوں کی ضرورت ہوا کرے تو تکلف نہیں کرنا، مجھ سے لے لینا۔ اور اتنا کہہ کر وہ زبردستی ندا کی جیب میں بیس روپے ڈال دیتا ہے۔

بھوپندر سنگھ کے حالات دوسروں سے بہتر تھے وہ بھی جگجیت کی طرح مونا سردار ہے۔ فلم حقیقت میں اس کے گائے ہوئے گانے بہت مقبول ہوئے تھے۔ پلے بیک سنگنگ کے علاوہ وہ گٹار کا بھی اچھا فنکار ہے۔ اور روزانہ کچھ نہ کچھ کما لیتا ہے۔ شام کو بیئر کیلئے مشترکہ چندے میں اس کا حصہ سب سے زیادہ ہوتا ہے۔

"مجھے روتی بسورتی، حرام کے بچے جنتی، ماتم کرتی عورت پن سے نفرت ہے۔ بے کار کی شرم وحیا اور وہ ساری خوبیاں جو عورت کا زیور سمجھی جاتی ہیں مجھے لعنت معلوم ہوتی ہیں۔ کوری جذباتیت سے مجھے کوفت ہوتی ہے" (میں کیوں لکھتی ہوں۔ عصمت چغتائی)

عصمت نے عورت اور مرد کی برسوں پرانی سیماؤں کو گڈمڈ کرنے کا جو ادبی تجربہ کیا ہے۔ وہ ان کا ایک تاریخی کارنامہ ہے۔ وہ غلام ہندوستان میں آزاد عورت کا زندہ تصور ہیں۔ عصمت مزاجاً باغی اور ناراض خاتون کی علامت ہیں۔ انہوں نے جیسا دیکھا جو انکے برتاؤ میں آیا، وہی اپنے مخصوص انداز میں لکھا۔ ان کے افسانوں کی دنیا بھلے ہی زیادہ وسیع نہ ہو لیکن وہ اپنی

چھوٹی سی دنیا کی بڑی افسانہ نگار معلوم ہوتی ہیں۔ اس میں فکر سے زیادہ مشاہدہ کا عمل دخل ہے۔ اس دنیا کے زمین و آسمان ان کے ساتھ ہی کھیل کود کر بڑے ہوئے ہیں۔ ان کے ہر راستے کے ہم سفر رہے ہیں۔ اس میں رہنے بسنے والوں سے بھی وہ اسی طرح جڑی ہوئی ہیں جس طرح جسم میں ہاتھ پاؤں جڑے ہوتے ہیں۔ عصمتؔ کی زبان، نسائی روزمرہ کی طراری کو مکالماتی فنکاری میں ڈھالنے کے ہنر سے واقف ہے۔ ان کی کہانیوں کے کردار ہی انکے جانے پہچانے نہیں ہوتے ان کی زبان بھی وہی ہوتی ہے جو عصمتؔ خود بولتی رہی ہیں یا جسے انہوں نے اپنے گھر یا قریب کے ماحول میں سن کر اپنی یادداشت میں محفوظ کیا تھا۔ ان کی یہ زندہ، بے تکلف اور بے باک زبان ہی ان کی ادبی شناخت ہے۔

عصمتؔ کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا، اس اشاعت سے پہلے ہی اس میں شامل بیشتر کہانیاں قارئین کو چونکا چکی تھیں۔ ان کہانیوں کی شہرت میں جنسی بے حجابی اور رازہائے درون پردہ کی بے نقابی کا ہاتھ زیادہ تھا۔ یہ کہانیاں یوں بھی قارئین کو متوجہ کرتی تھیں کہ ان کو لکھنے والے ہاتھ ایک عورت کے تھے۔ عصمتؔ کی شخصیت کی تعمیر میں، ان کی اپنی ذہانت کے ساتھ دیگر دو نام بھی اہم ہیں۔ ان میں ایک ان کے بڑے بھائی عظیم بیگ چغتائی کا ہے اور دوسرا انگارے والی ڈاکٹر رشید جہاں کا ہے۔ عصمتؔ میں کہانی کار کی قوت ان کا وہ ماضی ہے جو تھوڑا تھوڑا آگرہ، علی گڑھ، بدایوں اور جودھ پور میں بکھرا ہوا ہے۔ انہوں نے جب بھی دور ہوتے اس ماضی کے بجھتے ہوئے انگاروں کو روشن کیا اُردو ادب کو دوزخی، چوتھی کا جوڑا اور ننھی کی نانی جیسی کہانیوں سے امیر بنایا۔ اپنے اس ماضی سے جہاں وہ دور ہوتی ہیں اس دردمندی کو پیدا کرنے سے معذور ہوتی ہیں جو انکے افسانوی وقار کا معیار ہے۔

ترشے ہوئے، بنا چوٹی کے بہت سارے کالے سفید بال، پان سے رنگی ہوئی بڑھاپے کی کم عمر مسکراہٹ، بوڑھے چشمے سے جھانکتی ہوئی جوان آنکھیں اور تیز دھار میرٹھ کی قینچی کی طرح چلتی تیز زبان، جس میں عورت اور مرد کی بات چیت کے دائرے ہمیشہ ایک دوسرے کو لانگتے پھلانگتے رہتے ہیں۔ ان کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ وہ جس جگہ ہوتی ہیں، بولنے کا حق

صرف انہیں کو ہوتا ہے، جو اس معاہدہ کو توڑنے کی جسارت کرتا ہے تو اس بری طرح ان کے کسی جملے کا شکار ہوتا ہے کہ وہ کئی دنوں اپنی مردانگی پر شک کرتا رہتا ہے۔ ندا ان سے آخری بار، انہیں پر بننے والی ایک ڈوکومینٹری کے سلسلے میں ملتا ہے۔ اس وقت اُن میں وہ چغتائیت غائب ہو چکی تھی جو محفلوں میں دہاڑتی تھی اور بڑے بڑے جوان مردوں کو تیکھے فقروں سے پچھاڑتی تھی۔ ان کی لمبی عمر سمٹ کر پھر سے ایک کمسن بچی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ یہ وہی بچی تھی جو آگرہ بدایوں میں کبھی وہ خود تھیں۔

گھر میں سب سے چھوٹی، سانولے رنگ کی وجہ سے سب جسے کلّو کے نام سے پکارتے تھے۔ سینا پرونا، کھانا پکانا سیکھنے کے بجائے وہ دن بھر گلی ڈنڈا، کبڈی، یا پیڑوں پر گلہری کی طرح اترنے چڑھنے میں کھوئی رہتی تھی۔ بھائیوں کے ساتھ چھتوں، منڈیروں پر بندروں کی طرح اسے کودتی اچھلتی دیکھتیں تو محلے کی بڑی بوڑھیاں ایک دوسرے سے بولتیں، توج ہوا، یہ نصرت کی لونڈیا ہے یا موا اجار۔ توبہ توبہ......!

عصمت پھر سے اپنا وہی بچپن جینے لگی تھیں۔ کبھی وہ چھجے پر اتر کے ناچتی تھیں، کبھی گیلری میں رکھے گملوں کے پھولوں اور بیلوں سے، انہیں کی زبان میں باتیں کرتی تھیں۔ وہ اب اگلا پچھلا سب بھول چکی تھیں۔ ان کی گفتگو بھی اب بے ربط اور سرریلسٹک ہو چکی تھی۔

ندا کے سوال کچھ ہوتے تھے ان کے جواب کچھ ہوتے تھے۔ سوال ان کے یک کرداری افسانوں کے بارے میں ہوتا ہے جواب میں وہ اس کشمیری شال کی کہانی سناتی ہیں جو ان کی بیٹی انہیں اس وقت اڑھاتی ہے...... معلوم ہے تمہیں، یہ شال کس کی ہے؟ تم کیا جانو! فرانس کا بادشاہ ایک بار مجھے جہاز میں ملا تھا، گورا سرخ۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا۔ میں کہاں چوکنے والی تھی۔ میں بھی ہنس دی، بس دوستی ہو گئی، اس نے میری شال خود پہن لی اور اپنی شال مجھے اڑھا دی...... قہقہہ...... یہ اسی کی محبت کا تحفہ ہے۔

سوال ادب وسیاست کے تعلق سے پوچھا جاتا ہے۔ جواب میں وہ پنڈت نہرو سے اپنی بچپن کی ملاقات کا ذکر کرتی ہیں۔ پتہ ہے تمہیں پنڈت نہرو سے میں جب ملی تھی اس وقت میں

پانچ سال کی تھی۔ عظیم بھائی کی مسلسل کھوں کھوں سے اوب کر ایک دن میں کتاب کاپی پھینک کر باغ میں چلی گئی۔ عظیم بھائی مجھے پڑھاتے تھے۔ لیکن تپ دق نے انہیں کھوکھلا کر دیا تھا۔ جب دیکھو کھانس کر خون تھوکتے رہتے تھے تو باہر جاکر میں نے نیم کے نیچے سے ایک بنولی اٹھائی اور اس سے دوسرا نیم اگانے کے لئے دیوار کے پاس زمین کھودنے لگی۔ پھر کیا دیکھتی ہوں، دو گورے گورے خرگوشوں جیسے پاؤں میرے قریب آکر رک گئے۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے پنڈت نہرو کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے کام کرتے دیکھا تو میرا ہاتھ بھی بٹایا۔ پنڈت جی نے بنولی کی کیاری میں خود پانی دیا۔ وہ میرے علاوہ گھر میں اور کسی سے نہیں ملے۔ باہر سے ہی چلے گئے ان کے پاس وقت ہی کہاں تھا۔ جس سے ملنے آئے تھے بس اس سے ہی ملے...... ایک اور سوال کے جواب میں، وہ رابندر ناتھ ٹیگور کو درمیان میں لے آتی ہیں۔ ہواؤں میں ان سے ملنے شانتی نکیتن گئی۔ دبے دبے پاؤں، آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر میں اس کمرے میں داخل ہوئی جہاں ٹیگور ایک بڑی سی، پرانی وضع کی کرسی پر چپ چاپ بیٹھے تھے۔ کمرے کی خاموشی میں ملگجی روشنی ادھر ادھر بکھری ہوئی تھی۔ ہوا تک خاموش تھی۔ فرش پر انکے پاؤں چنبیلی کے پھولوں کی ڈھیریوں سے لگتے تھے۔ بہت ملائم اور خوبصورت تھے وہ۔ ان کے لمبے لمبے بالوں میں، سر کے اوپر ایک چھوٹی سی رنگین چڑیا بیٹھی تھی۔ انہوں نے مجھے آتے دیکھا تو منہ پر انگلی رکھ کر مجھے رک جانے کو کہا۔ میں رک گئی انہیں شاید ڈر تھا کہ میرے پیروں کی آہٹ سے وہ چھوٹی سی چڑیا اڑ جائے گی۔ لحاف لکھی تھی نا میں نے...... انہیں معلوم تھا۔ ان کی باتیں ٹی وی ڈائریکٹر کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ بعد میں پوری ڈوکومینٹری، ان پر لکھے ہوئے مضامین ان کی کہانیوں اور سوانحی خاکوں کی مدد سے تیار کی جاتی ہے۔ اس میں انکے گھر میں ہوئی شوٹنگ کا بہت کم حصہ کام آتا ہے۔ اس شوٹنگ کے کچھ دن بعد ہی عصمت آپا پھرچی سے بوڑھی ہو کر انتقال کر جاتی ہیں۔ اور ان کی وصیت کے مطابق انہیں ممبئی کے چندن واڑی کے برقی شمشان میں نذر آتش کر دیا جاتا ہے۔ آن کی آن میں سب کچھ راکھ ہو جاتا ہے۔ ایک مٹھی بھر راکھ اور اسی کے ساتھ، خرگوشوں اور چنبیلی کی

ڈھیریوں جیسے پاؤں، فرانس کے گورے سرخ بادشاہ کی دی ہوئی شال اور گرودیو کی جٹاؤں میں پر سمیٹے بیٹھی ہوئی رنگین ننھی چڑیا سب یادوں کی ٹیڑھی میڑھی لکیروں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ان بے ربط تخیلی پیکروں کی آڑ میں ان کے وجود کے کون کون سے خالی گوشے جھانکتے تھے وہ کون کون سی دبی گھٹی آرزوئیں تھیں، جو عجیب و غریب کھلونے بن کر انہیں بہلا رہی تھیں۔ یہ سارے راز بھی ان کے جسم کی طرح آگ کی بند مٹھی میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ لیکن اپنی جیتی جاگتی نثر، انسانی دردمندی، اور بے خوف ہوشیاری کی وجہ سے وہ پریم چند کے بعد کے دور کی اردو افسانہ کی تاریخی عمارت میں کرشن چندر، بیدی اور منٹو کے ساتھ چوتھے ستون کی حیثیت سے آج بھی حیات ہیں۔ کبیر داس نے قول و عمل کے تضاد پر طنز کرتے ہوئے کہا ہے۔

کرنی بن کتھنی، کتھے، اگیانی کی جات
جیوں کو کر بھوکت پھریں، سنی سنائی بات

عصمت نے بھی سنی سنائی کو رد کر کے قول کو عمل کا حصہ بنایا اور اس طرح اردو افسانہ میں اپنی انفرادیت کا جادو جگایا۔ انہوں نے جیسا دیکھا، جیسا محسوس کیا ویسا لکھا۔ انہوں نے زندگی کو زندگی کی آنکھوں سے دیکھا۔ کسی نظریہ یا عقیدہ کی کھڑکی سے اس کا دیدار نہیں کیا۔ اس کی چہل پہل میں شریک ہو کر، اس کے دکھ درد میں شامل ہو کر اسی کے محاورہ میں اسے بیان کیا۔

تیرے پیروں چلا نہیں جو
دھوپ چھاؤں میں ڈھلا نہیں جو
وہ تیرا سچ کیسے، جس پر تیرا نام نہیں
تجھ سے پہلے بیت گیا جو
وہ اتہاس ہے تیرا
تجھ کو ہی پورا کرنا ہے

جوبن باس ہے تیرا
تیری سانسیں جیا نہیں جو!
گھر آنگن کا دیا نہیں جو!
وہ تلسی کی رامائن ہے تیرا رام نہیں
وہ تیرا ج کیسے
تیرا تن ہی پوجا گھر ہے
کوئی مورت گڑھ لے
کوئی پستک ساتھ نہ دیگی
چاہے جتنا پڑھ لے
تیرے سُر میں سجا نہیں جو
اک تارے پر جا نہیں جو
وہ میرا کی سم پتیؔ ہے تیرا شیام نہیں
وہ تیرا ج کیسے جس پر تیرا نام نہیں

☆☆☆

جس کا کوئی نام نہیں ہوتا اسے یوپی میں راموا ور ممبئی میں پانڈو کہتے ہیں۔ ان کا حسب نسب بچپن میں ہی ان سے چھین لیا جاتا ہے۔ وہ شہر کی فٹ پاتھوں پر یا ریلوے اسٹیشنوں کے ارد گرد وقت گذار کر بڑے ہوتے ہیں۔ ان میں کچھ بھکاری بنتے ہیں، کچھ جوتوں پر پالش کرنے کا دھندا اپناتے ہیں اور کچھ چھوٹی موٹی چوریاں کرتے کرتے بڑے چور بن جاتے ہیں ان میں دوسروں کی طرح شادیاں بھی ہوتی ہیں۔ دوستیاں اور دشمنیاں بھی ہوتی ہیں اور لڑائی جھگڑے بھی ہوتے ہیں۔ ان کا گھر پورا شہر ہوتا ہے۔ دن بھر دوڑتے بھاگتے جہاں تھک جاتے ہیں وہیں نیند پوری کر لیتے ہیں۔ ان کے پیدائش کے گھروں کے بھلے ہی الگ الگ دھرم رہے ہوں، لیکن ممبئی میں ان سب کا مذہب بھوک اور روٹی کی طرح یکساں ہوتا ہے۔ جس کو جہاں سہارے کی امید ہوتی ہے وہیں ہاتھ پھیلا کر بیٹھ جاتا ہے۔ یہ مندر، مسجد، گرجا گردواروں کے فرق کو نہیں مانتے۔ اپنے جان ومال کی خیر کے لئے پوجا، یا عبادت کرنے والے انہیں بھیک دیتے وقت کسی سے اس کی ذات یا دھرم بھی نہیں پوچھتے۔

ایسے ہی ایک پانڈو سے، ایک دن ندا کی ملاقات ہوتی ہے۔ وہ اپاہج ہے۔ اس کی دونوں ٹانگیں پیدائش سے اس کے کمزور بدن میں غیر ضروری بوجھ کی طرح جڑی ہوئی تھیں، جنہیں وہ ایک پہیوں لگے تختے پر صبح سے شام تک ڈھوتا ہے۔ ندا ناریل کی دکان پر کھڑا ناریل کا پانی پی رہا ہوتا ہے کہ وہ گھسٹتا ہوا اس کے قریب آجاتا ہے۔ عمر پچیس چھبیس سال کی ہوگی، وہ ندا کو دیکھ کر پہلے مسکراتا ہے پھر نہایت گمبھیر آواز میں پوچھتا ہے۔ صاحب، برا نہ

مانیں تو ایک بات پوچھوں۔ کیا پوچھنا ہے بولو؟ ناریل پانی کا سواد کیسا ہے؟ اپن نے کبھی پیا نہیں اس لئے پوچھتا ہے۔ نِدا اس کے بھیک مانگنے کے نئے اسٹائل سے خوش ہو کر اس سے کہتا ہے اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے، آج پی کر خود معلوم کر لو۔ وہ دوکان والے سے اُسے ایک ناریل دینے کو کہتا ہے...... پانڈو یہ سنتے ہی فوراً بولتا ہے۔ نہیں صاحب، اپن نہیں پیے گا۔ ناریل بہت مہنگا ہوتا ہے۔ تمہیں مہنگے سستے سے کیا لینا پیسے سے تو میں دوں گا دوکاندار کو......

وہ تو ٹھیک ہے جی۔ مگر سواد اچھا لگا اور مجھے عادت پڑ گئی تو کیا ہوگا؟

کیا ہوگا؟ نِدا اس کی باتوں میں دلچسپی لینے لگتا ہے

اور پریشانی ہوگی صاحب۔ بیڑی کی بھی ایسی ہی عادت پڑ گئی تھی۔ اب طلب ہوتی ہے تو مشکل ہوتی ہے۔ خریدنی پڑتی ہے صاحب اور......

نِدا اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے اسے پانچ روپے دے کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ صبح کی سیر کرتے ہوئے ایک دوبار اس سے ایسی ہی اور ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ ہر بار اس کا انداز عام بھکاریوں سے مختلف محسوس ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ یہ شناسائی گہری ہوتی جاتی ہے۔ اب وہ کبھی نظر نہیں آتا تو نِدا کو راستے میں کچھ کمی کا سا احساس ہونے لگا۔ نِدا کے گھر سے جوگرس پارک تک اور بھی کئی بھکاری ہوتے ہیں بوڑھے، جوان، بچے ان میں ایک اٹھارہ اُنیس برس کا لڑکا بھی ہے جو دونوں گردوں کے فیل ہونے کا ڈاکٹری سرٹیفکٹ ہر گذرنے والے کو دکھاتا ہے۔ ایک سائیکل بابا کے نام سے مشہور ہے۔ بڑے بڑے بال، پھیلی ہوئی داڑھی، وہ ہر وقت سمندر کے کنارے تین پہیوں کی ایک سائیکل نما گاڑی میں بیٹھا، اونگھتا رہتا ہے یا منی ریڈیو کو کان میں لگائے رہتا ہے۔ وہ کئی مہینوں سے اسی گاڑی میں سوتا ہے اسی میں جاگتا ہے۔ وہ اپنے آپ کسی سے نہیں بولتا ہر وقت چپ اور گم۔ جو دے اس کا بھی بھلا، جو نہ دے اس کا بھی بھلا، اس کی ضرورت کا سارا سامان اس گاڑی کے آگے پیچھے لٹکا رہتا ہے۔ اسکے آگے پیچھے کوئی ہے یا نہیں، وہ کہاں سے یہاں آیا تھا؟ اس کی زبان کونسی ہے؟ یہ سارے سوال اس کی مسلسل خاموشی نے لاجواب کر دیے تھے۔ اس کی بے نیازی نے اسے نوجوانوں میں کافی مقبول کر دیا

ہے۔ صبح شام وہ اکثر اس کی مدد کرتے رہتے تھے۔ لیکن وہ نہ کسی کا شکریہ ادا کرتا نہ کسی کو نظر اٹھا کر دیکھتا۔ کسی قریب کی بلڈنگ میں ایک کھاتے پیتے گھر کا کرسچین لڑکا اور اس کی گرل فرینڈ دونوں اسکے کافی معتقد ہیں۔ وہ جب بھی ایک دوسرے کے قریب بیٹھنے ادھر آتے ہیں تو پہلے قریب کی دکان سے ایک بسلیری پانی کی بوتل اور بسکٹ کا پیکٹ خرید کر اسکے پاس رکھ دیتے ہیں۔ لیکن ندا کی جیب صبح کے اس راستہ میں پانڈو کے علاوہ کسی کے لئے نہیں کھلتی۔ بھیک دینے میں بھی کئی جذبے شامل ہوتے ہیں۔ کبھی آدمی دوسرے کی پریشانی دیکھ کر خود کو غیر محفوظ محسوس کرتا ہے۔ اس لئے بھیک دیتا ہے، کبھی خیرات سے اپنی عاقبت سنوارنے کی کوشش کرتا ہے، کبھی اس کے ذریعہ اپنی انا کی تسکین کی جاتی ہے۔ پانڈو کے ساتھ ندا کے رشتہ میں ایک خوشی کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔ ندا کو اس کی جملہ بازی اور بے تکلفی میں مزا آتا ہے۔ ایک دن اسے روز کے پیسوں سے کچھ زیادہ کی ضرورت تھی۔ ندا نے جب روز کی طرح اسے کچھ دینا چاہا تو اس نے سنجیدہ ہو کر لینے سے انکار کر دیا۔

نہیں صاحب، آج میں آپ سے پیسے نہیں لونگا...... روز روز لینے میں شرم آتی ہے

کیوں، آج کیا نئی بات ہو گئی؟

صاحب جیب میں جب کھانے پینے سے زیادہ پیسے ہوتے ہیں تو بری عادتیں لگ جاتی ہیں۔

تمہیں کون سی عادت لگ گئی اب، ندا پوچھتا ہے۔

کل جیب میں پیسے تھے۔ ایک نوٹانک مارلی۔ بڑا مزہ آیا صاحب۔ بس سویرے سے ہی رات کے لئے ہڑک ہونے لگی ہے......!

ندا کو اس کا انداز پسند آتا ہے اور وہ روز سے کچھ زیادہ اس کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہے......

پانڈو کی مادری زبان تیلگو ہے۔ بچپن میں ہی ممبئی میں آکر وہ پانڈو بنا اور یہیں اس نے مراٹھی اور ہندوستانی سیکھی۔ باپ کے مرنے کے بعد سوتیلی ماں کے لئے جس کا اپنا بھی ایک بیٹا تھا، پانڈو کی کفالت مشکل تھی۔ رات دن کی مار پیٹ سے تنگ آکر ایک دن گھسٹتا ہوا

اسٹیشن آیا اور اس وقت جو ٹرین کھڑی تھی اس میں بیٹھ گیا۔ وہ ٹرین ممبئی آکر رک گئی اور وہ ممبئی کا بن گیا۔ اپاہج ہونے کی وجہ سے پیشہ ور بھکاریوں میں اس کی مانگ تھی۔ کئی بار وہ بیچا خریدا گیا۔ آخری بار ایک ادھیڑ عمر کی راجستھانی بھکاری عورت نے اسے خریدا۔ جس کے ساتھ اب اس کا پتی پتنی کا رشتہ ہے۔ اس رشتہ کی عمر دس سال سے زیادہ ہو چکی ہے۔ دن بھر دونوں الگ الگ علاقوں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ لیکن شام ہوتے ہی پالتو جانوروں کی طرح کارٹر روڈ کے باغ کی فٹ پاتھ پر مل جاتے ہیں۔ پہلے ننددی آتی ہے۔ وہ آتے ہی فٹ پاتھ کی دیوار سے لگی اپنی بوتل کے پانی سے منہ دھوتی ہے۔ ایک آئینے کا ٹکڑا سامنے رکھ کر بال سلجھاتی ہے اور پھر گٹھری سے میلی چادر نکال کر بچھاتی ہے۔ اور پانڈو کے لوٹنے کا انتظار کرتی ہے۔ پانڈو اکثر دیر سے آتا ہے۔ اس کے آنے تک نندی دیوار سے پیٹھ ٹکائے اونگھتی رہتی ہے۔ اس کے آتے ہی دونوں ایک ساتھ بھوجن کرتے ہیں۔ اور دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کر کے سو جاتے ہیں۔ دوسرے بھکاری انہیں ماں بیٹا کہہ کر چھیڑتے ہیں۔

پانڈو کی جملے بازی سے صرف ندا ہی متاثر نہیں تھا۔ اور بھی کئی اسکے فین بن چکے تھے۔ وہ جوگرس پارک میں آنے والوں میں کافی پاپولر تھا۔ اس کی بڑھتی شہرت ایک دن لائینس کلب کے ایک ڈائریکٹر کو متوجہ کرتی ہے۔ اور وہ کچھ دن کے بعد ہینڈی کیپڈ کوٹے سے اسکے نام ایک چھوٹا سا باکڑا منظور کرا دیتا ہے۔ پانڈو کا یہ باکڑا ندا کے گھر کے سامنے ہنومان مندر کے قریب ہے۔ ندا اب پان یا سگریٹ اسی کی دوکان سے خریدتا ہے۔ دوکان بھرنے کے لئے وہ ندا سے ایک اچھی خاصی رقم بھی ایک دو مہینے میں لوٹانے کے وعدہ سے لیتا ہے۔ دوکان سامان سے بھر جاتی ہے اور چلنے بھی لگتی ہے لیکن کچھ ہی دن بعد دوکان پر پانڈو کی جگہ کوئی دوسرا آدمی بیٹھا نظر آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے پانڈو نے یہ دوکان بڑا سا ڈپازٹ لے کر کرایہ پر اٹھا دی ہے۔ اب وہ صرف مہینہ میں ایک بار اپنی نئی تین پہیوں کی سائیکل میں آتا ہے اور کرایہ لے کر چلا جاتا ہے اب وہ بھکاری سے سیٹھ بن چکا تھا۔ کئی دن تک پانڈو نہ کارٹر روڈ پر نظر آتا ہے نہ دوکان پر، پھر کافی عرصہ کے بعد اچانک وہ مل جاتا ہے۔ شراب میں دُھت۔ ندا کو دیکھتے ہی وہ

اپنی گاڑی روکتا ہے۔ اس کے ماتھے پر تلک تھا اور کپڑے بھی صاف ستھرے تھے۔ اسے دیکھ کر نداپوچھتا ہے۔ پانڈوتم تو پنڈت بن گئے۔ یہ سب کیا ہے؟

صاحب پہلے بھکاری تھا۔ اب بھگوان عزت کی کھلانے لگا ہے تو اپن بھی مندر جانے لگا ہے۔ وہ ہماری پیٹ پوجا کر رہا ہے، اپن اس کی دھرم پوجا کرتا ہے۔

وہ عزت کی کھلانے لگا ہے تو میرے پیسے بھی لوٹا دو۔ کئی مہینوں کے بعد آج ملے ہو۔ آج کے بعد نہ جانے کب ملوگے؟

صاحب کیا کروں۔ کاروبار بڑھ گیا ہے۔ ایک ٹیلی فون بوتھ بھی اپنے نام اندھیری میں الاٹ ہوا ہے۔ وہاں روز آگائی کو جانا پڑتا ہے۔ پھر کھولی لی ہے۔ شادی بھی کی ہے۔ آپ نے جو مدد کی تھی۔ یہ سب اسی کا چمتکار ہے۔ صاحب ممبئی میں پیسہ ہی پیسے کو کماتا ہے۔

شادی کے لفظ پر نداچونکتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے۔ تمہارے ساتھ نندی تو بہت پہلے سے تھی۔ اب شادی کیسی؟ جیسے پہلے تھے ویسے ہی رہتے...... صاحب وہ میری عمر کی نہیں تھی۔ میں نے اپنی عمر کی چھوکری سے شادی بنائی ہے۔ اسی کے ساتھ رہتا ہوں اب...... بہت سندر ہے۔

اور وہ نندی...... ؟ وہ کہاں ہے؟

وہ وہیں ہے صاحب! جہاں پہلے تھی۔ اسے بھی کوئی اس جیسا مل جائے گا۔ صاحب اسے آدمی کی نہیں آدمی کی سنگت کی ضرورت ہے......!

آتی جاتی ہر محبت ہے چلو یوں ہی سہی
جب تلک ہے خوبصورت ہے چلو یوں ہی سہی
ہم کہاں کے پارسا ہیں بے وفا وہ ہیں تو کیا
گھر میں کوئی گھر کی زینت ہے چلو یوں ہی سہی
بھول تھی اپنی فرشتہ آدمی میں ڈھونڈنا
آدمی میں آدمیت ہے چلو یوں ہی سہی

میلے ہوجاتے ہیں رشتے بھی لباسوں کی طرح
دوستی ہر دن کی محنت ہے چلو یوں ہی سہی
جیسی ہونی چاہیے تھی ویسی تو دنیا نہیں
دنیا داری بھی ضرورت ہے چلو یوں ہی سہی

پیسے نہ لوٹانے کے باوجود پانڈو سے ندا کی دوستی برقرار رہتی ہے۔ وہ جب بھی ٹکراتا ہے پہلے کی طرح اپنی خوش گفتاری سے خود بھی ہنستا ہے اسے بھی ہنساتا ہے۔ اب اس کے چہرہ پر خوش حالی کی چمک اور آواز میں خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی مدد کے لئے ایک لڑکے کو بھی نوکر رکھ لیا تھا۔ جو اس کی گاڑی کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ اور وہ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے حکم چلاتا رہتا تھا۔ اب وہ پانڈو سے پانڈورنگ بن گیا تھا۔ ایک بار جب وہ شام کو دوکان سے روز کا کرایہ لینے آتا ہے تو اسی لڑکے کو بھیج کر ندا کو گھر سے بلاتا ہے۔ مگر اس بار وہ خلاف معمول خاموش خاموش سا نظر آتا ہے۔ جب ندا اس سے اس خاموشی کی وجہ پوچھتا ہے تو اس کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ کیا بات ہے پانڈو، ندا اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دوبارہ پوچھتا ہے۔ کندھے پر ہاتھ کا لمس محسوس کرتے ہی وہ پھوٹ کے رونے لگتا ہے خیریت تو ہے؟ کیوں رو رہے ہو؟

صاحب وہ چھوکری مجھے چھوڑ کر دوسرے مرد کے ساتھ چلی گئی۔ اور ساتھ میں کھولی میں جتنی جمع پونجی تھی وہ بھی لے گئی۔

ایسا کیوں کیا اس نے، کھانے پینے کو تھا، سب آرام تھا۔ پھر بھی......!

صاحب اُسے بچہ چاہیے تھا...... اور میں اسے بچہ نہیں دے سکتا تھا۔

اس میں اتنا پریشان کیوں ہوتے ہو۔ تمہارے پاس گھر ہے دوکان ہے، ٹیلی فون بوتھ ہے، گولی مارو اسے اور کوئی دوسری ڈھونڈلو۔

دوسری بھی کچھ دن کھا پی کر دوسرے کی ہو جائے گی۔ میرے ساتھ تو نندی ہی اچھی تھی۔ مگر وہ بھی! جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ پھر رونے لگا۔

کیا ہوا انندی کو...... کیا مر گئی وہ ؟

مری نہیں۔ زندہ ہے صاحب...... مگر اس نے بھی میرے ساتھ رہنے سے منع کر دیا۔ بولتی ہے۔ جس کے لئے مجھے چھوڑا تھا، اسی کو ڈھونڈ کے لا۔ میرا تیرا کوئی سمبندھ نہیں ہے۔

تم نے بھی تو اس کے ساتھ ناانصافی کی تھی۔ دس سال کا رشتہ اچانک توڑ دیا......!

مگر رشتہ جوڑنے بھی تو میں ہی گیا اس کے پاس۔ اس نے تو کبھی یاد ہی نہیں کیا صاحب

چلو میں منا دیتا ہوں اسے تمہارے لئے...... نندا اس سے کہتا ہے

وہ اب یہاں نہیں ہے صاحب...... جس دن میں اسے لینے گیا تھا اسی دن سے وہ فٹ پاتھ چھوڑ کے کہیں غائب ہو گئی۔ ہر عورت ایک سی ہوتی ہے صاحب!

میں بھکارن کو مالکن بنا رہا تھا لیکن وہ نہیں مانی۔ پہلے چادر بچھا کر انتظار کرتی تھی۔ اب میں کیسی پتا میں ہوں، یہ بھی پوچھنے کو نہیں آتی۔

☆☆☆

نیاز حیدر کے ساتھ بھی کوئی نہ کوئی پانڈو رہتا ہے۔ وہ چلتے رستے کسی بھی پانڈو کو اٹھاتے ہیں۔ ہوٹل میں اسے اچھے سے اچھا کھانا کھلاتے ہیں اور پھر جہاں ٹھہرے ہوتے ہیں وہاں لے جاتے ہیں۔ جب تک وہ انکے ساتھ رہتا ہے جیسا وہ کھاتے ہیں ویسا وہ کھاتا ہے۔ اس کے لئے نئے کپڑے خریدے جاتے ہیں۔ رہنے سہنے کے آداب سکھائے جاتے ہیں۔ لیکن ان ساری مدارات کے باوجود کوئی زیادہ دن ان کے ساتھ نہیں رہ پاتا۔ جب بھی کئی نشوں کی گہری نیند میں ہوتے پانڈو ان کی جیبیں صاف کر کے جہاں سے آتا وہیں دوبارہ لوٹ جاتا۔ کھلی آزادیاں کمروں کی پابندیوں کو زیادہ دن برداشت نہیں کرپاتیں۔ ایک دفعہ تو ایک پانڈو نے ان کی فیاضیوں کا یہ صلہ دیا کہ ان کا چہرہ کئی دنوں دوسروں کا سامنا کرنے سے کتراتا رہا۔ مگر تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی، جیسی رجائیت نے انہیں کبھی آدمی کی آدمیت سے مایوس نہیں ہونے دیا۔ اور وہ غربت کو مسلسل عزت سے نوازتے رہے۔ جس پانڈو نے ان کے چہرہ پر جدید مصوری کی تھی، اسے ندا نے ان کے ساتھ پہلی بار راہی معصوم رضا کے نئے گھر کے سامنے سمندر کے کنارے کی منڈیر کے ایک کونے میں بیٹھا دیکھا تھا۔ اس وقت وہ ان کی دن بھر کی تھکی ٹانگوں کو گھٹنوں کے اوپر کے حصہ تک اپنے چھوٹے ہاتھوں سے دبا رہا تھا۔ ندا دور سے ان کی سفید لمبی داڑھی اور چمکتی آنکھوں کو پہچان کر ادھر گیا تھا۔ مگر اس گھڑی پانڈو پر ان کی مہربانیوں کی بوچھار کچھ ایسی تھی کہ اسے وہاں زیادہ ٹھہرنا مناسب محسوس نہیں ہوا۔ وہ جیسے ہی وہاں سے پلٹتا ہے نیاز حیدر کی کڑک دار آواز اسے بلاتی ہے اور اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے پانڈو

سے متعارف کراتی ہے۔

ان سے ملو۔ یہ میرے نئے دوست ہیں۔ جناب پانڈورنگ صاحب! لڑکا اپنا نام سن کر پوری بتیسی کے ساتھ مسکراتا ہے۔

ندا کو یہ بہت بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی پانڈو عزت حاصل کر لیتا ہے تو وہ پانڈو سے پانڈورنگ بن جاتا ہے۔ پانڈورنگ مہاراشٹر میں بھگوان وٹھل کا بھی لقب ہے۔ جس کی مدح میں سنت تکارام کے کئی ابھنگ ہیں۔

اس دن نیاز حیدر کافی خوش تھے۔ وہ ندا اور پانڈو کو ایک درمیانی درجہ کی معقول ہوٹل میں لے گئے۔ اور اچھی شراب، کباب اور چکن سے جی کھول کر تواضع کی۔ کھانے اور پینے کا بل کافی بڑا تھا اور اس وقت ان کی جیب چھوٹی تھی۔ اپنی جیب سے روپے نکال کر انھوں نے گنے اور پھر بل دیکھا اور پھر ایک اعتماد بھرے قہقہہ کے ساتھ اٹھے اور سیدھے کاونٹر پر پہونچ گئے۔ بل کے ساتھ انکے پاس جتنے نوٹ تھے، کاونٹر پر رکھتے ہوئے بولے۔ اس وقت اتنے ہی رکھ لو۔ باقی کے مجھ پر ادھار رہے۔ کل آؤنگا اور ادا کر دونگا۔ بار کے مالک نے جواب میں کہا۔ نہیں سیٹھ۔ یہاں ادھار ودھار نہیں چلتا۔ جتنا بل ہے اتنا دو۔ یہ سن کر نیاز حیدر کا پارہ چڑھ گیا۔

بد تمیز جانتا ہے میں کون ہوں؟ تجھے خبر ہے تو کس پر شک کر رہا ہے۔ تیرے فون میں ایس ٹی ڈی ہے؟ وہ اسی عالم میں اس سے پوچھتے ہیں۔

ہاں ہے۔ تو پھر! وہ بھی جھلاتے ہوئے بولا۔

میں ایک کال کرونگا۔ اور ابھی تیرے سارے پیسے یہاں آجائیں گے، یہیں اسی وقت۔ وہ نمبر ملا کر بات شروع کرتے ہیں۔

ہلو...... ہلو میں نیاز حیدر ممبئی سے بول رہا ہوں۔ ایک ہوٹل سے۔ بیٹی اندرا گاندھی وہاں ہوں تو ان سے بات کراؤ۔ کیا ذرا زور سے بولو یہاں جانوروں کا شور زیادہ ہے۔ اس وقت نہیں ہیں؟ کوئی بات نہیں۔ وہ جب آجائیں، تو کہنا میں نے فون کیا تھا، نیاز حیدر نے۔ یہاں کا

نمبر نوٹ کرو۔ نیاز حیدر بار کے مالک سے نمبر پوچھتے ہیں۔ اور اندرا گاندھی کے پی اے کو نوٹ کراتے ہیں۔ اور پھر سے دوسرا نمبر ڈائل کرنے کو ہوتے ہیں کہ ہوٹل کا مالک گھبرا کر ان کا ہاتھ روکتے ہوئے کہتا ہے۔

کوئی بات نہیں سیٹھ مجھ سے آپ کو پہچاننے میں بھول ہوگئی۔ یہ پیسے بھی آپ رکھو۔ بل کی رقم جب ہو، دے جانا۔ آپ بڑے لوگ ہیں۔ پیسے کہاں جائیں گے۔ تھینک یو، گاڈ بلیس یو مائی سن...... کہہ کر وہ روپے واپس جیب میں رکھتے ہیں اور ہوٹل سے باہر آجاتے ہیں۔ نیاز حیدر اُردو کلچر کے آخری بوہیمین شاعر تھے۔ ان کا نہ کوئی گھر تھا نہ مستقل پتہ۔ ان کی انہیں شاید ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ جہاں جاتے، وہیں کہیں ٹھہر جاتے، اور وہاں سے رخصت ہونے تک وہی ان کا پتہ ہوتا۔ ان کی مہمان نوازی ممبئی میں کبھی کسی فلم ساز کے سر ہوتی کبھی کئی شناسا ادیب و شاعر مل کر اس بوجھ کو اٹھاتے۔ فلموں سے وابستہ ادیبوں اور شاعروں کو حقیر سمجھتے مگر ضرورت کے وقت ان میں سے جس کے گھر کے سامنے ٹیکسی روکتے اس سے دن بھر کی ٹیکسی کا کرایہ ہی نہیں لیتے، وہاں سے جائے قیام تک جانے اور رات کے پینے پلانے اور کھانے کا خرچہ بھی لیتے۔ راجندر سنگھ بیدی اور ساحر لدھیانوی کے گھروں کے سامنے ان کی ٹیکسی اکثر رکتی تھی۔ ان کی ایسی حرکتوں سے لوگ نالاں تو ہوتے لیکن کسی میں کبھی اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ ان کے اوپر اپنی خفگی کا اظہار کرے۔ وہ سماج میں دولت کی مساوی تقسیم کے قائل تھے۔ ندا نے ایک پورا دن ان کے ساتھ گذارا تھا۔ باندرہ سے حاجی علی، حاجی علی سے گیٹ وے آف انڈیا تک انہیں ہر چھوٹے بڑے شراب کے اڈوں اور دوسرے نشوں کے ٹھکانوں کا علم تھا۔ ہر جگہ وہ ایسے داخل ہوتے جیسے برسوں کے شناسا ہوں کہیں فراٹے سے مراٹھی بولتے کہیں تمل یا تیلگو میں بات کرتے۔ وہ بہ یک وقت کئی زبانوں کے ماہر تھے وہ بڑے شاہ خرچ تھے۔ جیب کے آخری پیسے تک وہ رات کا دامن نہیں چھوڑتے تھے۔ ان کی نشہ بازی صرف شراب تک ہی محدود نہیں تھی۔ اس میں افیم، چرس اور گانجہ اور نہ جانے کیا کیا شامل تھا۔

فلم ایکٹر امجد خاں کے ایکٹر بھائی امتیاز خاں ان کی علمیت اور شاعرانہ وقار کے مداحوں میں ہیں۔ وہ اکثر انہیں محبوب اسٹڈیو کے سامنے اپنے سہ منزلہ فلیٹ پر لے جاتے تھے۔ شراب پلاتے تھے اور انکے شعر اور تقریریں سنتے۔ ایک بار وہ وہاں بجے بنے ڈرائنگ روم میں ایک ہاتھ میں سگریٹ اور دوسرے ہاتھ میں شراب کا گلاس لئے اپنی رو میں رواں تھے۔ کہ اتنے میں دن بھر کی شوٹنگ سے تھکے ماندے امجد خاں آگئے۔ امجد شراب نہیں پیتے تھے۔ اپنے گھر میں شرابیوں کی یہ بے وقت کی محفل انہیں پسند نہیں آئی۔ انہوں نے نیاز حیدر سے کچھ نہیں کہا اپنے بھائی کو ضرور پھٹکارا۔ نیاز حیدر غصہ میں اٹھ کر باہر چلے جاتے ہیں لیکن کچھ ہی دیر بعد نئے تام جھام سے پھر سے واپس آتے ہیں۔

نیاز حیدر اپنی اس ہتک سے آگ بگولے ہو کر وہاں سے سیدھے پولس اسٹیشن کا رخ کرتے ہیں اور وہاں سے اپنے ایک مداح پولیس کمشنر کو فون کر کے ایک من گھڑت کہانی سناتے ہیں اور ان غیر موجود خطروں سے اسے آگاہ فرماتے ہیں جو انہیں درپیش ہیں۔ وہ ان کی باتوں پر یقین کر کے ان کی حفاظت کے لئے کئی ہتھیار بند سپاہیوں سے بھری ایک جیپ بھیج دیتا ہے۔ جس میں آگے کی سیٹ میں بیٹھ کر نیاز حیدر امجد خاں کے گھر کے نیچے آتے ہیں اور وہیں سے غصہ بھری آواز میں چلاتے ہیں۔

گبر سنگھ باہر آو۔ تم نے صرف فلم میں جھوٹی بندوق چلائی تھی۔ اب اصلی بندوقیں بھی دیکھو۔

ایک مشہور ایکٹر کے گھر کے نیچے، پولس دیکھ کر تماشائیوں کی بھیڑ لگ جاتی ہے۔ امجد خاں اوپر سے جھانکتے ہیں۔ وہ گھبرا کر امتیاز کو نیچے بھیجتے ہیں۔ امتیاز کو بھی ان کی یہ حرکت پسند نہیں آتی۔ مگر اس وقت وہ اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے کے بجائے، کسی طرح سمجھا بجھا کر انکے غصہ کو ٹھنڈا کرتا تھا اور اس طرح بات کو آگے بڑھنے سے روکتا تھا۔ پولس والوں کے ہاتھ گرم کیے جاتے ہیں اور نیاز حیدر کو عزت کے ساتھ ٹیکسی میں رخصت کیا جاتا ہے۔

نیاز حیدر اپنے چہرہ کے کٹاؤ اور ڈاڑھی کے اسٹائل سے مارکس کی تصویر سے کافی مماثل

تھے۔ انکے پسند کرنے والے انہیں نیاز حیدر کے بجائے، نیاز بابا کہہ کر پکارتے تھے۔ یہ وہ حلقہ تھا جو ان کی آوارہ گردی کو ان کی ایمان داری اور دن رات کی سرشاری کو ان کی فنکاری سے منسوب کرتا تھا۔ ابتدا میں ان کا تخلص 'ناکام' تھا۔ اس تخلص کی رعایت سے انہیں زندگی بھر ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا مگر میرؔ کی طرح سے انہوں نے ان ناکامیوں سے کام کم لیا انہیں بدنام زیادہ کیا۔ وہ زود گو شاعر اور اچھے مترجم تھے۔ لیکن خداداد صلاحیت کی نشوونما کے لئے جو تنظیم و ترتیب درکار تھی۔ وہ مزاجاً اس سے ہمیشہ گریز کرتے رہے۔ شاعری بھی کی، تھیٹر سے بھی وابستہ رہے، کمیونسٹ پارٹی کے بھی قریب رہے مگر طبیعت کے لاابالی پن نے کہیں بھی انہیں دیر تک قیام نہیں کرنے دیا۔ وہ جہاں بھی رہے تمام عمر خانہ بدوش رہے۔

دوچار گام راہ کو ہموار دیکھنا
پھر ہر قدم پر اک نئی دیوار دیکھنا
ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی
جس کو بھی دیکھنا ہو کئی بار دیکھنا

☆☆☆

راہی معصوم رضا ہینڈ اسٹینڈ کے سمندر کے سامنے جس بلڈنگ میں رہتے ہیں، اس سے پہلے کی ایک گلی کے آخری سرے پر مل ویو نام کی عمارت میں اختر الایمان کا خوبصورت فلیٹ تھا۔ یہاں وہ محبوب اسٹوڈیو کے قریب زیور ولا کے فلیٹ سے منتقل ہوئے تھے۔ زیور ولا کے فلیٹ کو اب وہ اپنے پڑھنے لکھنے کے لئے استعمال کرتے تھے اور یہاں بال بچوں کے ساتھ فلمی ٹھاٹ باٹ کے ساتھ رہتے تھے۔ لگ بھگ سو کے قریب چھوٹی بڑی فلمیں لکھ چکے ہیں۔ ان میں وقت، قانون، پتھر کے صنم، میرا سایہ، دھرم پتر، گمراہ، نغمہ، ہم راز وغیرہ تجارتی لحاظ سے کافی کامیاب ہوئی ہیں۔ فلموں کے کامیاب ادیبوں اور شاعروں میں اختر الایمان اس اعتبار سے واحد تخلیق کار ہیں جو فلم انڈسٹری کی چکا چوند میں رہتے ہوئے، تخلیقی ادب سے کبھی دور نہیں ہوئے۔ ان کی فلمی زندگی کا آغاز سن ۴۴۔۱۹۴۳ء میں شالیمار کمپنی پونا سے ہوا اس کمپنی سے ہی جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی، کرشن چندر اور کئی دوسرے منسلک تھے۔ پونا اور ممبئی میں اپنی آدھی صدی لمبی زندگی میں، وہ کامیاب تصویروں کے ساتھ، کئی اہم شعری مجموعوں کو بھی پیش کرتے رہے ہیں۔ ان کے پہلے مجموعے گرداب اور آب جو کے بعد باقی کی ساری شعری کتابیں جن میں، سب رنگ، یادیں، بنت لمحات، نیا آہنگ اور زمین زمین شامل ہیں، اسی دور کی دین ہیں۔

اختر الایمان اب جس علاقہ میں رہتے ہیں وہ ممبئی کے امیر علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔

یہاں رہنے سہنے کے آداب دوسری جگہوں سے مختلف ہیں۔ اخترالایمان اپنے سفید کھادی کے کرتے پاجامے کے علاوہ پورے طور سے اس علاقے کے آداب نبھاتے ہیں۔ ہر صبح وہ پابندی سے ایک بڑے سے الیسشین کتے کے ساتھ نکلتے ہیں اور دیر تک سمندر کے کنارے ٹہلتے ہیں۔ اس چہل قدمی کا زیادہ وقت غیر ملکی کتے کے خلاف دیسی کتوں کے پر شور احتجاج کو شانت کرنے میں گذرتا ہے۔

ان کا کتا دیسی زبان سے واقف نہیں ہوتا اس لئے وہ دیسی کتوں کے شور کو صرف حیرت سے سنتا ہے، ان کی بولی کو سمجھ کر ان سے سوال جواب اخترالایمان کرتے ہیں۔ کبھی ہاتھ کی لکڑی ہلا کر کبھی آواز بنا کر۔ ان کا الیشین روز کے اس بحث و مباحثہ پر توجہ دیئے بغیر آگے بڑھتا رہتا ہے۔

اخترالایمان جس راستے میں چہل قدمی کرتے ہیں، ان میں زیادہ تر سیر کرنے والوں کے ہاتھوں میں اپنے اپنے غیر ملکی کتوں کی زنجیریں ہوتی ہیں۔ ان میں جرمن، فرانسیسی، افغانی، روسی، ہر ملک کے نمائندے ہوتے ہیں۔ مختلف جغرافیہ، تاریخ اور زبانوں کے یہ کتے اپنی پہلی نسل میں ناسمجھیا کے شکار ہوتے ہیں لیکن دوسری تیسری نسل میں اپنے مالکوں کی طرح ہندوستانی بن جاتے ہیں۔ پھر پیار محبت کے معاملات میں بھی یہ ذات پات کی حدوں کو توڑنا پھوڑنا شروع کردیتے ہیں۔ ان کی اس توڑ پھوڑ سے جو نسل سامنے آتی اس کی قیمت ضرور کم ہو جاتی ہے۔ لیکن اس سے ایک فائدہ ہوتا ہے، اسے نہ اب چھوٹے ہوئے وطن کی یاد ستاتی ہے، نہ رستوں میں دیسی کتوں کی بھیڑ اسے پردیسی جان کر شور مچاتی ہے۔

لگتا ہے ہمارے دیش کے کتے سیاسی لیڈروں سے زیادہ مہذب اور سمجھدار ہوتے ہیں۔ وہ دوسری یا تیسری نسل کے بعد اجنبیت کو وداع کردیتے ہیں جب کہ سیاسی رہنما کئی ملی جلی نسلوں کے بعد بھی انسانوں کو ذات پات اور دین دھرم کے خانوں میں بانٹنے پر اصرار کرتے ہیں۔

اخترالایمان کے گھر میں ایک اچھی خاصی لائبریری ہے۔ اس کتابوں سے بھرے

کمرے میں ایک دو چہرہ تصویر بھی ہے۔ اس میں ان کی اپنی تصویر کے ساتھ آدھے فریم میں مرزا غالبؔ کا چہرہ ہے۔ یہ تصویرِ غالبؔ سے ان کی عقیدت کا اظہار بھی ہے اور ان کے شعری رویہ کا کردار بھی۔

ان کی شاعری کا مرکزی کردار، غالبؔ کے آدمی اور انسان کے تضاد و تصادم کا آئینہ دار ہے۔ یہ وہ کردار ہے جو ترقی پسندوں کے آدمی کی طرح سفید و سیاہ میں منقسم نہیں ہوتا۔ اس میں بہ یک وقت سفید میں سیاہ اور سیاہ میں سفید کی آمیزش کا فطری عمل نمایاں ہے۔ اخترالایمانؔ کے یہاں یہ آدمی غالبؔ کی اسی فکری نہج کی بازیافت ہے جو ہر اک بات میں یوں ہوتا تو کیا ہوتا، کے تجسس اور تشکیک سے تعمیر ہوئی ہے۔ اس آدمی کو اخترالایمان نے نئے سیاق وسباق میں زندگی کے عملی رنگوں سے مصور کیا ہے جو ہم عصر شاعری میں مختلف بھی ہے اور زیادہ تخلیقی بھی ہے۔ یہ شاعری کسی جامد یایک رخی فلسفہ یا نظریہ کے دائروں سے آزاد ہو کر کائنات میں زندگی کے وجود میں آنے اور عدم میں کھو جانے کے ایک مسلسل مگر بے منزل سفر سے عبارت ہے اس جدوجہد کا حصار رزق و جنس کی تلاش و حصول کا دائرہ ہے۔ اخترالایمانؔ نے اپنی سوانح ''اس آباد خرابے'' میں لکھا ہے۔

''میں سوچتا ہوں مہاتما بدھ کی طرح دنیا چھوڑ کر چلا جاؤں۔ مگر مہاتما بدھ کے سامنے تو ایک آدرش تھا۔ میرے سامنے کیا ہے۔ میں ایک مدت سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مسائل جوں کے توں رہتے ہیں۔ آدمی مرتا کھپتا رہتا ہے۔ زندگی کا کوئی بڑا مقصد نہیں ہے۔ یہ زمین پر محض اتفاقی اور حادثاتی ہے۔ روٹی کی تلاش اور جنس کی لذت کے حصول کے بعد اس کے پاس اور کچھ نہیں رہتا۔ اس لئے وہ روز نئے مسائل اٹھاتا رہتا ہے''

اردو کی سات سو ساڑھے سات سو سالہ شعری تاریخ میں اخترالایمانؔ اپنے علاوہ صرف غالبؔ سے ہی عقیدت رکھتے ہیں لیکن اس عقیدت میں بھی ان کا رویہ مریدانہ سے زیادہ ناقدانہ ہے۔ وہ اپنی شاعری میں ہی صنف غزل کے مخالف نہیں ہیں، غالبؔ کی عظمت میں جو تھوڑی بہت کسر انہیں محسوس ہوتی ہے اس کا قصوروار بھی وہ اسی کو ٹھراتے ہیں۔ ان کا

خیال ہے، مرزا غالبؔ نے غزل کو غزل بنایا لیکن غزل نے، وہ جتنے تھے اس سے بہت کم کر کے انہیں دکھایا۔ پاکستان میں طلوع افکار کراچی میں چھپے اپنے ایک انٹرویو میں غالبؔ کے ایک مشہور شعر۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب! ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقش پایا

کا حوالہ دیتے ہوئے وہ فرماتے ہیں۔ "اب اس بات کا نہ تو کوئی سیاق ہے نہ سباق۔ لیکن اگر اسی پہلو کو نظم کا پیکر ملتا تو وہ کتنی بڑی نظم ہوتی اور انسان کی تمنا اور زندگی کی نارسائیوں سے کیا خوبصورت ڈرامہ وجود میں آتا۔

غالبؔ کے بارے میں ان کی یہ رائے کہاں تک درست ہے یہ تو ناقد حضرات ہی بتا سکتے ہیں لیکن اس سے ان کے ذہنی رویہ کا سراغ ضرور ملتا ہے۔ حالانکہ انہوں نے اپنے تعلق سے ایک جگہ لکھا ہے۔

"میں اپنی شاعری کے بارے میں کیا لکھوں میری عادت ہے کہ میں صرف کام کرتا ہوں اور نتیجہ وقت پر چھوڑ دیتا ہوں۔ یہ کام بھی وقت ہی کرے گا"

لیکن حقیقت میں انہوں نے یہ نتیجہ وقت پر چھوڑا نہیں، اپنی شاعری کے مسلسل مطالعہ کے بعد وہ خود اس نتیجہ پر پہونچ چکے تھے کہ انہوں نے جو شاعری کی ہے وہ نہ صرف اہم ہے بلکہ یہی شعری پیمانہ دوسروں کی شاعری کو جانچنے پرکھنے کا پیمانہ بھی ہے۔ اختر صاحب کی اس کسوٹی پر کوئی دوسرا پورے طور پر کھرا نہیں اترتا۔ نہ ماضی میں نہ حال میں۔

فیضؔ، مجازؔ، مخدومؔ انہیں جتنے پسند ہیں اس سے زیادہ ناپسند ہیں۔ ان تینوں کی شاعری میں جو چیز انہیں کھٹکتی ہے وہ اسے غزل زدہ زبان سے تعبیر کرتے ہیں اور جس کو وہ اچھی شاعری کے لئے نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ اپنے پسندیدہ شاعروں کے تعلق سے ان کی پسند، ایک تہائی، دو تہائی یا تین چوتھائی سے کبھی آگے نہیں بڑھتی۔ مجید امجد انہیں پسند ہیں، اس پسندیدگی کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان کے خیال سے ان کی طرح شاعری کرتے ہیں، لیکن اسی تقلید کو وہ ان کی شاعری کا نقص بھی سمجھتے ہیں۔ ناصر کاظمی کے بارے میں ان کی رائے ہے وہ شاعر

اچھے ہیں لیکن ان میں کمی یہ ہے کہ وہ غزل ہی میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں۔ مرزا غالبؔ سے بھی انہیں یہی شکایت ہے۔ ن م راشد کے بارے میں ان کی رائے یوں ہے۔ راشد صاحبِ طرز شاعر ضرور ہیں لیکن ایک طرح کا بڑبولا پن ان میں بہت ہے۔ غیر ضروری بلند آہنگی پیدا کرنے کی شعوری کوشش نے ان کی شاعری کو مجروح کیا ہے"۔

سردار جعفریؔ اور کیفی اعظمی کو تو وہ سرے سے شاعر ماننے سے ہی انکار کرتے ہیں۔ سردار کے لئے موزوں طبع کی اصطلاح گڑھتے ہیں اور کیفی پر محض ورس فائر (شعر ساز) ہونے کا الزام جڑتے ہیں۔ ترقی پسندوں نے ایک اخترالایمانؔ کو نہیں مانا۔ اخترالایمانؔ نے پوری ترقی پسند تحریک کو نہیں گردانا۔ یہ اور بات ہے کہ ترقی پسندوں نے جن سماجی اور اقتصادی اقدار کو ادب کے لئے ضروری ٹھہرایا تھا، اخترالایمانؔ نے انہیں سے اپنی شاعری کو سجایا تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اکثر ترقی پسندوں کے یہاں ان کا اظہار وضاحتی اور نظریاتی ہے، اور اخترؔ صاحب کے یہاں تجرباتی اور ذاتی ہے...... ان کا یہ تنقیدی رویہ اپنے معاصرین کے ساتھ ہی نہیں تھا، اپنے سے چھوٹے شاعروں کے ساتھ بھی تھا۔ ایک بار لکھنؤ دوردرشن پر نداان کا انٹرویو کرتا ہے۔ ان سے پوچھے گئے کئی سوالوں میں ایک سوال تھا۔ اخترؔ صاحب آپ کے بعد کی نسل کے شاعروں میں جو شاعر ہیں جیسے قاضی سلیم، عمیق حنفی، باقر مہدی، خلیل الرحمٰن اعظمی وغیرہ ان کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟ اخترالایمان کا جواب تھا، نسل کتوں اور گھوڑوں کی ہوتی ہے۔ شاعروں ادیبوں میں صرف اچھے یا برے ادیب ہوتے ہیں...... تم نے جو نام لئے ہیں ان کے بارے میں ابھی سے رائے جاننے کی عجلت کیا ہے، وہ لکھ رہے ہیں، ابھی اور لکھیں گے، انہیں لکھنے دو۔ اخترالایمانؔ نے جن کے بارے میں، ابھی اور لکھیں گے انہیں لکھنے دو، جیسے سرپرستانہ جملے تراشے تھے۔ ان میں سے ہر ایک اس وقت پچاس پچپن سے گذر کے ساٹھ پینسٹھ کے دائرہ میں داخل ہو چکا تھا۔ اخترالایمانؔ کے جس شعری مجموعہ 'یادیں' کو ساہتیہ اکادمی کے انعام سے نوازا گیا تھا۔ وہ ۱۹٦۰ء میں شائع ہوا تھا اور اس وقت ان کی عمر پچاس سے تین چار سال کم تھی۔ اخترالایمانؔ نے اپنے ہر شعری مجموعہ میں دیباچہ کے

طور پر اپنی شاعری اور اس کی تفہیم کے آداب پر تفصیل سے لکھا ہے۔ ان تحریروں میں وہ اپنی شاعری کے تعلق سے ہم عصر تنقید کی بے توجہی کے گلہ مند بھی نظر آتے ہیں۔ ان کی شعری شناخت اور اپنی شاعری پر ان کے اعتماد کی بحالی میں انہیں ناموں کا اہم رول رہا ہے جن کے بارے میں ابھی ان کی کوئی رائے نہیں تھی۔ اختر الایمان کی رائے اپنی شاعری کے بارے میں اتنی زیادہ اچھی تھی کہ وہ دوسروں کی شاعری یا تو سرے سے پڑھتے ہی نہیں تھے یا کبھی پڑھتے بھی تھے تو انہیں اس میں اپنی شاعری کے اثرات ہی دکھائی دیتے تھے۔ جدید شاعروں کو وہ خود سے قریب ضرور محسوس کرتے تھے مگر اپنے مقلد کی حیثیت سے ان کی رائے میں ہندوپاک میں ان کے بعد جو شاعری وجود میں آئی ہے اس کا زیادہ حصہ قابل توجہ نہیں ہے، جو توجہ کے قابل ہے وہ وہی ہے جو ان کی تقلید میں ہے۔ اس لئے قابل توجہ ہوتے ہوئے بھی اہم نہیں ہے۔ اپنی شاعری اور شعری قواعد پر ان کی یہی خوش اعتقادی، ان کی تخلیقی طاقت بھی رہی ہے اور اسی نے ان کے انفرادی اسلوب کی حفاظت بھی کی ہے۔

ایک دفعہ سردار جعفری اختر الایمان کے سامنے اپنی مصروفیات کا ذکر کر رہے تھے۔ ان مصروفیات میں کئی مشاعروں کے دعوت نامے شامل تھے۔ مشاعروں کی تاریخوں اور ان کے ملکی و غیر ملکی مقامات کا بیان ابھی جاری تھا کہ اختر الایمان نے انہیں درمیان میں ٹوکتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ سردار، تمہاری مصروفیات تمہیں مبارک، مجھے تو تعجب اس پر ہے کہ شاعر تو میں ہوں اور مشاعروں کے منتظمین دعوت نامے تمہارے پتے پر پوسٹ کرتے ہیں آخر تم انہیں میرا ایڈریس کیوں نہیں بتا دیتے۔ اختر الایمان اپنی نظموں کی طرح بول چال کے جملوں میں بھی علامتی تہہ داریوں سے کام لیتے تھے۔ وہ سوچتے تھے سردار نے اپنی تنقیدی کتاب ترقی پسند ادب میں ان کی ادبی اہمیت سے دانستہ چشم پوشی کی ہے اور اس کا ازالہ اب ان کا فرض ہے۔ اختر الایمان مزاجاً کم سخن اور صلح پسند آدمی تھے۔ اپنے کالج کے دنوں میں اچھے مقرر ہونے کے باوجود وہ گفتگو میں بڑے سے بڑے مسئلہ کو بھی ایک دو جملوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ لیکن ان مختصر جملوں کی ساخت اور ادائیگی میں ایسی قطعیت

ہوتی تھی جن میں اختلاف کی گنجائش مفقود تھی۔ لیکن کبھی کوئی اختلاف کی گستاخی کر بیٹھتا تو وہ ہمیشہ کی طرح خاموشی اختیار کر لیتے تھے۔ ان کی خاموشی ان کی گفتگو سے زیادہ معنی خیز ہوتی تھی۔ اس میں بہ یک وقت حقارت اور ملامت دونوں کا امتزاج ہوتا تھا۔

فلموں سے ریٹائر ہونے کے بعد اخترالایمان پیڈر اسٹینڈ کے اپنے بڑے فلیٹ کو فروخت کر کے کارٹر روڈ پر اس عمارت کے ایک چھوٹے فلیٹ میں منتقل ہو جاتے ہیں جس میں پہلے سے باقر مہدی تھے۔ اس عمارت میں اخترالایمان پہلی منزل میں اور باقر پانچویں منزل میں ہیں۔ تخلیق پر تنقید کی یہ برتری اس بلڈنگ کی طرح کئی سالوں سے پورے ایوانِ اُردو میں رائج ہے۔ لیکن اس برتری کو اخترالایمان نہ پہلے مانتے تھے نہ اب مانتے ہیں۔ نتیجتاً نہ اخترالایمان درمیان کی چار منزلیں چڑھ کر ان تک جاتے ہیں، نہ باقر مہدی اپنی اونچائی سے اتر کے ان سے ملنے آتے ہیں۔ تنقید و تخلیق کے اس خود ساختہ فاصلہ کا دونوں کے پاس الگ الگ جواز ہے۔ اخترالایمان کا کہنا ہے جب کسی ضرورت مند کی ضرورتیں ختم ہونے کا نام نہ لیں تو فاصلہ پیدا ہونا ضروری ہے۔ باقر مہدی کا کہنا ہے جب کوئی فلموں میں کافی وقت گنوا چکا ہو اور پڑھنا پڑھانا چھوڑ چکا ہو تو اس سے فاصلہ رکھنا مجبوری ہے۔ ندا نے اخترالایمان کے ساتھ تین فلموں میں کام کیا ہے۔ ان میں سے دو کے فلمساز اور ہدایت کار فلم ایکٹر امجد خان تھے جو ان کے داماد بھی تھے۔ امجد کی شادی کی سالگرہ کی رات تھی۔ اس جشن میں انہوں نے ایک غزل سنگر کو مدعو کیا تھا۔ ایکٹر، ایکٹریس اور فلم ساز اور فلم سے وابستہ لوگوں کے اجتماع میں غزل سنگر عوامی پسند کی چیزیں گا رہا تھا اور داد پا رہا تھا۔ آدھے پورے نشہ میں سب اس پر نوٹ نچھاور کر رہے تھے اخترالایمان اس محفل میں سب سے الگ ایک کونے میں اپنے جام کا ساتھ نبھا رہے تھے۔ کچھ دیر وہ خاموشی سے عامیانہ قسم کی غزلیں سنتے رہے جب برداشت نہیں کر سکے تو جہاں بیٹھے تھے وہیں سے بلند آواز میں یوں گویا ہوئے۔

بند کرو یہ بکواس غزلیں۔ کچھ اچھا کلام ہو تو سناؤ ورنہ خاموش ہو جاؤ۔ اخترالایمان کی اونچی آواز سے محفل میں یکلخت سناٹا چھا گیا۔ غزل سنگر خاموش ہو گیا۔ سب لوگ جدھر

اختر الایمان بیٹھتے تھے ادھر دیکھ رہے تھے اور اختر صاحب اسی آواز میں بول رہے تھے۔ اب تو یہی طے کیا ہے۔ جتنی عمر باقی بچی ہے اس میں اچھا رہونگا، اچھا سنوں گا، اچھا پڑھوں گا......
اختر الایمان نے شروع سے ہی جیون کو اپنے طور پر برتا ہے اپنی طرح سے جیا ہے۔ زندگی کی ترجیحات اور انتخابات میں بھی انہیں کی مرضی کا دخل رہا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کو انسان کی ضمیر کی آواز کہا ہے۔ ان کے پاس اپنے اندر جھانکنے اور وجود کے تضادات کی پہچان کی آنکھ بھی ہے جس نے ان کی فکر میں انفرادی لنک اور اسلوب میں تازگی کی چمک پیدا کی ہے۔ لیکن انہوں نے سماج اور فرد کے .بر یہ سمجھو تہ کو جس طرح ایک سماجی قدر کے طور پر بار بار دہرایا ہے، اور اسے زندہ رہنے کے لئے ضروری ٹھہرایا ہے اس سے ان کا شعری کردار فار مولائی اور معاشرہ کے ایک بہت چھوٹے حصہ میں محصور محسوس ہوتا ہے۔ ان کے یہاں زندگی کا مقصد صرف زندگی کرنا ہے۔ اس کا رشتہ تاریخ، تہذیب اور وقت کے تسلسل سے کٹ کر یک رخا اور سمٹا ہوا لگتا ہے۔

خدا کا شکر بجالائیں آج کے دن بھی
نہ کوئی واقعہ گذرا نہ ایسا کام ہوا
زبان سے کلمۂ حق راست کچھ کہا جاتا
ضمیر جاگتا اور اپنا امتحان ہوتا
خدا کا شکر بجالائیں آج کے دن بھی
اسی طرح سے کٹا منہ اندھیرے اٹھ بیٹھے
ثبوت بیٹھے بصیرت کا اپنی دیتے رہے۔

☆☆☆

مانس مکھر جی کو گزرے ہوئے اب کئی سال ہو چکے ہیں۔ محبوب اسٹوڈیو کے پیچھے گراؤنڈ فلور پر اس کے دو کمروں کا گھر ایک زمانہ میں نداکارات دن کا ڈیرا تھا۔ اس گھر میں وہ ایک ادھیڑ عمر کے عیسائی پیٹر کے ساتھ اپنے پریوار کو بسائے ہوئے تھا۔ اندر کا کمرے پیٹر کا تھا۔ باہر کے حصہ میں دو بچوں اور بیوی کے ساتھ وہ خود رہتا تھا۔ پیٹر گوا کا رہنے والا تھا۔ تیس برس پہلے اس نے یہ جگہ پگڑی پر حاصل کی تھی۔ اس وقت اس کا ایک بھرا پرا خاندان تھا۔ بیوی مشنری کے اسکول میں انگریزی پڑھاتی تھی۔ وہ خود اٹامک پلانٹ میں سپروائزر تھا۔ ان تیس سالوں میں اس کا سارا خاندان چلتے پھرتے جسموں سے اب چند فریم جڑی چھوٹی بڑی یادوں میں بدل چکا تھا۔ پیٹر اب اکیلا تھا۔ تنہائی پسند۔ رات دن شراب پیتا تھا اور موم بتی کی روشنی میں کرائسٹ کی ایک مورتی سے باتیں کرتا رہتا تھا۔ پہلے وہ سوال کرتا تھا۔ پھر کرائسٹ بن کر اپنے سوال کا خود ہی جواب دیتا تھا۔ اس کے انہیں سوال جواب کو سن کر مانس کو معلوم ہوتا تھا، کب اسے شراب کے لئے پیسوں کی ضرورت ہے، کب اس کے کھانے کا وقت ہے! اس مکان کا کرایہ اب سمٹ کر پیٹر کی دو وقت کی روٹی اور پورے دن کی شراب بن چکا تھا۔ کرائسٹ کی مورتی کے نیچے قطار سے ایک بڑی اور دو چھوٹی بڑی تصویریں

رکھی تھیں۔بڑی تصویروں میں ایک میں صلیب پر ٹنگی سر پر رومال باندھے، گلابی اسکرٹ اور بلاؤز میں بڑی بڑی آنکھوں سے مسکراتا ہوا کتابی چہرہ مارگریٹ کا تھا۔اسی تصویر میں مارگریٹ کا ہاتھ چومتے ہوئے جو نوجوان سفید سوٹ میں کھڑا تھا،وہ تیس سال پہلے کا پیٹر تھا۔ پیٹر اور مارگریٹ ایک ہی کالج کے اسٹوڈنٹ تھے۔ان دونوں کی ملاقات کالج کے ایک سالانہ فنکشن میں ہوئی تھی۔اس میں پیٹر کے گٹار پر مارگریٹ نے ایک رقص پیش کیا تھا۔اس رات وہ دونوں دیر تک ساتھ ساتھ چل کر اپنے گھر گئے تھے۔اور اسی رات دونوں نے ہولے ایک دوسرے کو پسند کر لیا تھا۔ لیکن مارگریٹ کا ڈیڈی اس رشتہ کے خلاف تھا۔وہ مارگریٹ کے لئے اپنی پسند کا ایک لڑکا بھی طے کر چکا تھا۔مارگریٹ کو پیٹر سے محبت ضرور تھی لیکن ڈیڈی کو وہ ناراض بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کم عمری میں ہر قربت محبت کا روپ دھار لیتی ہے۔بعد میں جب یہ نشہ اتر جاتا ہے تو آدمی پچھتاتا ہے۔ مگر گیا وقت واپس نہیں آتا ہے۔باپ کی زندگی تک اس نے گولیوں کے سہارے اپنا کنوارا پن قائم رکھا،لیکن باپ کے مرتے ہی حاملہ ہو گئی اور پھر تین چار سال میں ہی دو بچوں کی ماں بن گئی۔ لیکن ماں بننے کے بعد بھی وہ کالج کے دنوں کی مارگریٹ ہی تھی۔

ایک رات اس نے پیٹر کو گہری نیند سے جگا کر کہا۔

پیٹر ہم میاں بیوی بن گئے۔بچوں کے ماں باپ بھی ہو گئے، لیکن ہم ہنی مون کے لئے کبھی نہیں گئے۔

جاتے کیسے! جب ہم نے شادی کی تھی اس وقت تمہارے ڈیڈی زندہ تھے۔جب وہ مرے تو ہم نئے سے پرانے ہو چکے تھے۔اچانک جگائے جانے سے وہ جھنجھلاتے ہوئے جواب دیتا ہے۔

ہنی مون عورت کے مہر کی طرح مرد پر قرض ہوتا ہے جس کو ادا کیے بغیر رشتہ میں حسن نہیں آتا۔میں پھر سے تمہارے ہاتھ میں گٹار دیکھنا چاہتی ہوں۔میں پھر سے اس گٹار کی دھن پر ناچنا چاہتی ہوں۔ مجھے ناچے ہوئے اور تمہیں گٹار بجائے ہوئے کتنا عرصہ بیت

گیا۔

اس رات کے بعد زندگی یونہی اپنے معمول سے گذرتی رہی بچے اسکول جاتے رہے۔ پیٹر وقت پر آفس جاتا رہا۔ مارگریٹ پہلے کی طرح اسکول جاتی رہی۔ لیکن اب وہ پہلے کی طرح بولتی نہیں تھی۔ وہ خاموش رہنے لگی تھی۔

اچانک ایک دن مارگریٹ کے اسکول کی پرنسپل نے فون کرکے پیٹر کو بلایا۔ مارگریٹ اپنی کلاس میں، بچوں کو پڑھانے کے بجائے ان کے سامنے ناچ رہی تھی اور پوری کلاس اس تماشہ پر تالیاں بجا رہی تھی۔ مارگریٹ کو نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ وہ اس دن کے بعد عجیب عجیب باتیں کرنے لگی تھی۔

ایک دن کہنے لگی ڈیڈی آئے تھے۔ میں نے ان کی پسند کے ولیم ڈی سوزا سے شادی نہیں کی۔ اور تمہارے ساتھ رہنے لگی، اس لئے وہ مجھ سے ناراض تھے۔

ایک صبح پیٹر روز کی طرح بچوں کو اسکول کے لئے تیار کر رہا تھا۔ مارگریٹ پاس کھڑی دیکھ رہی تھی۔ جیسے ہی وہ بچوں کے ساتھ باہر نکل رہا تھا، اس نے پیٹر کا ہاتھ پکڑ کر کہا......

پیٹر ہماری جو تصویر اندر رکھی ہے میں اس میں جس طرح ہنس رہی ہوں، ایسی ہنسی میں اب کیوں نہیں ہنستی؟ پہلے مجھے بہت ہنسی آتی تھی۔ پہلی بار جب ہم ملے تھے تو تم نے کہا تھا میری ہنسی بہت خوبصورت ہے۔ وہ ہنسی اب میرے ہونٹوں سے کیوں غائب ہے۔ تمہیں معلوم ہے ڈیڈی جب مجھ سے ملنے آئے تھے اپنے ساتھ ڈی سوزا کو بھی لائے تھے وہ ویسے ہی سوٹ میں تھا جیسا تم کالج میں پہنتے تھے۔ لیکن میرا وہ سوٹ پرانا ہو چکا ہے۔

اور ہنسی؟

"اس لئے کہ ہم اپنے حصہ کی ہنسی ہنس چکے ہیں۔ اب ہنسنے کے دن ہمارے نہیں ان بچوں کے ہیں۔ پیٹر ترشی سے جواب دیتا ہے مارگریٹ اور پیٹر کا لڑکا جوان دونوں کی بات سن رہا تھا اچانک بولتا ہے۔

نہیں پاپا جوگرس پارک کے سامنے ایک لافنگ کلب بنا ہے، وہاں آپ کی اور ممی کی عمر

والے بہت سارے لوگ روز صبح ہنسنے آتے ہیں۔ وہاں سب مل کر ایک ساتھ ہنستے ہیں۔ ہاہا، ہو ہو، وہ نقلی ہنسی ہنس کر دکھاتا ہے۔

مارگریٹ کو اپنے لڑکے کی نقل اچھی نہیں لگی۔ وہ منا کچھ کہے اندر لوٹ جاتی ہے۔ شام کو آفس سے لوٹنے کے بعد، پیٹر کو گھر میں مارگریٹ نہیں ملی۔ اس کے ہاتھ کا لکھا ایک خط ملتا ہے۔

"پیٹر مجھے افسوس ہے، ڈیڈی کی ناراضگی اب اور زیادہ برداشت نہیں ہوتی مجھ سے۔ میں انہیں منانے کے لئے گوا جا رہی ہوں مجھے وشواس ہے، وہ جب مجھے معاف کر دیں گے تو میری روٹھی ہوئی ہنسی بھی مجھے واپس کر دیں گے۔ میں اب اسی وقت تمہارے پاس آؤنگی جب میری ہنسی مجھے مل جائے گی۔"

مارگریٹ کو جیتے جی اس کی ہنسی واپس نہیں ملی اور اسی غم میں وہ ایک دن نیند کی بہت ساری گولیاں کھا کے ہمیشہ کے لئے سو گئی۔ اس کی قبر اس کے باپ کی قبر کے پاس ہے۔

مارگریٹ کے اس طرح چلے جانے سے گھر ہوتے ہوئے گھر میں سے گھر غائب ہو جاتا ہے۔ اس کی بڑھتی لاپرواہی اسے نوکری سے الگ کر دیتی ہے۔ شراب عادت بن کر اس کی کمزوری بن جاتی ہے۔ اسی ماحول میں بچے جیسے تیسے بڑے ہو کر اپنے اپنے راستوں میں نکل پڑتے ہیں۔ لڑکی کسی کے ساتھ کناڈا جا کر بس جاتی ہے۔ لڑکا ایک مرڈر کے جرم میں دہلی کی ایک جیل میں بند ہے۔

ندا جب پیٹر سے ملا تھا تو وہ بالکل اکیلا تھا۔ آدھے مکان کے کرائے کے بدلے میں اس کی شراب اور کھانے پینے کی ساری ذمہ داری مانس کی تھی۔ جب دیکھو وہ اندر کمرے میں شراب پیتا تھا یا کرائسٹ کی مورتی سے باتیں کیا کرتا تھا۔ وہ اپنا ہر کام اس مورتی سے پوچھ کر ہی کرتا تھا۔ وہ مورتی سے سوال کرتا اور مورتی اسی کی آواز میں اس کے ہر سوال کا جواب دیتی تھی۔

"جیزس کیا میں شراب پی سکتا ہوں"

"مبارک ہو تم جو غریب ہو کیونکہ خدا کی بادشاہی تمہاری ہے"

ایک دن اسی طرح اس نے گھر چھوڑنے کو کہا اور موری نے پیٹر کی زبان سے انجیل کے جملے دہرائے۔ 'جو کوئی مانگتا ہے اسے ملتا ہے اور جو ڈھونڈتا ہے وہ پاتا ہے اور جو کھٹکھٹاتا ہے اس کے لئے دروازہ کھولا جائے گا۔'

اپنے منہ سے موری کے یہ مقدس جملے بول کر وہ اٹھا اور خالی ہاتھ گھر سے باہر نکل گیا۔ اس کا گٹار اور تصویریں مہینوں اس کا انتظار کرتی رہیں مگر وہ واپس نہیں آیا۔ بعد میں اس کا گٹار تھوڑی بہت مرمت کے بعد مانس کی سنگت میں شامل ہو گیا اور پرانی تصویروں کے فریموں میں نئی تصویریں جگمگانے لگیں۔ ایک میں مانس شانتی نکیتن کے گراؤنڈ میں ایک پیٹر کے نیچے کھڑا ہے اس میں جو لڑکی اسے مسکرا کر دیکھ رہی ہے وہ اس کی بیوی سونالی ہے۔ سونالی اب مارگریٹ کی طرح دو بچوں کی ماں ہے۔

☆☆☆

مانس کے اس گھر میں ندا کی طرح اور بھی کئی لوگوں کا جما ور ہتا تھا۔ ان میں کوئی فلم ساز بننے کا خواہش مند تھا، کوئی ہدایت کار بننا چاہتا تھا۔ کوئی رائٹر بننے کے لئے جدو جہد کر رہا تھا۔ ان میں ایک ہدایت کار سے ندا کی پہلے سے جان پہچان تھی۔ جب وہ کسی فلمی پارٹی میں پہلی بار ملے تھے تو ان کا نام موہن سنگھ کاویہ تھا۔ اب پانچ چھ سال کی دوستی کے بعد ان کی جسمانی، آبائی، ذہنی اور رہن سہن کی خصوصیات نے ان کے نام کو فل اس کیپ کاغذ کی ڈیڑھ سطر لمبا کر دیا تھا۔ ان کو خط لکھنا ہوتا تھا تو ایڈریس کے لئے الگ سے کوئی بڑا لفافہ تلاش کرنا پڑتا تھا۔ پوسٹ آفس کا لفافہ یا کارڈ تو ان کے صرف نام سے ہی بھر جاتا تھا، علاقہ، محلہ اور پوسٹل کوڈ کے لئے جگہ نہیں بچتی تھی۔ ان کا نام ملک کی آبادی کی طرح بڑھ گیا تھا اور لفافہ اور کارڈ کا سائز ملک میں روٹی، پانی اور مکان کی طرح محدود تھا۔ ان کا پورا نام اس طرح تھا۔

ٹھاکر موہن سنگھ کاویہ، ڈنڈ بیٹھکیں، دودھ لسی، پستے بادام، دوپہر کا آرام، شام کا جام، عشق میں بدنام، شادی میں ناکام، لڈو بے پور والا، پراتن پراچین، ڈائریکشن کے شوقین، لیکن غمگین!

اس لمبے چوڑے نام میں ان کی پچاس سالہ زندگی کی پوری داستان چھپی ہوئی تھی۔ ندا جب بھی انہیں دیکھتا ان کے پورے نام سے ہی مخاطب کرتا تھا۔ وہ خاموشی سے سنتے رہتے تھے۔ اور جب نام پورا ہو جاتا تھا تو وہ زور کا ایک قہقہہ لگا کر ندا کے کندھے کو اپنے مضبوط ہاتھ سے داب دیتے تھے ان کے ہاتھ کا دباؤ ندا کو بہت بھاری پڑتا تھا۔

جے پور کے قریب کسی چھوٹے سے قصبہ کے رہنے والے تھے۔ والدین نے خاندانی روایت کے مطابق بچپن میں ہی شادی کے بندھن میں باندھ دیا تھا۔ ہوش سنبھالنے تک دو تین بچوں کے باپ بن گئے تھے۔ لیکن عمر کے لحاظ سے مزاج میں ابھی تک لڑکپن تھا ایک دن رات کو دیر سے لوٹے تو بیوی کو چولہے کے پاس انتظار کرتے نہیں دیکھا۔ ماں کو انہوں نے ہمیشہ اسی روپ میں دیکھا تھا دیر رات تک باپ کا انتظار کر۔ بیوی میں ماں نہیں ملی تو خاموشی سے خود کھانا نکال کر کھایا لیکن ٹھاکر کو ٹھکرائن کی یہ گستاخی کھل گئی۔ دوسرے دن، بنا کچھ کہے سنے جے پور آ گئے کچھ دن وہاں کسی اسکول میں نوکری کی اور جب مالی اعتبار سے اس قابل ہو گئے کہ آگے کا سفر کر سکیں تو جے پور سے پونہ چلے آئے اور پونہ انسٹی ٹیوٹ میں ڈائریکشن کے شعبہ میں داخلہ لے لیا۔ گوگی آنند اور منی کول بھی انہیں دنوں ان کے ہم جماعت تھے۔ ڈپلومہ حاصل کرنے کے بعد رمیش سہگل کے پروڈکشن کے لئے پہلی فلم انتظار بنائی۔ فلم انتظار بننے کے دوران ہیروئن سے عشق کر بیٹھے اس عشق نے منظر نامہ میں ہیروئن کے سین اتنے بڑھا دیے کہ کہانی پہلے سے مختلف ہو گئی۔ اور اُمید کے خلاف ناکام ہو گئی۔ فلم کی ناکامی نے پھر سے بے روزگار کر دیا، اس بے روزگاری کی وجہ سے ہیروئن نے ان کی محبوبہ بننے سے انکار کر دیا، لیکن محبوبہ کے انکار نے جب جیون جینا دشوار کر دیا تو انہوں نے بھی اپنے اندر چھپے ہوئے راجستھان کے ٹھاکر کو بیدار کر دیا...... انہیں جب بھی محبوبہ کی بے وفائی زیادہ ستاتی تو وہ غم ہجر میں آنسو بہانے یا آہیں بھرنے کے بجائے اچانک اٹھ کر سو دو سو بیٹھکیں نکال لیتے یا ڈنڈ پیل لیتے۔ وہ محبوبہ کے غم کو آنکھوں سے رونے کے بجائے کسرت کے پسینہ سے بجھاتے تھے۔ ایسی کسرت کے دورے ان کو دن میں کئی بار پڑتے تھے۔ ہر بار وہ بدن کو تھکا کر دودھ یا لسی پیتے رہتے تھے۔ وہ عاشق ضرور تھے۔ لیکن عشق میں نحیف وزار مجنوں کے مقلد نہیں تھے۔ وہ جان ہے تو جہان ہے کے قائل تھے وہ غم یار بھی اٹھاتے رہے اور کسرت اور خوراک سے جسم کو بھی توانا بناتے رہے۔

ان دنوں کا وہ بل روڈ کے پیچھے، کرسچین علاقہ کی ایک چھت پر ٹین کی چھوٹی سی کھولی

میں رہتے تھے۔ اس کھولی میں ایک سونے کے لوہے کے پلنگ کے علاوہ باقی کی ساری جگہ ہندی اور انگریزی کی کتابیں بھری تھیں۔ وہ مہاتما بدھ کی طرح ایک بار گھر سے نکل کر بیوی کی زندگی تک گاؤں واپس نہیں گئے۔ وہ بے چاری جب تک زندہ رہی ہر آتے جاتے کے ہاتھ اپنے ہاتھوں سے راجستھان سے لڈو بنا کر بھیجتی رہی اور اس بہانے اپنے منگل سوتر کی رکھشا کرتی رہی۔ ان لڈوں کو وہ خود بھی شوق سے کھاتے اور یار دوستوں کو بھی کھلاتے اور بیوی کی وفاداری کا قصیدہ سناتے۔

ایک بار ان لڈوؤں کو لانے والا کاویہ صاحب کی ہی عمر کا ان کی بڑی بہن کا بیٹا تھا۔ اس کا نام اندھیر سنگھ تھا اور تخلص سودائی تھا۔ وہ اپنے ماما کی ڈائریکشن میں بننے والی فلم میں گیت لکھنے آیا تھا۔ کاویہ کی چھت پر ہر شام محفل جمتی تھی۔ محفلوں میں مانس اور ندا روز کے شریک ہونے والوں میں تھے۔ جس روز سودائی آیا تھا وہ رات سودائی کی شاعری کے لئے وقف تھی۔ سودائی اپنے ماما کی فرمائش پر ایک کے بعد ایک غزل یا گیت سنا رہا تھا اور محفل میں شریک لوگوں سے داد پا رہا تھا۔ اس کا ایک شعر یوں تھا۔

ہم نے تم سے پیار کیا بیکار کیا
تم جیسے کو یاد کیا بیکار کیا

اس کے دو گیتوں کو اس رات، مانس نے اپنی دھن میں گایا بھی تھا۔ لیکن یہ داد اور عزت سودائی کے لئے اسی رات تک تھی۔ دوسرے دن سے اس کا کام گھر میں اسٹو جلا کر چائے بنانا یا باہر سے شراب لانا تھا۔ وہ اپنے ماما کے پاس گیت کار بننے آیا تھا لیکن ماما نے اسے بھانجے سے نوکر بنا دیا تھا۔ یہ اسے پسند نہیں تھا۔ وہ کاویہ کی غیر موجودگی میں ندا سے اپنے ماما کے رویہ کی شکایت بھی کرتا تھا۔ لیکن مجبور تھا۔

روز کی طرح اس رات بھی چھت پر قہقہے لگائے جا رہے تھے، جام چھلکائے جا رہے تھے، کاویہ کی بننے والی فلم کے لئے تیار کئے ہوئے ندا کے گیت گائے جا رہے تھے اور ایسے میں بار بار الگ کونے میں بیٹھے سودائی کو بلایا جاتا تھا اور کسی نہ کسی کام سے باہر بھیجا جاتا تھا۔ اس سے نہ

شراب کے لئے پوچھا جارہا تھا۔ نہ کلام سنانے کو کہا جارہا تھا۔ جب سب لوگ نشہ کے آخری دور سے گذر رہے تھے۔ سودائی خاموشی سے اٹھ کر اندر کمرے میں گیا اور کاویہ کے پرس میں جتنے روپے تھے وہ لے کر ہوا ہو گیا۔ اس کے اچانک غائب ہو جانے سے کاویہ پہلے ضرور فکر مند ہوئے لیکن جب انہوں نے اپنا خالی پرس دیکھا تو چین کی نیند سو گئے۔ دوسرے دن جب ندا صبح آٹھ بجے چہل قدمی سے واپس آیا تو اسے اپنی بلڈنگ کے کمپاؤنڈ میں ایک دبلا پتلا شخص صرف انڈرویر پہنے، اسے اس کے نام سے پکارتا نظر آیا۔ قریب سے دیکھا تو معلوم ہوا وہ گیت کار سودائی ہے۔ قمیض غائب، بنیان غائب، پینٹ غائب، پیروں سے چپلیں غائب، ندا کے پوچھنے پر اس نے بتایا وہ غصہ میں جو کاویہ کے پندرہ سو روپے لے گیا تھا اس سے رات بھر اس نے کئی شراب خانوں میں شراب اڑائی، شہر میں جی بھر کے ٹیکسی گھمائی اور آخر میں کانگریس ہاؤس میں گانا سننے چلا گیا۔ (کانگریس ہاؤس گرانٹ روڈ پر طوائفوں کا مشہور اڈا ہے۔ رات بھر یہ اڈا قہقہوں سے روشن رہتا ہے۔)

یہ تو سب ٹھیک ہے لیکن تمہارے کپڑے اور جوتے کہاں چلے گئے؟

پتہ نہیں کہاں گئے۔ ہوش رہنے تک جو میں نے دیکھا تھا وہ تمہیں بتادیا۔ اس کے بعد صبح میں نے کانگریس ہاؤس کے باہر جس طرح اپنے آپ کو پڑا پایا اس طرح تمہارے سامنے ہوں۔ اس نے جواب دیا۔

لیکن تمہیں یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ خود بھی پریشان ہوئے اور اپنے ماما کو بھی پریشان کیا......!

تم درست کہہ رہے ہو ندا جی، مجھے بھی جو ہوا اس کا اب افسوس ہو رہا ہے۔ لیکن اس وقت...... ان کا بیوہار کھل گیا۔ آخر میں ان کی بہن کا بیٹا ہوں۔ میں بھی شاعر ہوں میری بھی کوئی عزت ہے۔

ندا اسے پھر سے آدمی بنا کر دوپہر کے وقت کاویہ کے پاس لے گیا۔ وہ دوپہر کے کھانے کے بعد ان کے سونے کا وقت تھا۔ لیکن آج وہ سوئے نہیں تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ہمارا ہی انتظار

کرر ہے تھے۔ پہلی دستک پر ہی دروازہ کھول دیا اور سودائی کو دیکھ کر خاموشی سے اندر چلے گئے۔ ایسا لگتا تھا اب سے پہلے بھی سودائی ان کے ساتھ ایسا کر چکا تھا...... ندا نے جب ان سے سودائی کو معاف کرنے کو کہا تو وہ تھوڑی سی خاموشی کے بعد سودائی کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ اسے میری معافی کی کیا ضرورت ہے۔ قصور اس کا نہیں ہے میری اپنی قسمت کا ہے میں نے جب بھی جسے چاہا ہے اس سے دکھ ہی پایا ہے۔

وہ پانچ سو روپے نکال کر اسے اور دیتے ہیں اور کہتے ہیں۔ یہ لو ان سے اپنا واپسی کا ٹکٹ خریدنا، باقی جو بچیں اس سے گھر اپنی ماں کے لئے مٹھائی لے جانا تمہارا سامان تیار ہے۔ میرے ساتھ تمہیں ذلت محسوس ہوتی ہے۔ اب اپنے ساتھ عزت سے رہو۔

کاویہ گھر سے دور ضرور رہے۔ مگر گھر کی ذمہ داریوں سے بے خبر نہیں رہے۔ بیٹی کی شادی طے ہوئی تو اپنی چھت کی کھولی کو ڈیڑھ لاکھ میں بیچ کر ایک دوست کے یہاں شفٹ ہو گئے اور ساری رقم شادی میں لگا دی۔ فلم ڈویژن سے جیسے ہی نئی فلم کے لئے فنڈ منظور ہوا تو پہلا کام یہ کیا کہ اپنے لڑکے کو جو اس وقت ایم اے کر کے ایک مقامی کالج میں لیکچرر ہو گیا تھا اس سے نوکری چھڑوا کر اپنے پاس بلا لیا فلم شروع ہونے میں دیر ہوئی تو اس سے بھی وہی خدمت لینے لگے جو سودائی سے لیتے تھے۔ فنڈ منظور ہوا تھا مانس کی زندگی میں اور فلم شروع ہونے کی نوبت اس کے انتقال کے کئی سال بعد آئی۔ دس سال پہلے فلم کے گانے فلم ڈویژن میں اسکریپٹ داخل کرنے سے پہلے دھن اور لفظوں کے ساتھ تیار ہو چکے تھے۔ ایک دن اچانک کافی عرصے کے بعد کاویہ اپنے بیٹے کے ساتھ ندا کے گھر آئے اور کہنے لگے۔

پرسوں پہلے گانے کی ریکارڈنگ ہے۔ لفظوں میں کچھ تبدیلی کرنا چاہو تو کر دو۔

اتنے دنوں میں گیت کے لفظ ندا کے ذہن سے محو ہو چکے تھے۔ ٹیون پر لکھے ہوئے گیت یوں بھی مشکل سے یاد آتے ہیں۔ ندا ان سے پوچھتا ہے میوزک ڈائریکٹر کون ہے؟

میں! انہوں نے فخریہ کہا۔

ارینجر کون ہے؟

"میں"

انہوں نے سادگی سے کہا۔ میوزک ڈائریکٹر کی کیا ضرورت ہے۔ مانس کی طرزیں مجھے یاد ہیں کویتا کرشنا مورتی کی آواز میں میں خود ریکارڈ کروں گا۔ اور ہوا بھی یوں ہی انہوں نے خود میوزک بنولیا خود سنگر کو دھنیں سکھائی اور خود ساؤنڈ ریکارڈسٹ کے ساتھ بیٹھ کر گانے ریکارڈ کر لئے۔ جس کمپنی نے میوزک خریدنے کا وعدہ کیا تھا اس نے گانوں کا کیسٹ سن کر خاموشی اختیار کر لی اور اس خاموشی سے فلم بھی کئی سالوں تک ڈبوں میں بند پڑی رہی۔ بیٹا اکتا کر واپس جے پور جا کر بس گیا۔

لیکن کاویہ نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ ادھر ادھر چھوٹے موٹے کام کر کے جو تھوڑا بہت کماتے تھے اسی سے رکی ہوئی فلم کو تھوڑا بہت آگے بڑھاتے تھے۔ وقت نے فلم میں کام کرنے والے اداکاروں کے چہرے مہرے بدل دیے۔ جوان ادھیڑ ہوگئے، ادھیڑ بوڑھے ہوگئے۔ لیکن کاویہ کے وہ خواب جو اس فلم کی تکمیل سے وابستہ ہیں اب تک ویسے ہی ہیں جیسے پہلے تھے۔

ہر طرف ہر جگہ بے شمار آدمی
پھر بھی تنہائیوں کا شکار آدمی
صبح سے شام تک بوجھ ڈھوتا ہوا
اپنی ہی لاش کا خود مزار آدمی
ہر طرف بھاگتے دوڑتے راستے
ہر طرف آدمی کا شکار آدمی
روز جیتا ہوا روز مرتا ہوا
ہر نئے دن نیا انتظار آدمی
زندگی کا مقدر سفر در سفر
آخری سانس تک بے قرار آدمی

صبح کی چہل قدمی کے بعد ندا نئے دن کی پہلی چائے پی رہا تھا۔ آج کی چائے کئی دنوں

کے بعد اسے اچھی لگی تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس دن اخبار کی چھٹی تھی اور نیا دن فسادات، کرپشن، قتل وخون اور جنگوں کی خبروں سے محفوظ تھا۔ دوسری وجہ تھی آج وہ ٹھیک آٹھ بجے سڑک کے اس جنرل اسٹور کے پاس سے گذراتھا، جہاں روز کی طرح آج بھی پانچ سال کی چھریرے بدن کی شردھا اسکول کا یونیفارم پہنے بس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ کئی دن کے انتظار کے بعد آج مسکرائی تھی۔

ندا سے شردھا کی دوستی چند مہینے پرانی ہے، پہلی بار وہ رات بھر کی سوئی ہوئی نیند اور دھیمے دھیمے جاگتی صبح کی تازگی کے ساتھ یہیں کھڑی ملی تھی۔ اپنے آپ میں کھوئی ہوئی۔ سمندر فٹ پاتھ کے پیچھے سے اچھل اچھل کر اسے دیکھ رہا تھا۔ ہوا اس کے بنے سنورے بالوں سے شرارت کر رہی تھی۔ درخت پر بیٹھی چڑیاں۔ اس کے لئے گنگنا رہی تھیں۔ لیکن وہ ان سب سے بے خبر آدھی سوئی جاگی حالت میں وہاں نہیں تھی جہاں کھڑی تھی۔ ندا نے گذرتے ہوئے اسے دیکھا اور مسکراتے ہوئے گڈ مارننگ کہا۔ وہ ایک اجنبی کے منہ سے گڈ مارننگ سن کر پہلے چونک سی گئی اور پھر پہلے سے زیادہ سنجیدہ ہو گئی۔ چھوٹے سے خوبصورت چہرہ پر اپنی عمر سے بڑی سنجیدگی ابھارنے کی اس کی یہ کوشش ندا کو اچھی لگی۔ اتنے میں بس آئی اور وہ بھاگ کر اس میں چڑھ گئی۔ بس کی کھڑکی سے وہ سہمی سہمی نظروں سے باہر دیکھ رہی تھی اور ندا سوچ رہا تھا۔ جب یہ مسکرائے گی تو اور بھی حسین لگے گی۔ اس مسکراہٹ کو دیکھنے کے لئے ندا کو کافی محنت کرنی پڑی۔ اس کی بس کس وقت آتی ہے یہ جاننے کے لئے ایک دن اس نے پورے پندرہ منٹ خرچ کیے۔ وہ مقررہ وقت پر وہاں سے گذرتا اگر وہ وہاں ہوتی تو وش کر کے آگے بڑھ جاتا۔ اس کے آنے میں ایک دو منٹ کی دیر ہوئی تو وہ اس کا انتظار کرتا۔ ہر روز کی مسلسل فیلڈنگ کے بعد اس کی اجنبیت میں آہستہ آہستہ شناسائی کا رنگ گھلنے لگا۔ پھر وہ ندا کو دیکھ کر آنکھیں نہیں جھکاتی تھی۔ اس کے گڈ مارننگ کے جواب میں وہ بھی دھیرے سے گڈ مارننگ کہنے لگی تھی۔ لیکن یہ طویل شناسائی جب مسکراہٹ میں تبدیل ہوئی وہ آج ہی کا دن تھا۔ ندا کو دیکھتے ہی اس نے کہا کل آپ ہمارے ٹی وی پر آئے تھے۔ آپ کا

نام ندا فاضلی ہے۔ اتنا کہہ کر وہ ایک ساتھ، آنکھوں، ہونٹوں، گالوں اور ہاتھوں سے مسکرا اٹھی اور اس مسکراہٹ نے تھوڑی دیر کے لئے سارے راستے کو دور تک حسین بنادیا۔ اپنے گھر آکر، ندا اس مسکراہٹ جیسی کوئی نظم کہنے کی کوشش کرتا ہے۔ ندا کی ہر نظم اس کے پہلے مصرع میں چھپی ہوتی ہے جو وہ پہلے سوچتا ہے۔ اس مصرع کے سوجھتے ہی پوری نظم آپ ہی آگے بڑھنے لگتی ہے۔ لیکن اس پہلے مصرع کی تلاش میں اسے کافی بھٹکنا پڑتا ہے۔ کبھی وہ فوراً مل جاتا ہے کبھی اس تک پہونچنے میں کئی مہینے یا کئی دن لگ جاتے ہیں۔ آج بھی یہی ہوتا ہے۔ وہ بار بار کئی مصرعے سوچتا ہے۔ مگر ان میں سے کوئی بھی مصرع ایسا نہیں ہوتا جہاں سے نظم شروع ہوتی ہو۔ وہ جھنجھلا کر سوچنا بند کردیتا ہے۔ ایسی کئی ان کہی نظمیں ندا کی یادداشت میں شردھا کی مسکراہٹ کی طرح تصویروں کی صورت میں محفوظ ہیں۔

سینٹ پال اسکول کے پھاٹک کے سامنے اپنے بچے کا انتظار کرتی ہوئی ایک بے نام ماں۔ چھٹی کا گھنٹہ بجتے ہی، بچہ ماں کی طرف بھاگتا ہوا آتا ہے۔ زمین پر اس کے چھوٹے چھوٹے پیروں کی آہٹیں، روشنی کے ننھے ننھے بلبوں کی مانند پہلے ماں کی آنکھوں میں چمکتی ہیں اور پھر پورے جسم میں جھلملانے لگتی ہیں۔ اور وہ پل بھر کو دنیا کی حسین ترین عورت بن جاتی ہے۔

ایک زیر تعمیر سڑک۔ صبح ہوتے ہی جوان بوڑھے سارے مزدور اپنے اپنے کام میں جٹ جاتے ہیں۔ ایک بوڑھا آتا ہے اور ان کے کم عمر بچوں کو ایک جگہ جمع کرکے انہیں پڑھنا لکھنا سکھاتا ہے۔ وہ اپنے پاس سے ان کے لئے کتابیں قلم اور کاپیاں ہی نہیں لاتا انہیں خوش کرنے کے لئے ٹافیاں اور مٹھائیاں بھی لاتا ہے۔ کچھ دن کے بعد سڑک کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ مزدور کام کی تلاش میں آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ان کے جانے کے ساتھ بوڑھے ماسٹر کا کھلی فٹ پاتھ کا اسکول بھی بند ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ بوڑھا اب بھی وہاں آتا ہے اور پہلے کی طرح چادر بچھا کر کچھ دیر گئے ہوئے بچوں کا انتظار کرتا ہے اور پھر اٹھ کے چلا جاتا ہے۔ بوڑھا اور بوڑھا ہو کر اپنے سے زیادہ بوڑھے سمندر کو دیکھتا ہے۔

سمندر میں آہستہ آہستہ ڈوبتا ہوا سورج۔ پانی پر ایک لمبی سی سنہری روشنی کی لکیر بنتی

ہے۔ اور سورج چپ چاپ پانی میں اتر جاتا ہے۔ ایک بوڑھا ہاتھ دوسرے بوڑھے ہاتھ سے کچھ کہتا ہے۔ ان کے چلے جانے کے بعد سمندر دیر تک ان کے ہاتھوں کی ان کہی باتوں کو اپنی لہروں میں دہراتا رہتا ہے۔

دروازہ پر دستک ہوتی ہے۔ ندا جیسے ہی دروازہ کھولنے کے لئے اٹھتا ہے دستک بولنا شروع کر دیتی ہے۔ ٹھاکر موہن سنگھ کاویہ ڈنڈ بیٹھکیں، دودھ لسی، پستے بادام، دوپہر کا آرام شام کا جام، عشق میں بدنام، شادی میں ناکام، لڈو جے پور والا، پراتن پراچین۔

ندا نے آواز پہچان کر، باقی کے لفظوں کو دہرانا چاہا، ڈائریکشن کے شوقین لیکن غمگین۔

کاویہ نے باہر سے ہی ٹوکتے ہوئے رعب دار آواز میں کہا۔ غلط، اور ندا کے دیے ہوئے نام کا باقی کا حصہ یوں پورا کیا۔ پراتن پراچین، ڈائریکشن کے شوقین لیکن سنگین۔ نام کے آخری لفظ سنگین بولتے ہوئے وہ کسی پہلوان کی طرح سینہ پھلا کر بازو میں مچھلیاں ابھارنے لگے۔ کاویہ کی تندرستی اب پہلے جیسی نہیں تھی۔ بدن میں گوشت بھی کم ہو گیا تھا، چہرے پر بھی گذرتے وقت کے نشان صاف نظر آتے تھے۔ ڈنڈ بیٹھکوں سے بنا ہوبدن اب ڈائی تل کی گولیوں کے سہارے حالات سے لڑ رہا تھا۔ وہ اس بار کئی مہینے غائب رہ کر ممبئی آئے تھے۔ گاؤں کے موروثی مکان بیچ کر جو تھوڑی سی رقم ہاتھ لگی تھی اس سے برسوں کی رکی ہوئی اپنی فلم کی پھر سے تھوڑی سی شوٹنگ کرنے آئے تھے ندا کو انہیں دیکھ کر او ہنری کی وہ کہانی یاد آگئی جس میں ایک مریض اپنے بستر کی کھڑکی سے درخت کے آخری پتے کو ہواؤں سے اکیلا لڑتے دیکھتا ہے۔ اور اس کی کپکپاہٹ سے اپنی زندگی کا رشتہ جوڑ لیتا ہے۔

☆☆☆

ان دنوں کے ملنے جلنے والوں میں ایک نام سید کا بھی تھا۔ وہ اس منڈلی کے سینئیر ممبر تھے۔ عمر کی سنجیدگی انہیں محفل میں زیادہ کھلنے نہیں دیتی تھی۔ شراب پیتے وقت بھی وہ اپنے نشے کو بھی بے تکلف نہیں ہونے دیتے تھے۔ یوں تو وہ مزاجاً کم سخن تھے، لیکن پیتے وقت پہلے گلاس سے آخری گلاس تک وہ ہر بات کا جواب ہاتھ اور آنکھوں کے اشاروں سے ہی دیتے تھے یا صرف مسکراتے تھے۔ رہنے والے حیدر آباد کے تھے۔ اس وقت بھی اکیلے تھے اب بھی خیر سے تنہا ہیں۔ تعلیم مکمل کر کے فلم انڈسٹری میں قسمت آزمانے آئے۔ پھر یہیں کے ہو گئے۔

جب ممبئی آئے تھے تو اپنے ساتھ بہت کچھ لائے تھے۔ جوانی تھی، جوانی کے خواب تھے۔ خوابوں میں ایک سیدھا راستہ تھا، راستے میں تھوڑی دور پر ایک گھر تھا۔ گھر میں باغ تھا، باغ میں پھول تھے، ان پھولوں میں کوئی چہرہ تھا۔ اس چہرہ پر ان کے نام کا انتظار رقم تھا۔

پہلی بار برسوں پہلے دہلی کے کافی ہاؤس میں شاعروں اور ادیبوں کے مجمع میں ملے تھے۔ راج نارائن راز، محمود ہاشمی، کمار پاشی، ہنس راج رہبر، بلراج مین را، سریندر پرکاش وغیرہ کے دوست تھے۔ لیکن دوستوں میں اپنے خوبصورت سوٹ چمکتے ہینڈ بیگ اور چہرہ کی شادابی سے ادیبوں اور شاعروں سے مختلف نظر آتے تھے۔ جب بل آیا تو لوگوں نے اپنی اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالنے شروع کیے۔ لیکن انہوں نے پورا بل خود ادا کیا۔ اس وقت وہ فلم ڈائریکٹر تھے۔ جو

فلم ڈائریکٹ کر رہے تھے وہ فلم مدھوبالا کے سرمائے سے بن رہی تھی۔ فلم مکمل ہوئی، ریلیز بھی ہوئی لیکن کامیاب نہیں ہوئی۔ اس ایک فلم کی ناکامی نے نہ صرف کسی دوسرے فلمساز کو ہی، ان کی ہدایت کاری سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں دی بلکہ خود انہیں بھی اپنی ناکامی کو دہرانے کی مہلت نہیں دی۔

جہاں سے سفر کا آغاز کیا تھا، سانپ سیڑھی کے کھیل کی طرح پھر وہیں سے سفر کی شروعات ہوئی۔ ایسا ان کے ساتھ کئی بار ہوا۔ ایک بار جو فلمی کاروبار سے جڑ جاتا ہے باہر کی دنیا کے لئے وہ اجنبی ہو جاتا ہے۔ ان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ آدمی پڑھے لکھے تھے۔ اگر چاہتے تو کوئی اور صورت پیدا ہو سکتی تھی۔ کولھو کے پٹ بندھے بیل کی طرح ایک کھونٹے کے چکر کاٹتے رہے۔ ڈائریکشن کام نہیں آیا تو انڈسٹری میں ہی دوسرے شعبہ کو اپنا لیا۔ اچھے چہرے مہرے کے تندرست جوان تھے۔ طبیعت میں انکسار تھا، مزاج میں وقار تھا۔ ایک دو محفلوں کے بعد ہی نظروں میں آنے لگے اور ہیروئینوں کے گھروں میں ان کے شین قاف درست کرنے کے بہانے بلائے جانے لگے۔ لیکن آدمی مزاجاً شریف تھے۔ کئی روشن ستاروں کے آسمان رہے مگر زمین کے طور طریقوں سے ہر جگہ انجان رہے۔ بازار تو بن گئے لیکن بازار کے آداب نہیں سیکھے۔ خریدنے والے انہیں تجارت کی طرح قبول کرتے رہے اور وہ ہر خریداری کو محبت سمجھنے کی بھول کرتے رہے۔ بس یونہی وقت گنوایا، نہ بینک بیلنس بڑھایا نہ گھر بسایا۔ نیبو کا رس جب چوس لیا جاتا ہے تو اس کے خول کو پھینک دیا جاتا ہے جو سب کے ساتھ ہوتا آیا ہے ان کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ ادب کا ذوق شروع سے تھا۔ شعر بھی کہتے تھے، کہانیاں بھی لکھتے تھے۔ کہانیوں کا ایک مجموعہ بھی شائع ہوا تھا۔ ڈائریکشن کی طرح جب بدن بھی بازار کے معیار کا اعتبار کھو چکا تو انہوں نے برسوں کے بعد پھر سے کاغذ پر قلم چلانا شروع کر دیا۔ قلم سے پرانی دوستی تھی۔ اچھے دنوں میں بھلے ہی اسے منہ نہ لگایا لیکن مشکل میں اسی نے ساتھ نبھایا۔ ایک کے بعد ایک کئی سیریل تحریر کیے۔ لیکن مالی حالات بہتر ہونے کے باوجود ان کے رہن سہن میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ اب بھی ویسے ہی تھے جیسے پہلے تھے۔ آج

اس ہوٹل میں کل اس گیٹ ہاؤس میں۔ وہ شروع میں اپنے ساتھ حیدر آباد سے جو کچھ لائے تھے اس میں سے اب صرف ایک صندوق اور چند کتابیں ہی ان کے پاس تھیں۔ یہی وجہ ہے جب بھی ضرورت ہوتی وہ آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جاتے تھے۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے انکے پتہ کو تبدیل ہوتے دیکھا تو ایک دن ندا نے ان سے پوچھا۔

سید صاحب اب تو آپ کے حالات بہتر ہیں۔ آپ اپنے لئے کہیں کوئی گھر کیوں نہیں خرید لیتے؟

اس عمر میں مکان کس لیے، کوئی آگے نہ پیچھے، کس کے لئے مکان چھوڑ جاؤں، انہوں نے جواب دیا۔

اسی طرح جب کوئی پوچھتا، آپ اکیلے کیوں رہتے ہیں، شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ وہ جواب میں پہلے میکش اکبر آبادی کا شعر سناتے۔

چراغ گشتہ لے کر ہم تیری محفل میں کیا آتے
جو دن تھے زندگی کے وہ تو رستہ میں گذار آئے

بعد میں مسکراتے ہوئے کہتے۔ میاں اس عمر میں کسی جوان لڑکی سے شادی کروں، تو پڑوسیوں کی نیت خراب ہو گی اور اگر اپنی عمر کی عورت کو گھر میں لاؤں تو میری زندگی عذاب ہو گی۔ جیسی اب تک گذری ہے باقی بھی ایسے ہی گذر جائے گی۔

جاگے ہوئے ملے ہیں کبھی سو رہے ہیں ہم
موسم بدل رہے ہیں بسر ہو رہے ہیں ہم

سید اپنے ساتھ رہنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اپنے علاوہ انکا ہر رشتہ کبھی کبھی کی ضرورت تک رہتا ہے، جب ضرورت ختم ہو جاتی ہے تو رشتہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن جب تک زندگی ہے تب تک ضرورتیں ہیں۔ کبھی کبھی کی ضرورتیں ہی انہیں اب اپنی دنیا سے باہر نکالتی رہتی ہیں۔

ایک شام کئی دن بعد مل روڈ کی بھیڑ سے گذرتے نظر آئے۔ موسم کافی خوشگوار تھا۔

ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ ندا نے یہ سوچ کر آج کی شام اگر یہ ساتھ ہو نگے تو وقت اچھا گزرے گا، انہیں آواز لگائی۔ آواز ان تک نہیں پہونچی۔ اپنی رفتار تیز کر کے اس نے پھر پکارا اس بار بھی وہ نہیں رکے۔ پھر اس نے بھاگ کر انکے قریب پہونچ کر انہیں مخاطب کیا۔

کمال ہے کتنی بار پکارا آپ کو مگر آپ ہیں کہ سنتے ہی نہیں! انہوں نے ندا کو ایسے دیکھا جیسے کسی اجنبی کو دیکھ رہے ہوں۔ اس وقت جلدی میں ہوں۔ پھر ملونگا۔ انہوں نے کہا اور آگے بڑھنے لگے۔ وہ واقعی کچھ گھبرائے ہوئے پریشان سے لگ رہے تھے۔ ایسی بھی کیا جلدی سید صاحب۔ شام کا وقت ہے چلیے کہیں چل کر بیٹھتے ہیں کئی دن کے بعد ملے ہو! کچھ آپ کی سنیں گے کچھ اپنی کہیں گے۔

میں نے آپ سے غلط نہیں کہا۔ میں اس وقت مصروف ہوں۔ انہوں نے اکتائے ہوئے لہجہ میں جواب دیا۔

ایسا کون سا کام ہے جو اتنی خوبصورت شام غارت کر رہے ہیں آپ۔

آپ اپنی شام کو سنبھالئے، میرے ساتھ میری شام کا بندوبست ہے۔ انہوں نے جواب میں کہا۔

ندا کی نظر اچانک ان کے چہرہ سے اتر کے ان سے کچھ دور کھڑی ایک دبلی پتلی ان کے قد سے آدھی کالے رنگ کی ایک لڑکی پر ٹک گئی۔ وہ انہیں کے ساتھ تھی۔ ندا نے غور سے دیکھا تو وہ کسی جادوگرنی کی طرح بار بار اپنے چہرے بدل رہی تھا۔ کبھی وہ مدھوبالا بن جاتی کبھی نادرہ نظر آتی تھی، کبھی نوتن کی طرح مسکراتی تھی۔ انہوں نے ندا کو اس لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے دیکھ کر آہستہ سے کہا۔ اب تو آپ سمجھ گئے ہونگے۔ میں کیوں جانا چاہتا ہوں۔ کبھی آشیانہ ہوتا ہے تو آب ودانہ نہیں ہوتا، کبھی آب ودانہ ہوتا ہے تو آشیانہ نہیں ہوتا۔ آج کئی مہینوں کے بعد پرندہ کے ساتھ آشیانہ بھی ہے آب ودانہ بھی ہے۔ اس لئے اجازت دیجئے۔

☆☆☆

بچوں کے ذہن گیلی مٹی جیسے ہوتے ہیں۔ انہیں کسی بھی سانچے میں آسانی سے ڈھالا جاسکتا ہے۔ اس عمر میں اچھے برے جو اثرات مرتب ہو جاتے ہیں وہی آئندہ زندگی کی سمت ورفتار کو آئینہ دکھاتے ہیں۔ ہر دور کی سیاستیں اسی نفسیات کے ذریعہ اپنی حکومتیں بھی چلاتی ہیں، اور نسل و مذہب کی دیواریں بھی اٹھاتی ہیں۔ انگریز اس رواز سے واقف تھے۔ انہوں نے نصابات کی تبدیلی سے قومی اتحاد کو تاراج کیا اور ڈیڑھ سو سال تک آرام سے ہندوستان پر راج کیا۔ ہٹلر نے اسی گر کو اپنا کر نسلی برتری کو عام کیا۔ آج بھی عرب ممالک اسلام میں شہنشاہیتوں کی گنجائش کے تحفظ کے لئے ہندوپاک کی مسجدوں میں بچوں کے مدرسوں کے لئے مالی امداد فراہم کر رہے ہیں۔ بچے جالی دار ٹوپی اور ٹخنوں سے اونچے پاجامے پہن کر دنیا سے بے خبر ہو کر دین سے باخبر ہو رہے ہیں۔ پاکستان میں دو قومی نظریہ کے دفاع میں بچوں کی کتابوں میں تاریخ کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جارہا ہے، مغل بادشاہ اکبر کے صلح کل کا مسلک ان کے کام کا نہیں ہے کیونکہ اس میں اسلام کے احترام کے ساتھ زرتشتی میہار جی رانا کی مقدس آتش، فادر روڈوف کی پیش کی گئی انجیل، سکھ گرو امرداس اور رام داس کے گرنتھ اور پرشوتم کی گیتا اور رامائن کی تقدیس بھی شامل تھی۔ اس لئے نصاب میں اکبر کا ذکر سرسری ہے لیکن مولوی شیخ احمد کو جو اس عہد میں اکبر کی مذہبی رواداری کے خلاف تھے ہیرو بنا کر پیش کیا گیا ہے اور اورنگ زیب کو جس نے باپ کو بڑھاپے میں قید کیا تھا اور دارا، شجاع، مراد اور سلیمان

کو قتل کر کے تخت حاصل کیا تھا، اسلام کا محافظ ٹھرایا گیا ہے۔

ہندوستان میں آر ایس ایس مختلف علاقوں میں بارہ ہزار سے زیادہ اسکول ششو مندر کے نام سے چلا رہی ہے جن میں ہر سال تقریباً بارہ لاکھ بچوں کو وہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں جن میں شیواجی کو مسلم دشمن اور ویر ساور کر کو ہندتوکا رکھشک دکھایا گیا ہے۔ جن جن ریاستوں میں بی جے پی کی حکومتیں ہیں وہاں رومیلا تھاپر، بپن چندر، ستیش چندر اور ہربنس مکھیا جیسے سیکولر مورخین کی کتابوں کو کورسیس سے باہر کر دیا گیا ہے۔

مشینیں چل رہی ہیں، کل پرزے ڈھالے جارہے ہیں اور ان کو جوڑ کر ایسے روبوٹ بنائے جاتے ہیں جو طے شدہ مقاصد کے دائروں میں نپے تلے ہاتھ پاؤں ہلاتے ہیں، کبھی یہ کارسیوک بن کر شور مچاتے ہیں، کبھی یہ جماعت اسلامی کا پرچم اٹھاتے ہیں، کبھی ہندو سکھ کے ملے جلے کلچر میں تفرقے پھیلاتے ہیں۔ انسانی دماغوں کے اس منصوبہ بند استحصال کے چہرے سے جو نقاب اٹھانے کی جرأت کرتے ہیں وہ سزا کے مستحق ٹھرائے جاتے ہیں

صفدر ہاشمی اپنے نکڑ ناٹکوں کے ذریعے بار بار اس آدمی کو پیش کرتے ہیں جو مندر مسجد کے تفرقوں میں پڑنے کے بجائے، روٹی، پانی اور مکان کے لئے اپنے جیسے دوسرے آدمیوں کے ساتھ جدوجہد کرتا ہے۔ اس آدمی کی تشہیر رائج سیاست کے مفاد سے ٹکراتی ہے، اس لئے اس کردار کے فنکار کی آواز ہمیشہ کے لئے خاموش کر دی جاتی ہے۔

مدھیہ پردیش میں نیوگی محنت کش طبقے کو ذات پات کے الجھاوؤں سے دور کر کے اپنے ادھیکاروں کے لئے لڑنا سکھاتا ہے اور موت کی سزا پاتا ہے۔

سردار جعفری مسلم پرسنل لاء کی رجعت پسندی کے خلاف اپنی مخالفت درج کرتے ہیں اور حیدر آباد کے ایک مشاعرہ میں کچھ جالی دار ٹوپیاں پہنے نوجوان سب کے سامنے انہیں جوتوں کے ہار سے نوازتے ہیں۔

مہاتما گاندھی نے بھی یہی بھول کی تھی۔ انہوں نے گیتا کے ساتھ بائبل اور قرآن کو بھی مقدس کتابیں سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ ہندو، مسلم اور عیسائی ایکتا کا پرچار کرنے لگے تھے۔

ناتھورام گوڈسے کی گولی نے انہیں ہمیشہ کے لئے خاموش کردیا۔ گوڈسے کو ملکی سیاست کا ایک فرقہ آج بھی اپنا ہیرو مانتا ہے۔

لاہور ہائی کورٹ کے ایک جج نے ایک کم عمر عیسائی لڑکے سلامت مسیح کو پیغمبر اسلام کے نام کی بے حرمتی کے الزام سے بری کردیا تھا۔ اسے اس کی کم عمری کی وجہ سے معاف کیا گیا تھا۔ منصف اقبال بھٹی نے قانون کے مطابق اپنا فیصلہ سنایا تھا، لیکن جماعت اسلامی نے اس فیصلے کو غیر اسلامی ٹھہرایا اور اقبال بھٹی کو قتل کرکے غازی ہونے کا ثواب پایا۔

آؤ کہیں سے
تھوڑی سی مٹی بھر لائیں
مٹی کو بادل میں گوندھیں
نئے نئے آکار بنائیں
کسی کے سر پر چٹیار کھدیں
ماتھے کے اوپر تلک سجائیں
کسی کے چھوٹے سے چہرہ پر
موٹی سی ڈاڑھی پھیلائیں
کچھ دن ان سے جی بہلائیں
اور یہ جب میلے ہو جائیں
ڈاڑھی چوٹی تلک سبھی کو
توڑ پھوڑ کے گڈمڈ کردیں
ملی جلی یہ مٹی پھر سے
الگ الگ سانچوں میں بھر دیں
ڈاڑھی میں چوٹی لہرائے
چوٹی میں ڈاڑھی چھپ جائے

کس میں کتنا کون چھپا ہے
کون بتائے ؟
کون بتائے ؟

۱۹۹۰ء میں رتھ یاترا نکلتی ہے۔ یہ رتھ رام کی ایک بڑی سی تصویر کے ساتھ ہر جگہ گھومتا ہے۔ اس رتھ کے سارتھی بی جے پی کے لیڈر اڈوانی ہیں۔ اس کے بارے میں انڈین ایکسپریس کے ایڈی ٹوریل میں لکھا گیا۔

"اس رتھ یاترا نے ایک بار پھر پورے ملک کو ہندو مسلم میں تقسیم کر کے فرقہ واریت کی آگ میں جھونک دیا ہے۔ پہلے اس آگ سے کہیں کہیں کی شہری آبادیاں ہی متاثر ہوتی تھیں۔ لیکن اس دفعہ شہری بستیوں کے ساتھ چھوٹے قصبے اور دیہات بھی اس کی تیز لپٹوں میں جھلس رہے ہیں!"

تلسی کی رامائن میں جو رام صدیوں پہلے دیولوک سے دھرتی کا اُدھار کرنے آئے تھے۔ اب لنکا میں راون سے لڑنے کے بجائے ہونے والے چناؤ کے لئے کمل کے پھول کا پرچار کرنے آئے تھے۔ اس پرچار کا جو اثر ہونا تھا وہ ہوا۔ کئی گھروں کے چراغ گل ہوئے، کئی بستیاں ویران ہوئیں، بہت سوں کو بے عصمت کیا گیا۔ جس پلان کے تحت یہ سب کیا گیا تھا وہ مقصد پورا بھی ہوا انسانی تباہ کاریوں کی یہ روایت، سیاستوں کا ہمیشہ سے دستور رہا ہے۔ کبھی مذہب کے نام پر، کبھی علاقوں کے نام پر، کبھی اقتدار کے نام پر،

چرواہوں کی لکڑیوں کے نام بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن لکڑیوں کی سلامتی کے لئے ہمیشہ گونگی بہری بھیڑوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

۱۹۴۵ء میں ۶ اگست کو امریکن صدر ٹرومین کے حکم سے ہیروشیما پر ایٹم بم پھینکا گیا جس میں ایک لاکھ چودہ ہزار لوگ مارے گئے۔ پہلے بم کے تین روز بعد دوسرا بم ناگاساکی میں داغا گیا، اس بار مرنے والوں کی گنتی ستر ہزار تھی۔

روانڈا کے شمالی مشرقی علاقہ میں ایسی دو گڑھے تلاش کیے گئے ہیں، جن میں ایک میں

آٹھ ہزار اور دوسرے میں چھ ہزار انسانی لاشیں دفن تھیں۔ تین مہینے کی نسلی سول وار میں وہاں مرنے والوں کی تعداد ایک لاکھ بتائی جاتی ہے۔

یو این کی نمائندہ سلمابریک مین کے مطابق عراق پر اقتصادی پابندیوں کے بعد تقریباً ڈیڑھ لاکھ بچے بھوک سے مرے ہیں۔

میگی اوکان نے گارجین میں لکھا، جنگ کے بعد عراق میں بے شمار بچے ایسے پیدا ہوئے ہیں جن کی جسمانی ساخت نارمل نہیں ہے۔ کسی کے دو سر ہیں کسی کی ٹانگیں ہیں تو ہاتھ نہیں ہیں، کسی کا سرے سے سر ہی نہیں ہے۔

امریکہ اور برٹین کے مشترکہ حملہ میں سن ۱۹۸۶ء کی ایک رات میں لیبیا میں بے شمار ہنستے گاتے گھر موت کی نیند سوگئے۔

تل ابیب میں ۷۳ سالہ بوڑھا میر زائڈ ہیں، اوسک وٹز کے پرانے ڈیتھ کیمپ کے سامنے ساٹھ موم بتیاں روشن کر کے ہولوکاسٹ میں چھ لاکھ یہودیوں کی موت کا ماتم کرتا ہے۔

واشنگٹن میں ابراہم لنکن کی ایک بڑی سی مورت کے نیچے کے گراؤنڈ میں کالے گرینائیٹ پتھر کی ایک لمبی چوڑی دیوار بنی ہے۔ اس پر سنہری رنگ میں ہزاروں نام نقش ہیں۔ یہ ان امریکن سپاہیوں کے نام ہیں جو ویت نام کی جنگ کی بھٹی میں ایندھن بنے تھے۔ ان ناموں کے رشتہ دار ہر روز صبح سے شام تک یہاں آتے ہیں اور ان ناموں کو چھو کر بچھڑے ہوؤں کی یاد میں آنسو بہاتے ہیں۔

مذہب کی بنیاد پر برِ صغیر کی تقسیم ہوئی۔ اس تقسیم میں ایک لاکھ سے زیادہ آدمی دونوں ملکوں میں مارے گئے اور تقریباً بیس لاکھ بھیڑ بکریوں کی مانند دیس سے پردیس میں ہنکائے گئے۔

ندا نے رتھ یاترا کو موضوع بنا کر ایک نظم کہی تھی۔ عنوان تھا 'ایک راج نیتا کے نام'

مجھے معلوم ہے

تمہارے نام سے منسوب ہیں
ٹوٹے ہوئے سورج
شکستہ چاند
کالا آسماں
کرفیو زدہ راہیں
سلگتے کھیل کے میدان
روتی چیختی مائیں
مجھے معلوم ہے
چاروں طرف جو یہ تباہی ہے
حکومت میں سیاست کے تماشے کی گواہی ہے
تمہیں ہندو کی چاہت ہے
نہ مسلم سے عداوت ہے
تمہارا دھرم
صدیوں سے تجارت تھا
تجارت ہے
مجھے معلوم ہے لیکن
تمہیں مجرم کہوں کیسے
عدالت میں تمہارے جرم کو ثابت کروں کیسے
تمہاری جیب میں خنجر
نہ ہاتھوں میں کوئی بم تھا
تمہارے رتھ پہ تو مریادا پرشوتم کا پرچم تھا

یہ نظم ان دنوں ندا نے کئی مشاعروں میں پڑھی تھی۔ دہلی میں بی جے پی کی گورنمنٹ

بن چکی تھی۔ اسی گورنمنٹ کی تبدیلی کے ساتھ اکادمی کے اراکین اور عہدہ داران بھی بدل چکے تھے۔ زبیر رضوی ریڈیو کی سرکاری ملازمت سے سبک دوش ہو کر اب اکادمی کے سکریٹری بن گئے تھے۔ انہوں نے لال قلعہ کے مشاعرہ کے لئے جو شعراء کی فہرست بنائی اس میں اس بار بھی ندا فاضلی کا نام شامل تھا۔ پچھلی بار اس مشاعرہ میں کسی سبب سے ندا شریک نہیں ہو سکا تھا۔ زبیر اس وجہ سے اس سے خفا بھی تھے۔ ان کی خفگی کو ختم کرنے کے لئے وہ اپنے کئی ضروری کام چھوڑ کر اس مشاعرہ میں شرکت کرتا ہے۔ اس مشاعرہ کی صدارت دہلی کے وزیر اعلیٰ کھرانا کر رہے تھے۔ اس نے اس مشاعرہ میں کھرانا کو مخاطب کر کے یہی نظم سنائی تھی۔ ان کی سیاسی وفاداری کو نظم کی حقیقت نگاری اچھی نہیں لگی۔ اور انکے حکم سے پھر ندا کو کئی سال تک اکادمی کے کسی مشاعرہ میں یاد نہیں کیا گیا۔ یہ نظم ندا کے چوتھے شعری مجموعہ میں شامل ہے جسے ۱۹۹۸ء میں ساہتیہ اکادمی کے ایوارڈ کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ اس کی انعامی تقریب میں اس نے ایک تعارفی پیپر پڑھا تھا۔

فن رنگوں کا ہو یا آواز اور الفاظ کا اپنے ہر روپ میں یہ قدرت کا چمتکار ہوتا ہے اور چمتکار پر کسی کا اختیار نہیں ہوتا۔ یہ کبھی کبھی اور کہیں کہیں نازل ہوتا ہے۔ فنکار تو اس کے اظہار یا معیار کا ذریعہ ہوتا ہے۔ بانسری ہم ہوتے ہیں جانے والا کوئی اور ہوتا ہے۔ قدرت جس سے جتنا کام لینا چاہتی ہے لیتی ہے۔ بہت سے لکھتے لکھتے اچانک رک جاتے ہیں اور کچھ آخری سانس تک سانسوں کو الفاظ بناتے ہیں۔ قدرت خود مختار ہوتی ہے۔ اس کے تخلیقی عمل میں کسی دلیل یا منطق کی گنجائش ممکن نہیں۔ کوئی آگ لینے جاتا ہے اور پیمبر بن جاتا ہے۔ کوئی ان پڑھ اپنی دھن میں بار بار ڈھائی اکھشر کو گاتا ہے اور عظیم فن کار کہلاتا ہے۔ اگر تخلیقی عمل فنکار کے اختیار کے دائرہ میں ہوتا تو اپنی پسند سے شاید ہی کوئی دوسرے یا تیسرے درجہ کا آرٹسٹ بننا پسند کرتا۔ کوشش سب کرتے ہیں۔ یہ ضروری بھی ہے لیکن ہر کوشش کا نتیجہ سب کے ساتھ ایک جیسا ہو یہ ضروری نہیں۔ کوشش اس لئے بھی ضروری ہے کہ خبر کب بے خبری کا ذریعہ بن جائے اس کی اطلاع پہلے سے کسی کو نہیں ہوتی۔ یہ ہی وجہ ہے غالب جیسے عظیم

شاعر کو بھی ان کے منتخب کلام سے پہچانا جاتا ہے اور میر تقی میر کو ان کے بہت سارے میں سے کچھ سے ہی جانا جاتا ہے۔

چند لمحوں کو ہی بنتی ہیں مصوّر آنکھیں
زندگی روز تو تصویر بنانے سے رہی

فن کی تخلیق کی طرح فن کی پہچان کا مسئلہ بھی دو اور دو چار کی طرح سیدھا سادہ نہیں ہے، کافی پیچیدہ ہے۔ ایک ہی عہد میں اس کی پہچان کے زاویے بھی الگ الگ ہوتے ہیں اور عہد بہ عہد بھی ان میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اسی لئے ادب میں تنقید کی ہر سرپرستی فنکار کے لئے گمراہ کن ہوتی ہے۔ یہاں تخلیق کار کے اپنے اعتبار اور معیار سے ہی روشنی پھوٹتی ہے۔ کبیر اور نظیر کی مثالیں ادبی تاریخ کی زندہ شہادتیں ہیں۔ نظیر برسوں بااعتباروں میں بے اعتبار رہے اور کبیر صدیوں تک ناقدین کی بے توجہی کا شکار رہے۔

میں نے بھی اپنے طور پر جیسی بھی مجھ سے بن پڑی شاعری کی ہے۔ یہ کیسی ہونی چاہئے یا کس طرح کرنی چاہئے اس کے بارے میں نہ رائج قواعد کی پیروی کی نہ کبھی اس کی ضرورت محسوس کی۔ میرے خیال میں تنقید جب تخلیق کی روشنی میں تخلیق کو سمجھنے سمجھانے کی جائز حدوں کو پھلانگ کر ناجائز فتوے صادر فرمانے لگتی ہے تو ادبی عبادتوں کو بھٹکانے لگتی ہے۔ ہمارے یہاں پچھلے کئی برسوں سے تنقیدی رہنمائیوں نے جو گمراہیاں پیدا کی ہیں انہوں نے فکر و فن کی آزادیوں کو ہی بے نور نہیں کیا ہے ادب کے پڑھنے والوں کو بھی ادب سے دور کیا ہے۔ ادب کو معماتی بنانے اور سماج اور سماجی حالات سے اسے دور رکھنے کا فیشن بھی انہیں مغرب زدہ رویوں کی دین ہے۔

میری شاعری نہ صرف ادب اور اس کے پڑھنے والوں کے ادبی رشتے کو ضروری مانتی ہے، اس کے تہذیبی و سماجی حوالے کو اپنا معیار بھی جانتی ہے۔ یہ ایک طرح ادب کی اس روایت کی حمایت ہے جو ادب کو اشرافیہ کی پرانی حکمرانی سے آزاد کر کے اسے عوامی وقار عطا کرتی ہے۔ یہ شاعری بند کمرے سے باہر نکل کر چلتی پھرتی زندگی کا ساتھ نبھاتی ہے اور ان

علاقوں میں بھی جانے سے نہیں ہچکچاتی جہاں روشنی بھی مشکل سے پہونچ پاتی ہے۔

یہ ماں کی آنکھوں سے مسکراتی ہے۔ بہن کے آنچل میں سرسراتی ہے۔ بچوں کے ساتھ اسکول جاتی ہے، مزدوروں کے ہاتھوں سے بوجھ اٹھاتی ہے اور اس کے ساتھ سورج میں جھلستی بھی ہے، برسات میں نہاتی بھی ہے اور وقت آنے پر ناانصافی کے خلاف انصاف کی آواز بھی اٹھاتی ہے۔

اس شاعری کی زبان بھی اس کے موضوعات کی طرح نہ چہرہ پر ڈاڑھی سجاتی ہے نہ ماتھے پر تلک لگاتی ہے۔ یہ وہ زبان ہے جو صوفی سنتوں کی زبان تھی۔ جو گھر آنگن اور گلی کوچوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور انسانی رشتوں سے جگمگاتی ہے۔ یہ درباروں کی نہیں بازاروں کی زبان ہے اس شاعری کا مزاج عوامی، احتجاجی اور مسائلی ہے جو ترقی یافتہ ممالک کے برعکس تیسری دنیا کی ان مسائلی اقدار سے زیادہ قریب ہے۔ جہاں ابھی سب کچھ بازار میں تبدیل نہیں ہوا ہے۔ جہاں ایک دوسرے کے درمیان مکالمہ بھی زندہ ہے، خواب بھی باقی ہے اور خواب کا تعاقب بھی جاری ہے۔ میں نے اسی مکالمہ اور خواب کی روشنی میں زندگی کو پڑھا ہے اور لکھا ہے۔ یہی میری ذات کا آئینہ ہے۔ اس انفرادی آئینہ میں میں جب جیسا خود کو نظر آتا رہا ہوں اسے ویسا ہی درشاتا رہا ہوں۔ یہ شاعری موسموں کے ساتھ بدلتی بھی ہے اور روز نئے چاند سورج کے ساتھ نئے سرے سے طلوع بھی ہوتی ہے اور ڈھلتی بھی ہے۔ یہ شاعری ہی میرا سفر نامہ بھی ہے اور زندگی اور معاشرہ کے تعلق سے میرے شعری رویہ کا اقرار نامہ بھی ہے۔

وہ صوفی کا قول ہو یا پنڈت کا گیان
جتنی بیتے آپ پر، اتنا ہی سچ مان

میرے شعری سفر کی شروعات اس وقت سے ہوتی ہے جب میں اچانک گھر سے بے گھر ہوتا ہوں۔ اس واقعہ کے بارے میں میں نے اپنی پہلی شاعری کی کتاب 'لفظوں کا پل' کے

دیباچے میں لکھا ہے۔

۱۹۶۵ء کی بات ہے، میں بھوپال سے گوالیار واپس آیا تھا۔ رات کا وقت تھا میں حسب معمولی اٹیچی ہاتھ میں لئے اس برسوں کی جانی پہچانی گلی میں مڑ گیا جہاں ایک طرف املی اور دوسری طرف نیم کی گھنی چھاؤں تلے میرا گھر تھا۔ میں نے گلی میں گھستے ہوئے تو اپنے آپ کو دیکھا تھا، دروازہ کھٹکھٹانے تک بھی میں اپنے آپ کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس کے بعد نہ جانے کیا ہوا وہاں سے سر جھکائے جو لوٹا تھا وہ میں نہیں تھا۔ کوئی اور تھا مجھ جیسا ہی۔

یہ جو کوئی اور مجھ جیسا تھا وہ میرا شاعر تھا۔ میرے دکھ سکھ کا اکیلا گواہ۔ جو اس اکیلی رات سے آج تک میرے ساتھ ہے۔ اس کے دیکھنے کا ڈھنگ سوچنے کا انداز، جذبات واحساس وہ نہیں تھے جو پہلے مجھ سے منسوب تھے یا جن سے میری شناخت ممکن تھی۔ اس نے وہ سب کچھ بدل دیا تھا جس سے میں ابتدا سے واقف تھا۔ پہلے چہرے ہوں یا اشیاء اپنی خارجی شباہتوں سے پہچانی جاتی تھیں اب ایک میں اور بھی کئی کی شمولیت کا احساس ہوتا ہے۔

ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی، جس کو بھی دیکھنا ہو کئی بار دیکھنا۔

میں آدمی کو اس کے سماجی رشتے سے پہچانتا ہوں۔ لیکن آدمی اور سماج کا رشتہ کس قواعدی نظام کے تحت ہو، یا ہر ایک کے ساتھ ایک جیسا ہو یہ ممکن نہیں۔ زندگی کا سلوک جس کے ساتھ جیسا ہوتا ہے زندگی کے بارے میں اس کا رویہ بھی ویسا ہی ہو جاتا ہے۔ میں نے اس رشتے کو رائج نصیحتوں اور ہدایتوں کے بجائے اپنے تجربوں اور مشاہدوں سے آباد کیا ہے۔ اس آزاد خیالی نے مجھے ایک ہی دنیا میں دو مختلف دنیاؤں میں بانٹ دیا ہے۔

میں ایک ساتھ ان دونوں دنیاؤں کا باشندہ ہوں۔ ایک دنیا وہ ہے جو سب کے ساتھ میری بھی ہے۔ یہ میرے وجود سے پہلے موجود تھی۔ یہ میری پیدائش کی طرح ایک اتفاقی عمل ہے جس میں میرے اپنے انتخاب کی آزادی نہیں تھی۔ اس کے اپنے دائرے اور قاعدے ہیں۔ اس کی دوسری شکل وہ ہے، جس میں میں اسے دیکھتا ہوں یا دیکھنے کا خواہش مند ہوں ایک میری مادّی ضرورت ہے۔ دوسری میری روحانی بصیرت ہے۔ ایک میں انسان

دشمن دھماکے ہیں، آبادیوں کو الگ الگ خانوں میں بانٹنے کے خاکے ہیں، سرحدیں ہیں، سیاستیں ہیں تجارتیں ہیں۔ دوسری میں سنتوں کی بانیاں ہیں، رشتوں کی کہانیاں ہیں، بچپن کی نادانیاں ہیں جوانی کی جولانیاں ہیں، کتابیں ہیں، کلائیں ہیں، انسانیتیں ہیں۔ ان دو دنیاؤں کا مسلسل ٹکراؤ میری دیوانگی بھی ہے اور میری شاعری بھی ہے۔

جیسی ہونی چاہیے تھی ویسی تو دنیا نہیں
دنیاداری بھی ضرورت ہے چلو یو ں ہی سہی
میلے ہوجاتے ہیں رشتے بھی لباسوں کی طرح
دوستی ہر دن کی محنت ہے چلو یوں ہی سہی

☆☆☆

جب کچھ ہونے کو ہوتا ہے، تو اس کی اطلاع انسانوں سے پہلے پرندوں جانوروں درختوں اور ہواؤں کو ہو جاتی ہے۔ برسات کے آنے سے پہلے مور ناچتا ہے، کوئی حادثہ ہونے کو ہوتا ہے تو گلیوں میں کتے رونا شروع کر دیتے ہیں، گھر میں کسی خوشی کی آمد ہوتی ہے تو منڈیر پر کوے کائیں کائیں کرنے لگتے ہیں۔ وہ دن ایسا ہی ایک دن تھا اور اداس سا دن تھا۔ راستوں میں نہ پہلے جیسی آہٹیں تھیں، نہ چہروں پر صبح کی جگمگاہٹیں تھیں۔ ہوائیں درختوں میں دبکی ہوئی تھیں۔ سمندر کناروں کی چٹانوں سے دور کسی سوچ میں گم تھا۔ آسمان دور دور تک پرندوں کی اڑان سے خالی تھا۔ اس دن کارٹر روڈ کے فٹ پاتھ پر بنے سی لینڈ اسٹور کے پاس گھڑی نے ٹھیک وقت پر آٹھ بجائے تھے لیکن گھڑی کے باہر کا ماحول روز کی طرح آٹھ بجے جیسا نہیں تھا۔ نہ ہوائیں سمندر کی لہروں سے کھیل رہی تھیں، نہ درختوں پر چڑیاں صبح کے گیت گا رہی تھی۔ روز کی طرح شردھا کی مسکراہٹ بھی آج صبح میں شامل نہیں تھی۔ یہ مسکراہٹ پچھلے کئی دن سے ندا کی صبح کے معمول کا حصہ تھی۔ شردھا اپنی بلڈنگ لینڈ مارک کے کسی فلیٹ میں چھپی بیٹھی تھی۔ اسے نیچے اترنے کی اجازت نہیں تھی۔ شاید اسے بھی کسی طرح خبر ہو گئی تھی کہ وہ دن بچوں کے اسکول جانے کا نہیں تھا، رام جنم بھومی ایودھیا میں بابری مسجد ڈھانے کا تھا، ندا کے وہاں ہوتے شردھا کے اسکول کی بس آئی اور شردھا کو اپنی جگہ نہ پا کر آگے بڑھ گئی۔ اس دن اسکول کی بس میں بچوں کی روشن آنکھوں کی جگہ بس کی کھڑکیوں

سے سناٹے جھانک رہے تھے......

وہ دن ۱۹۹۲ء کا چھ دسمبر تھا جو اپنی وحشت اور دہشت کے لحاظ سے ۱۹۸۴ء کے آپریشن بلیو اسٹار کے بعد ہندوستانی تاریخ کا سب سے بڑا حادثہ تھا۔ یوں تو یہ چھ دسمبر پچھلے کئی سالوں سے مداری کی رسیوں سے بندھا الگ الگ جگہوں پر نظر آتا تھا۔ تماشائیوں کو دور سے ناچ کود کر تماشہ دکھاتا تھا اور پھر مداری کے ساتھ رخصت ہو جاتا تھا۔ لیکن اس بار مداری نے اسے رسیوں سے آزاد کر کے اس کا کھیل دکھایا تھا اور ایک ایسے پرانے ویران ڈھانچے کو مسجد بنا کر ڈھایا تھا جس میں برسوں سے اذان گونجی تھی نہ نماز ادا ہوئی تھی۔ چھ دسمبر کی اس کامیابی کو اخباروں نے جلی سرخیوں میں چھاپا، ٹی وی نے پوری دنیا کو اس کا تماشہ دکھایا۔ شوسینا نے اسے اس کی کامیابی سے خوش ہو کر خاص طور سے ممبئی آنے کی دعوت دی۔ اس پارٹی کے روزنامہ میں اس کی تعریف میں ایڈی ٹوریل لکھا گیا اور اس میں فخریہ یوں اعتراف کیا گیا۔

ہمیں فخر ہے، بابری مسجد کو ڈھانے میں ہمارے وفادار کارکنوں کی طاقت اور عقیدت کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔ ہندوؤں کی پیشانی پر جو صدیوں کے اپمان کا کلنک تھا وہ ہمارے بہادروں نے مٹا دیا ہے۔

ممبئی میں چھ دسمبر کے استقبال کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ پارٹی کے دفتر روشنیوں کی جھالروں سے سجائے جا رہے تھے۔ پٹاخے چھوڑے جا رہے تھے۔ راستوں پر چراغ جلائے جا رہے تھے۔ مٹھائیوں سے منہ میٹھے کیے جا رہے تھے۔

چھ دسمبر ایودھیا سے سیدھا ممبئی آیا اور یہاں اسے کئی دن اسٹیٹ گیسٹ کی حیثیت سے ٹھہرایا گیا۔ وہ جب تک یہاں رہا سارا شہر اسی کے ارد گرد گھومنے میں مصروف رہا۔ نہ بچے اسکول گئے نہ بازاروں نے دکانیں کھولیں نہ سرکاری دفتروں میں کوئی کام ہوا۔ ہر جگہ اسی کے قصے تھے، ہر طرف اسی کی باتیں تھیں۔ وہ شہر کے جن جن علاقوں سے گذر رہا تھا، میڈیا کرکٹ میچ کی کمنٹری کی طرح اسے تصویروں میں دکھا بھی رہا تھا اور لفظوں میں سنا بھی رہا تھا۔

گھر جل رہے تھے، بے قصور مارے جا رہے تھے۔ اور یہ سب کچھ پولس کے سامنے عدالت کی موجودگی اور سرکار کے اقتدار میں ہوتے ہوئے ہو رہا تھا۔ یہ تو سب جانتے تھے جو ہوا یا ہو رہا ہے اس کا قصوروار کون تھا۔ لیکن چھ دسمبر کے اتنے سر اتنے ہاتھ اور اتنے چہرے تھے کہ کسی ایک سر، کسی ایک ہاتھ یا کسی ایک چہرہ سے اس کی شناخت مشکل تھی۔ وہ دیس کے بٹوارے کی اولاد تھا اور ایک ساتھ برِ صغیر کے تینوں منقسم خطوں میں ہلاویزا اور پاسپورٹ کے آباد تھا۔ جس وقت وہ ممبئی میں ہندو بن کر مسلمانوں کو ستا رہا تھا اسی وقت وہ کراچی میں مسلمان بن کر مندروں کو گرا رہا تھا، اور بنگلہ دیش میں جماعت اسلامی بن کر غیر مسلم گھروں کو جلا رہا تھا۔

بچپن میں جادوگر علاء الدین کے پاس ایک چراغ تھا۔ اس چراغ کو جب وہ جلاتا تھا تو ایک دیو سامنے آتا تھا اور سر جھکا کے پوچھتا تھا۔ بولو میرے آقا کیا حکم ہے۔ اس سے اس وقت جو کہا جاتا تھا اسے وہ کر کے دکھاتا تھا۔ چھ دسمبر بھی ایسا ہی ایک دیو ہے جسے برِ صغیر کی سیاست جب چاہتی ہے جگا دیتی ہے جب چاہتی ہے سلا دیتی ہے۔

سیاست کی منزل حکومت ہوتی ہے اور ہر حکومت کو ووٹ بینک کے لئے چھ دسمبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ممبئی میں ان دنوں اس کی ضرورت تھی۔ وہ منصوبہ بند شور شرابہ کر رہا تھا۔ ندا کے ایک پولیس آفیسر دوست نے فون پر اسے اطلاع دی۔

ندا فاضلی اس وقت تمہارا گھر جس علاقہ میں ہے وہ محفوظ نہیں ہے۔ کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا ہے گھروں پر خفیہ نشان لگائے گئے ہیں اس لئے بہتر یہی ہے، حالات درست ہونے تک تم کہیں اور منتقل ہو جاؤ'' اس فون کے بعد اس نے مالتی جوشی کو اس کے والد کے یہاں بھیج دیا اور خود گھر میں تالا لگا کر اپنے ایک کوی دوست کمل شکلا کے پاس چلا گیا۔

۱۹۹۲ء شوسینا اور جن سنگھ کے لئے بہت مبارک ثابت ہوا۔ برسوں کی جدوجہد کے بعد وہ اپنی حکومت بنانے میں کامیاب ہوئے۔ ممبئی پھر سے پرامن ہو گئی۔ چیف منسٹر نے بیان دیا۔ ہماری حکومت جب سے قائم ہوئی ہے، پورا مہاراشٹر ہندو مسلم فسادات سے دور

ہے، یہ ہی ہماری کامیابی ہے...... رفیق ذکریا نے ایک محفل میں کہا شیو سینا اور بی جے پی کی سرکار کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ اب ممبئی پوری طرح سے فسادات سے پاک ہے۔ مخالف جماعتوں نے کہا

جو لوگ فسادات کرتے یا کرواتے ہیں جب وہ ہی حکومت میں شامل ہوں تو شانتی ہو گی ہی۔

اٹھ کے کپڑے بدل، گھر سے باہر نکل جو ہوا سو ہوا
رات کے بعد دن آج کے بعد کل جو ہوا سو ہوا

جب تلک سانس ہے، بھوک ہے پیاس ہے یہ ہی اتہاس ہے
رکھ کے کاندھے پہ ہل کھیت کی اور چل جو ہوا سو ہوا

خون سے تربہ تر، کرکے ہر رہگزر، تھک چکے جانور
لکڑیوں کی طرح پھر سے چولہوں میں جل جو ہوا سو ہوا

جو مرا کیوں مرا، جو لٹا کیوں لٹا، جو جلا کیوں جلا
مدتوں سے ہیں گم ان سوالوں کے حل جو ہوا سو ہوا

مندروں میں بھجن، مسجدوں میں اذاں، آدمی ہے کہاں
آدمی کے لئے ایک تازہ غزل جو ہوا سو ہوا

☆☆☆

جمیل فاطمہ کو آسمان کا ستارہ بنے کو کافی عرصہ گذر چکا ہے۔ ان کی قبر کراچی کے ایک قبرستان کے کسی گوشے میں ہے۔ جب بھی سال دو سال میں ندا وہاں جاتا ہے تو اسے نئے سرے سے تلاش کیا جاتا ہے۔ قبر پر کتبہ نہ ہونے کی وجہ سے کافی تلاش کے بعد دھندلاتی یادوں میں محفوظ کسی پہچان کو ہی ان کی آرام گاہ قیاس کیا جاتا ہے اور اس پر پڑے ہوئے سوکھے پتوں اور ٹہنیوں کو ہٹا کر کرائے کے پانی سے دھوپ سے چٹخی مٹی کو نم کر کے فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔ وہ مر چکی ہیں اور مردوں سے زندوں کا رشتہ اسی طرح آہستہ آہستہ دھندلاتا جاتا ہے۔

انہوں نے ایک بار کہا تھا، انسان جسم نہیں خواب ہوتا ہے۔ جب تک خواب زندہ رہتا ہے، انسان نہیں مرتا۔ انہوں نے شائد صحیح کہا تھا۔ ندا کو اس کی صداقت کا احساس اس وقت ہوا جب وہ کئی سال کے بعد، ایک پروگرام کے سلسلے میں گوالیار گیا۔ وہاں نئی سڑک پر بنی رنجیت ہوٹل کے پیچھے ایک چھوٹے سے دو منزلہ مکان میں جمیل فاطمہ اب بھی حیات تھیں۔ اپنی مخصوص مسکراہٹ اور پنج وقتہ نمازوں کے ساتھ۔ جس خواب کو ادھورا چھوڑ کر، وہ اپنے خاندان سمیت ۱۹۶۵ء میں پاکستان ہجرت کر گئی تھیں۔ وہ اب تیسری نسل میں مکمل ہو رہا تھا۔ چار لڑکوں اور تین لڑکیوں کی ماں، جمیل فاطمہ کا نوواں بیٹا، محلے کے ایک قصائی کے گھر جنما تھا۔ ابھی وہ مشکل سے ایک سال کا ہوا تھا کہ جمیل فاطمہ نے اسے اپنی نگرانی میں لے لیا تھا۔ جمیل فاطمہ کی وجہ سے پورا گھر اس کے اردگرد گھومتا تھا۔ جمیل فاطمہ نے اس کی خدمت کو مختلف شعبوں میں تقسیم کر کے گھر کے ہر فرد کو کسی ایک شعبہ سے منسلک کر دیا تھا۔ لیکن ان تمام خدمات کے باوجود وہ پپو کو جیسا بنانا چاہتی تھیں، پپو ویسا نہیں بن پایا۔ ملکی سیاست نے

اینٹ اینٹ اٹھتی ان کی عمارت کو اچانک ڈھادیا۔ جمیل فاطمہ اسے بھی اپنے بچوں کے ساتھ کراچی لے جانا چاہتی تھیں، لیکن اسکے ماں باپ اپنے اکلوتے بیٹے سے اتنی دور نہیں ہونا چاہتے تھے، انکے جاتے ہی پپو پھر سے اپنے ماں باپ کا بیٹا بن گیا اور اپنے خاندان کی روایت کے مطابق چرچ کے مشن اسکول کی ابتدائی پڑھائی چھوڑ کر گوشت کی دکان میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹانے لگا۔ اور پھر کچھ سال کے بعد شادی کر کے وقت سے پہلے ایک بچے کا باپ بن گیا۔ ایک کے بعد دو، دو کے بعد تین، لیکن اس کے تینوں لڑکے اس کی طرح دوکان میں اس کا ہاتھ نہیں بٹاتے تھے، الگ الگ اسکولوں میں جاتے تھے۔ بڑے لڑکے کی عمر اب اٹھارہ سال ہے۔ وہ اسی محلّے کے چرچ مشن اسکول سے ہائر سیکنڈری پاس کر کے کالج میں داخلہ لینے والا ہے۔ دوسرے نمبر کا لڑکا آٹھویں کلاس میں ہے اور سب سے چھوٹا مونو، جس کی شکل محلّے کے پپو سے مشابہ ہے کانونٹ کے پرائمری اسکول میں زیرِ تعلیم ہے۔ اچھی تعلیم کے روز بہ روز بڑھتے اخراجات نے اسے ۳۵ سال کی عمر میں اپنی عمر سے دگنا بوڑھا بنا دیا ہے۔ کئی برسوں کے بعد ندا اسے دیکھتا ہے، تو پہچاننے میں وقت ہوتی ہے۔ اس کے بال سفید ہو چکے تھے، چہرہ کا رنگ جھلس کر سیاہ ہو چکا تھا۔ آنکھوں پر چشمہ لگ چکا تھا۔ وہ مسکراہٹ جسے ندا محلّے سے پہچانتا تھا اب کبھی کبھی اس کے ہونٹوں پر نظر آتی تھی۔ لیکن ان تمام تبدیلیوں کے باوجود نہ اس کے بدن میں تھکن تھی نہ آواز میں مایوسی۔ وہ جب بھی ملتا تھا کہیں دور سے آتا ہوا یا کسی دور کے سفر پر جاتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ وہ بیٹھا ہوا ہو یا بات کر رہا ہو، ہر وقت چلتا ہوا ہی نظر آتا تھا۔ اس مسلسل سفر کی ابتدا اس وقت سے ہوئی جب اس کا بڑا لڑکا تین سال کا ہوا تھا اور وہ اسے پہلی بار اسی اسکول میں لے کر گیا تھا، جہاں کئی سال پہلے مرتضیٰ حسن اسے چھوڑنے جاتے تھے۔ یہ سفر جو اس نے تنہا شروع کیا تھا، کچھ دن کے بعد اس میں اس نے جمیل فاطمہ کی طرح خدا کو بھی اپنا ہم سفر بنا لیا تھا۔ اب وہ پابندی سے پانچوں وقت کی نماز محلّے کی مسجد میں ادا کرتا ہے۔ اس کی تندرستی اچھی نہیں ہے اس کا اسے احساس ہے۔ لیکن وہ جینا چاہتا ہے اس وقت تک، جب تک بچوں کی تعلیم کو اس کی ضرورت ہے۔ وہ دیوانگی کی حد تک اس مقصد سے ہم رشتہ ہے۔

پپو کے باپ کو اس کی یہ دیوانگی پسند نہیں ہے۔ وہ اپنے بیٹے کی جوانی میں بڑھاپے کی بے وقت آمد سے فکر مند ہے۔ اس کی یہ فکر مندی کئی بار باپ بیٹے کے درمیان مہابھارت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ پپو کی ماں بھی اس کی اس روش کے خلاف ہے۔ ماں باپ چاہتے ہیں، بچے کاروبار میں اس کا ہاتھ بٹائیں، آمدنی بڑھائیں، کچھ کمائیں، ایک اکیلے کو کولہو کے بیل کی طرح چلا چلا کے نہیں تھکائیں لیکن پپو کو یہ گوارا نہیں ہے۔ وہ نہیں چاہتا اس کے بچے بھی اسی کی طرح تعلیم چھوڑ کر گوشت کی دکان چلائیں۔ وہ نہیں چاہتا، اس کے ساتھ جو ماضی میں ہوا تھا، وہ حال میں اسکے بچوں کے ساتھ ہو۔

بڑے لڑکے کے کالج میں داخلہ کے لئے ایک بڑی رقم کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس رقم کے لئے وہ کئی دروازوں کو کھٹکھٹاتا ہے۔ ان میں ایک ندا کا بھی نام ہے۔ ہر جگہ سے مایوس ہو کر وہ آخر میں ندا کو فون کرتا ہے۔

بھائی جان میں پپو بول رہا ہوں، میڈیکل میں وسیم کے داخلہ کے لئے، کالج والے پچاس ہزار ڈونیشن مانگ رہے ہیں، کیا آپ چار پانچ مہینوں کے لئے اس رقم کا انتظام کر سکتے ہیں؟

وسیم کے میڈیکل میں داخلے کی خبر سے ندا کو خوشی ہوتی ہے۔ اُسکی آنکھوں میں اچانک جمیل فاطمہ کا چہرہ ابھرتا ہے۔

وہ شام کے وقت آنگن میں بیٹھی پپو کو پڑھا رہی ہیں۔ پپو کی ماں اوپر کی منزل سے اتر کے آتی ہے اور پاس آکر خاموش بیٹھ جاتی ہے۔ جمیل فاطمہ کے پوچھنے پر وہ دھیمی آواز میں بولتی ہے۔ اماں جی میری، ماں نے مجھے میرٹھ بلایا ہے آپ اجازت دیں تو پپو کو بھی ساتھ لے جاؤں۔ وہ بھی اسے پہلی بار دیکھیں گی۔

جمیل فاطمہ سنجیدگی سے پپو کی لکھی ہوئی عبارت کو درست کرتی ہوئی کہتی ہیں۔ تمہاری ماں نے تمہیں بلایا ہے تو تم جاؤ یہ نہیں جائے گا، جانتی ہو ایک ہفتہ بعد اس کا امتحان ہونے والا ہے۔ تمہارے ساتھ جائے گا تو اس کا ایک سال خراب ہو گا۔ کان کھول کر سن لو، قدرت نے اسے تمہارے کوکھ سے پیدا کیا ہے لیکن تمہارے شوہر کی طرح یہ گوشت کی

دوکان میں بیٹھ کر وقت خراب نہیں کرے گا۔ یہ میرا اپنا ہے۔ ڈاکٹر بنے گا۔ ڈاکٹر...... ! وہ بولتے ہوئے پپو کو قریب کر کے اس کا ماتھا چوم لیتی ہیں۔

ندا پپو کے پتہ پر بینک ڈرافٹ پوسٹ کرتا ہے۔ لیکن جب یہ رجسٹر ڈلیٹر وہاں پہونچتا ہے، داخلے کی تاریخ نکل چکی ہوتی ہے۔ وہ ڈرافٹ دو تین روز بعد ندا کو واپس مل جاتا ہے۔ اس ڈرافٹ کے ساتھ پپو کا ایک خط ہوتا ہے۔

"بھائی جان۔ ڈرافٹ کا بہت بہت شکریہ۔ لیکن آپ کی مہربانی وسیم کا ایک سال برباد ہونے سے نہیں بچا پائی۔ قصور میرا تھا۔ میں ہی ٹیلی فون پر پوری بات نہیں کر سکا۔ خیر جو ہونا تھا وہ ہوا، مجھے خدا کی ذات پر اعتماد ہے۔ اگلے سال اس کا داخلہ ضرور ہوگا۔ اس وقت تک میں خود ڈونیشن کی رقم کا انتظام کرنے کے قابل ہو جاؤنگا۔ آپ کو تکلیف نہیں دونگا۔ اس کا مجھے یقین ہے۔ صاحبہ جو مجھے بنانا چاہتی تھیں وہ میں نہیں بن سکا، لیکن ان کا ادھورا خواب میں اپنے بیٹے وسیم میں ضرور پورا کرونگا۔ اس درمیان اگر آپ کا پاکستان جانا ہو تو صاحبہ کی قبر سے میری طرف سے کہہ دیں، قصائی کا بیٹا اس بار ضرور ڈاکٹر بنے گا"۔ یہ خط پڑھ کر ندا کو محسوس ہوتا ہے جمیل فاطمہ ابھی مری نہیں ہیں، زندہ ہیں اور آنے والے اور کئی برسوں تک یونہی زندہ رہیں گی۔

کوئی نہیں ہے آنے والا، پھر بھی کوئی آنے کو ہے
آتے جاتے رات اور دن میں کچھ تو جی بہلانے کو ہے
دو دروازے ایک حویلی، آمد رخصت ایک پہیلی
کوئی جاکر آنے کو ہے کوئی آکر جانے کو ہے
آبادی کا شور شرابہ، چھوڑ کے ڈھونڈو کوئی خرابہ
تنہائی پھر شمع جلا کر کوئی لفظ سنانے کو ہے
چلو یہاں سے اپنی اپنی شاخوں پر لوٹ آئے پرندے
بھولی بسری یادوں کو پھر خاموشی دہرانے کو ہے

ندا کے سیدھے ہاتھ کی تیسری انگلی میں کئی مہینوں سے نیلم جڑی ایک انگوٹھی ہے۔ یہ انگوٹھی اب سے پہلے جمیل فاطمہ کے ہاتھ میں تھی۔ پچھلے دنوں جب وہ پاکستان گیا تھا، تو ایک شام کو اس کی بڑی بہن نے اسے اپنے ہاتھ سے نکال کر اسے پہنائی تھی اور کہا تھا۔

یہ صاحبہ کی نشانی ہے۔ یہ تمہارے ساتھ رہے گی تو تمہاری بے اعتدالیوں میں اعتدال پیدا کرے گی۔ بہت برکت والی شے ہے یہ! مرحومہ کی بے شمار نمازوں، خیراتوں اور برسوں کی مسلسل تلاوتوں کی اکیلی گواہ رہی ہے۔ میرا تو اس نے بہت ساتھ دیا ہے۔ وہ بہت نیک خاتون تھیں۔ ہمارے ساتھ تو وہ آخر تک رہیں، ان کی یادیں ان کی قبر ان کی دعائیں سب ہمارے حصہ میں آئیں۔ تمہارے پاس وہاں تمہارے اپنے وجود کے علاوہ اور کیا ہے۔ سمندر پار اکیلے پڑے ہو۔ کوئی اپنا نہ پرایا۔ کئی دنوں سے سوچ رہی تھی اب کے تم آؤ گے تو اسے تمہیں پہنادونگی۔ یہ تمہارے پاس رہے گی تو تمہیں ان کی یاد دلاتی رہے گی۔

ہوا بھی یونہی جب سے ندا کے ہاتھ میں یہ انگوٹھی آئی ہے، یہ انگوٹھی، ایک جیتا جاگتا رشتہ بن گئی ہے۔ اس کے انگلی میں ہونے سے اسے ہر وقت اپنے ساتھ کسی کے ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ یہ انگوٹھی روتی بھی ہے، ہنستی بھی ہے اور اسی طرح یوں ہی ناراض بھی ہو جاتی ہے۔ جب یہ ناراض ہوتی ہے تو گھنٹوں کے لئے خاموش ہو جاتی ہے۔ بالکل جمیل فاطمہ کی طرح۔ ندا کو معلوم ہے، اس کی ناراضگی کی وجہ کیا ہے۔ لیکن جب شوق عادت بن جائے تو آدمی بے بس ہو جاتا ہے۔ اس کی ہر شام جام کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔ وہ اس وقت

احتراماً اپنے ہاتھ سے یہ انگوٹھی اتار کے کہیں رکھ دیتا ہے۔ لیکن وہ دور ہو کر بھی جہاں ہوتی ہے وہیں سے ندا کو دیکھتی رہتی ہے اور روتی رہتی ہے! اس کے آنسوؤں نے ندا کی شراب کی مقدار کو ہی کم نہیں کیا ہے، شراب سے نشہ کو بھی گم کر دیا ہے۔

جمیل فاطمہ نے ایک بار لکھا تھا۔ میری برسوں سے آرزو ہے، دنیا کی ذمہ داریوں کو نبٹا کر حج کر آؤں، ہر سال ارادہ باندھتی ہوں لیکن کوئی نہ کوئی کام آڑے آجاتا ہے۔ اور وقت گذر جاتا ہے۔ پتی (مبتدا حسن) آج کل جدہ میں ڈاکٹر ہے۔ وہ ہر سال آنے کو کہتا ہے لیکن نہیں جاپاتی، جاؤں بھی کیسے۔ لڑکیاں اپنے گھر کی ہو جائیں، بس اسی کا انتظار ہے...... ! دیکھو خدا کب یہ آرزو پوری کرتا ہے۔

جمیل فاطمہ کی زندگی میں ان کی یہ آرزو پوری نہیں ہوئی۔ یہ سعادت ان کی انگوٹھی کے نصیب میں تھی۔ جدہ میں ہندوستانی سفارت خانہ ہر سال وہاں بسے ہندستانیوں کیلئے کلچرل پروگرام کرتا ہے۔ ان میں ایک رات مشاعرہ کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس مشاعرہ میں ہندوستان سے ندا کو بھی مدعو کی جاتا ہے۔ مشاعرے ملکی ہوں یا بیرونی۔ ندا ان میں اپنی شرائط پر ہی شرکت کے لئے راضی ہوتا ہے۔ یہ پہلا مشاعرہ تھا جس میں اس نے بنا کسی حیل وحجت کے شرکت کی تھی۔ اس کی وجہ بھی یہی انگوٹھی تھی۔

جہاز میں پائلٹ کی آواز گونجتی ہے۔ کچھ ہی دیر میں ہمارا جہاز جدہ ایئر پورٹ پر لینڈ کرے گا۔ مسافروں کو اطلاع دی جاتی ہے کہ سعودی قانون کے مطابق شراب یا نشیلی اشیا کے ساتھ ایئر پورٹ میں داخل ہونا جرم ہے۔ کسی کے پاس اگر ایسا کچھ ہو تو اسے ہمارے اسٹاف کے حوالے کر کے رسید لے لے۔

جدہ کی آئینہ کی طرح شفاف سڑک پر اسّی کلو میٹر کی رفتار سے کار چل رہی ہے۔ اس رفتار کے حساب سے اس علاقے سے ایک گھنٹہ کے فاصلہ پر شہر مکہ ہے جہاں تقریباً ساڑھے چودہ سو سال پہلے بیس اپریل سن ۵۷۱ عیسوی کو وہ شخصیت وجود میں آئی تھی جس کو عبدالمطلب نے محمدؐ کے نام سے پکارا اور عالم اسلام نے اس نام کو رحمت عالم کے لقب سے

سنوارا۔ یہیں وہ عمارت ہے جو کعبہ کہلاتی ہے جس کی طرف رخ کر کے دنیا کے ہر گوشے میں نماز پڑھی جاتی ہے۔ جدہ سے چار گھنٹوں کی دوری پر وہ مقام ہے جو آرام گاہ پیغمبرؑ اسلام ہے۔

مدینہ کی گلیوں سے آواز آئی
فلک کبریائی ، زمیں مصطفائی

راشد صدیقی (جدہ میں ندا کے میزبان) نے ایک میدان کی بھیڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، اس میدان میں کبھی کبھی جمعہ کو ایسی ہی بھیڑ ہوتی ہے۔ یہاں ڈاکہ زنی، زبردستی جنسی فعل اور نشیلی اشیاء کی تجارت کی سزا موت ہے۔ جب جرم ثابت ہو جاتا ہے تو مجرم کو ایک کرسی میں بٹھا کر ایک تیز دھار تلوار سے، اس کا سر اڑا دیا جاتا ہے۔ تماشائیوں کی بھیڑ دور دور سے اس عبرت ناک منظر کو دیکھنے آتی ہے اور مقتول کا کام تمام ہونے کے بعد واپس اپنے اپنے کاموں میں لگ جاتی ہے۔

سنا ہے، کھلے عام اس دہشت ناک نمائش کے کارن یہاں جرائم کی تعداد دوسرے ملکوں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ دنگے فساد سے بھی سارا ملک پاک ہے۔ دوکاندار، نماز کے وقت دُکانیں کھلی چھوڑ جاتے ہیں۔ آدمی پر آدمی کے اعتماد کا یہ مثالی کردار ہے۔ اس کردار کے تحفظ کے لئے مفتیوں کی جماعت بھی حکومت کے ساتھ پوری معاونت کرتی ہے۔ چند برس پہلے مسجد حرام کے احاطے میں جہاں جانوروں اور پیڑ پودوں تک کو ستانا شرعاً منع ہے، نوّے سے زیادہ آدمیوں کو موت کی نیند سلادیا گیا تھا۔ خدا کے گھر میں شریعت میں اس تبدیلی کو مولویوں نے اپنے فتوے سے جائز قرار دیا تھا۔ ہندوستان میں بھی سن ۱۹۸۴ء میں اسی طرح سکھوں کی سب سے بڑی عبادت گاہ کو انسانی خون سے لال کیا گیا تھا۔ گولڈن ٹیمپل میں مارے جانے والوں میں ایک نام بھنڈراں والا کا بھی تھا جو گردوارے میں شہید ہونے کے بعد بھی پنجاب کے بیشتر گھروں میں آج تک حیات ہے۔ خانۂ کعبہ کے شہیدوں کو بھی ایران میں ہر سال یاد کیا جاتا ہے۔

ندا سعودیہ آکر لکھنؤ کے اطہر نبی کے ساتھ مسلسل اس عرب کو تلاش کرتا ہے جس کے بارے میں اس نے بچپن سے سنا تھا یا پڑھا تھا۔ لیکن شاہراہوں، میں جہاں بھی نظر پڑتی تھی، وہاں ہر طرف عرب لباس میں امریکہ ہی گھومتا پھرتا محسوس ہوتا تھا۔ مغربی تہذیب عرب پر حاوی ہی نہیں ہے، اس نے تاریخ کے وہ نشانات بھی دھندلا دیے ہیں جو اب صرف حافظوں میں محفوظ ہیں۔ اس کے علاوہ حکمرانوں کا اپنا مسلک بھی ہے جس میں ماضی کی زندہ شہادتوں کو بدعتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس میں یادوں اور جذبوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ آنحضرتؐ کے روضہ مبارک کے علاوہ وہاں اب کسی مزار کا نشان باقی ہے نہ کسی تاریخی شخصیت کے شب وروز کی کوئی پہچان سلامت ہے۔ برِ صغیر کا عقائدی مزاج اس سے مختلف ہے۔ یہاں عقیدتیں، خانقاہوں، تعزیوں اور یادگاروں کے ذریعہ ماضی وحال سے رشتہ قائم کرتی ہیں۔ ندا کے ہاتھ کی انگوٹھی بھی اسی رشتہ کی علامت ہے۔ اس کی اہمیت ان یادوں سے ہے جو اس سے وابستہ ہیں۔ یہ ہی وجہ ہے خانہ کعبہ کا طواف کرتے وقت بھی یہ اس کے ہاتھ میں تھی اور مدینہ منورہ کی زیارت کے دوران بھی یہ اس کے ساتھ تھی۔ دونوں دفعہ اسے محسوس ہوا، انگوٹھی خوش ہے مسکرا رہی ہے۔ لیکن اس کی خوشی روضہ مبارک کے ایک محافظ کو پسند نہیں آئی۔ دعا میں پھیلے ہوئے ندا کے ہاتھوں کو دیکھ کر وہ قریب آکر پوچھتا ہے، کیا یہ سونے کی ہے؟

ہاں۔ ندا جواباً کہتا ہے۔

اسے اتار دیجئے...... محافظ حکم کے انداز میں بولتا ہے۔

لیکن کیوں؟

سونا پہننا یہاں جائز نہیں ہے۔ وہ سنجیدگی سے کہتا ہے۔

ندا انگلی سے انگوٹھی اتار کر جیب میں رکھ لیتا ہے

ندا کو محسوس ہوتا ہے کرتے کی جیب میں پڑی انگوٹھی اداس ہے۔ وہ بھی یہاں کے ہر منظر کو اپنے اندر سمو لینا چاہتی تھی۔ یہاں کی فضا میں سرشار ہونا چاہتی تھی۔ وہ باہر آکر دوبارہ

اسے پہن لیتا ہے اور خود سے پوچھتا ہے۔ مزار مبارک کے سبز گنبد کے سامنے، اس سے کئی منزل اونچی ہوٹل کی تعمیر پر کوئی اعتراض کیوں نہیں کرتا؟ مزار پاک نیچے ہے اور ہوٹل اونچا ہے ایک صحافی نے بتایا، یہاں جس کی حکومت ہے، یہ ہوٹل اسی کے شہزادوں کی ملکیت ہے۔ پوچھے کون؟ اور جواب دے کون؟

سعودیہ میں زمین زیادہ ہے، زمین کے حساب سے آبادی کم ہے۔ اس خطہ پر تو خدا کی مہربانی نے دولت کی وہ فراوانی عطا کی ہے کہ ایشیا کے کئی ملکوں کی غربت کا برسوں سے یہ روزی رساں ہے۔ مزدوروں اور دوسرے نوکر پیشہ لوگوں میں زیادہ تعداد ہندوستانیوں، پاکستانیوں اور بنگلہ دیشیوں کی ہے۔ لیکن ان کے ساتھ عام عرب کا سلوک ایسا ہے جیسے برٹش حکومت کے زمانے میں انگریزوں کا ہندوستانیوں کے ساتھ تھا۔

ان پر کئی پابندیاں عائد ہیں۔ یہاں یہ کام کرسکتے ہیں جائداد نہیں خرید سکتے۔ ان میں سے کوئی عرب لڑکی سے شادی نہیں کرسکتا۔ تجارت کرنے کے لئے کسی عرب کی کفالت لازمی ہے۔ گھر سے باہر گھومنے پھرنے کے لئے جیب میں پاسپورٹ کا ہونا ضروری ہے۔ ان پابندیوں میں ذرا سی لغزش بھی کسی کو پولس کے عذاب کا نشانہ بنا سکتی ہے۔ حکومت اور پولس کا یہ رویہ غریب ملکوں کے مسلمانوں کے ساتھ ہی ہے۔ گوری چمڑی کے امریکن لوگوں کے ساتھ ان کا برتاؤ مختلف ہے۔ عرب عراق کی جنگ کے بعد امریکی فوج کے جو سپاہی شہنشاہیت کی حفاظت کے لئے ابھی تک یہاں موجود ہیں، انہیں شراب پینے کی بھی اجازت ہے اور سور کھانے کی بھی سہولت ہے۔ ان میں سے کسی کو اگر کھلے عام نشے کی حالت میں دیکھا بھی جاتا ہے تو احترام کے ساتھ ٹھکانے پر پہونچا دیا جاتا ہے۔

جدّہ میں چھ روز کے قیام کے بعد، ندا واپس ہندوستان جارہا ہے۔ وہ واپسی میں ایک روز کے لئے کراچی میں رکنا چاہتا تھا۔ مگر یہ ممکن نہیں ہو سکا۔ عین وقت پر پاکستانی سفارت خانے نے ویزا دینے سے انکار کردیا۔ اور وہ عمرہ کی ہوئی اس انگوٹھی کے ساتھ جمیل فاطمہ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے نہیں جاسکا۔ جہاز پرواز میں ہے۔ ایک پاکستانی ایرہوسٹیش کے ہاتھ میں

خوبصورت رنگ دیکھ کر اچانک اس کی نظر اپنے ہاتھ پر پڑتی ہے۔ اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے، انگوٹھی اب صرف ساڑھے چار گرام کا سونا بن چکی تھی اس میں جو نیلم جڑا ہوا تھا وہ کہیں راستہ میں گر گیا تھا۔ شاید وہ مقدس زمین سے ندا کی طرح واپس نہیں آنا چاہتا تھا۔ شبلی نے سیرت النبیؐ میں ایک حدیث کا حوالے دیتے ہوئے لکھا ہے، آنحضرتؐ نے فرمایا تھا، میں اس پتھر کو پہچانتا ہوں جو نبوت سے پہلے مجھ کو سلام کیا کرتا تھا۔

محمد مصطفیٰ سے لو لگائے جس کا جی چاہے
وہ سب کا ہے اسے اپنا بنائے جس کا جی چاہے
شرافت سے وہ تلواروں کا لوہا موڑنے والا
صداقت سے ریاکاری کا جادو توڑنے والا
محبت سے وہ ٹوٹے دل کے ٹکڑے جوڑنے والا
محبت کی کشش کو آزمائے جس کا جی چاہے
محمد مصطفیٰ سے ....
نرالی شان والے نے نئی محفل سجائی ہے
سلگتے ریگ زاروں پہ گھٹا رحمت کی چھائی ہے
یہ وہ دھرتی ہے جس کے نور سے روشن خدائی ہے
خدا کے یار سے یاری نبھائے جس کا جی چاہے
وہ سب کا ہے ....

☆☆☆

جب آدمی اپنی زمین سے دور ہوتا ہے تو وہ اسے یاد آتی ہے اور جب وہ اس کے قریب ہوتا ہے تو وہ اسے ستاتی ہے۔ جب لوگ اپنے ملکوں کی غریبی سے تنگ آکر دوسرے ملکوں میں بس کر آرام و آسائش کی زندگی گذارنے لگتے ہیں، تو انہیں اپنی زبانیں اور کلچر کا ناسٹلجیا پریشان کرنے لگتا ہے، یہ کشمکش بھی عجیب ہے۔ وہ پردیس میں اپنے دیس کا قصیدہ گاتے ہیں، لیکن سب کچھ چھوڑ کر واپس آنے سے کتراتے ہیں۔ اس الجھن کو بہلانے کے لئے وہ مشاعرے منعقد کرتے ہیں، موسیقی کی محفلیں سجاتے ہیں جن میں ہندوپاک کے شاعرو ادیب اور دوسرے فنکار بلائے جاتے ہیں۔ امریکہ میں رہنے والے یہ حضرات ہفتہ میں پانچ دن، امریکہ کی مختلف ریاستوں میں امریکہ کی تیز رفتاری کا ساتھ نبھاتے ہیں اور سنیچر اور اتوار کو اپنی پرانی شیروانیوں اور کرتے پاجاموں میں ملبوس ہو کر ہندوستانی یا پاکستانی بن جاتے ہیں۔ پان کھاتے ہیں، عطر لگاتے ہیں، شعروشاعری کی محفلیں سجاتے ہیں، اپنے ملکوں کی موسیقی کو سنتے سناتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے دو دن کی اس تفریح کو پیشہ بنالیا ہے۔ یہ پیشہ ور منتظمین فنکاروں کو بلاتے ہیں اور ٹھہراتے ہیں، پھر معاہدہ کے مطابق باری باری پورے امریکہ میں انہیں فروخت کرتے ہیں۔ خرید و فروخت میں کس کی کیا قیمت طے پاتی ہے، اس کی اطلاع خریدنے والوں اور بیچنے والوں کے درمیان ہی پوشیدہ رہتی ہے۔ مشاعرے ایک رات کے ہوتے ہیں لیکن ایک رات کے لئے مسلسل پانچ دن انتظار کرنا پڑتا ہے۔ یہ پانچ دن الگ الگ مقامات پر سب کو اپنے ساتھ ہی گذارنے پڑتے ہیں، خالی وقت بھوکے بھیڑیے کی طرح ہوتا ہے جب اسکے سامنے کسی مصروفیت کا شکار نہیں ہوتا تو وہ آدمی کا تعاقب کرنے لگتا ہے۔ سارا دن وقت کے ساتھ چور سپاہی کھیلتے گذرتا ہے۔ وقت اسے ڈھونڈتا ہے اور وہ وقت کے

شکنجے سے بچنے کے لئے کبھی ماضی کی آڑ لیتا ہے کبھی حال کے کسی خواب کا سہارا لیتا ہے۔

امریکہ بہت بڑا ملک ہے۔ دنیا کے مختلف ملکوں میں لڑنے والے ہتھیاروں کا تین چوتھائی حصہ یہاں تیار کیا جاتا ہے۔ ان ہتھیاروں کے لئے نئی نئی منڈیاں تلاش کرنا اس کی سیاست ہے۔ جو روس کے بکھراؤ کے بعد اب دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ فیڈل کاسترو نے ایک بار کہا تھا امریکہ کی خوشحالی، غریب ممالک کی غربت کی دین ہے۔ تیسری دنیا کے بیشتر تنازعات اسی ایک طاقت کی دین ہیں۔ سترہ ہزار نیوکلیر بموں کا یہ ملک کہیں شہنشاہتوں کا ساتھ نبھاتا ہے، کہیں جمہوریت کا نعرہ لگاتا ہے۔ فلسطین میں عربوں کو ستاتا ہے اور صدام کے خلاف سعودیہ کا ساتھ نبھاتا ہے۔

ساتھ سمندر پار سے، کوئی کرے بیوپار
پہلے بھیجے سرحدیں، پھر بیچے ہتھیار

ندا کا امریکہ کا سفر نیویارک سے شروع ہوتا ہے۔ نیویارک بہت بڑا شہر ہے۔ ہر بڑے شہر کی طرح اس کا بھی اپنا کوئی کردار نہیں ہے۔ ایک دوسرے سے اجنبی، ہر طرف بھیڑ ہے، جو ہر جگہ بھاگتی دوڑتی نظر آتی ہے۔ کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کی فرصت نہیں ہے۔ آج سے تقریباً، ڈیڑھ سو سال پہلے والٹ وہٹ مین نے اسی شہر میں لکھا تھا۔

میں ساز بجاتا ہوں اور گاتا ہوں
میرا سنگیت صرف ان کے لئے ہی نہیں ہے
جو فتح کا جشن مناتے ہیں
میں ان کے لئے بھی آنسو بہاتا ہوں
جو میدان ہار کر زمین کی غذا بن جاتے ہیں۔

نیویارک ریلوے اسٹیشن پر ندا فلاڈیلفیا کی ٹرین کے انتظار میں تھا۔ اپنی ماں کے ساتھ کھڑا ہوا ایک چھوٹا سا نیگرو بچہ اس کے پاس آکر پوچھتا ہے۔

آپ کس ملک کے ہیں انکل؟

ہندوستان کا!

ندا کا جواب سن کر وہ مسکراتے ہوئے کہتا ہے۔

مجھے تمہارا کنٹری پسند ہے اور پھر واپس جا کر اپنی ماں کے پاس بیٹھ جاتا ہے۔ اس کی مسکراہٹ کو دیکھ کر ندا کو لگتا ہے، وقت کے ساتھ شہر بدلتا ہے بچوں کی مسکراہٹ نہیں بدلتی۔

ٹرین سے نیویارک سے تیسرا اسٹیشن فلاڈیلفیا ہے۔ یہاں اس کے میزبان، جاں نثار اور صفیہ اختر کے دوسرے بیٹے ڈاکٹر سلمان ہیں۔ سلمان مزاج سے شاعر اور پیشہ سے سائیکیاٹرسٹ ہیں۔ جاں نثار کی حیات میں انکا ایک شعری مجموعہ 'کوبہ کو' کے نام سے مکتبہ جامعہ نے شائع کیا تھا۔ امریکہ میں کئی سال سے ہیں۔ اب اردو کے ساتھ انگریزی میں بھی شاعری کرتے ہیں۔

نفسیات کی رُو سے کوئی شخص سوفی صد نارمل نہیں ہوتا۔ سب میں کوئی نہ کوئی کمی ہوتی ہے۔ غریبوں میں اسے کردار کی شناخت کے زمرے میں رکھا جاتا ہے، کھاتے پیتے لوگوں میں اسے مرض مان کر اس کا علاج کیا جاتا ہے۔ امریکہ کی آسودگیوں نے اس مرض میں کافی اضافہ کیا ہے۔ صبح سے شام تک، سلمان کی کلینک میں اس قسم کے مریض آتے ہیں، نئی نئی کہانیاں سناتے ہیں اور وہ ان کی بے ربط باتوں سے انکے مرض کا سراغ لگاتے ہیں۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

فلاڈیلفیا اسٹیشن کے باہر شہر زیادہ کھلا ہوا اور صاف ستھرا ہے۔ امریکہ میں خزاں کا موسم بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ شاخوں سے ٹوٹنے سے پہلے، سارے پیڑوں کے پتے گلابی ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ ہلکے پیلے اور گلابی ہوتے ان پتوں پر، سورج کی اجلی کرنیں جب پڑتی ہیں تو ساری فضا جوان شوخیوں کی طرح مسکرانے لگتی ہے۔ اس مسکراہٹ کو ہوا کی سرسراہٹیں اور پرندوں کی چہچہاٹیں اور حسین بنا دیتی ہیں۔

ندا جیب سے پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگاتا ہے۔ سگریٹ پینا امریکہ میں معیوب سمجھا

جاتا ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے پینے والے سے زیادہ، اس سے نہ پینے والوں کا نقصان ہوتا ہے۔ سیر و تفریح کے مقامات اور گھروں میں، سگریٹ پینے والوں کے لئے الگ سے ایک جگہ مخصوص ہوتی ہے۔ ندا کے ہاتھ میں سگریٹ دیکھ کر ایک لمبا چوڑا نیگرو اس سے سگریٹ طلب کرتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ پیکٹ سے سگریٹ نکال کر اسے دے، وہ ہاتھ بڑھا کر پورا پیکٹ لے کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ امریکہ سے یہ اس کی دوسری ملاقات تھی۔ پہلی ملاقات میں وہ نیویارک کے اسٹیشن پر ایک چہ بن کر اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا اور یہاں جوان ہو کر ایک اجنبی کو ڈرا رہا تھا۔

بعد میں سلمان نے بتایا ایسے لوگوں سے الجھنا نہیں چاہئے۔ ان میں بیشتر ڈرگ ایڈکٹ ہوتے ہیں۔ ان کو دینے کے لئے جیب میں ہمیشہ پانچ یا دس ڈالر رکھنے چاہیے۔ پردیس میں پردیسیوں کی جان و مال کی حفاظت کا یہی طریقہ ہے۔ سیاہ فام لوگوں کی اس قسم کی دادا گیری کے شکار عموماً ایشیائی ملکوں کے لوگ زیادہ ہوتے ہیں۔ ان کے خوف سے لوگ شام کے وقت گھروں میں ہی رہنا مناسب سمجھتے ہیں۔ امریکہ میں ہتھیار رکھنے کے لئے کسی لائسنس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کے جائز و ناجائز استعمال کی پوری ذمہ داری شہری آزادی کا حصہ ہوتی ہے۔

سلمان کے دو منزلہ گھر میں باہر کے دو دروازے ہیں۔ ان کے تالے جن خفیہ نمبروں سے کھلتے ہیں ان کی خبر گھر کے افراد کے علاوہ کسی کو نہیں ہوتی۔ پہلے دروازہ کا تالا دو صفر کے ساتھ ۴۷ نمبر کو ملانے سے کھلتا ہے اور دوسرا دو صفر کے ساتھ ۴۵ کے اعداد سے گھر میں داخل ہونے کی اجازت دیتا ہے۔ ان تالوں کے نمبر سلمان اور ان کی بیگم کی موجودہ عمروں کے مطابق ہیں۔ جو پچھلے کئی سالوں سے ہر سال بدلتے رہے ہیں۔ اندر والوں کو باہر والوں کا خوف اتنا زیادہ ہے کہ ہر گھر کسی نہ کسی پرائیویٹ سیکیورٹی ایجنسی کا ممبر ہوتا ہے۔

سلمان کے دو بچے ہیں۔ یہ صرف ماں باپ کی شباہت اور انکے رنگ سے ہی ہندوستانی ہیں، ورنہ اپنے رہن سہن اور شوق کے لحاظ سے پورے امریکی ہیں۔ ایک ہی گھر میں دو نسلوں کی اپنی اپنی الگ دنیائیں ہیں۔ والدین کی تاریخ، تہذیب اور معاشرہ سے بچے سرے

سے ناواقف ہیں۔ مشاعرے ہوں یا موسیقی کے پروگرام، ان میں انہیں کی دلچسپی ہوتی ہے جو نئے نئے وہاں جاکر بسے ہیں دوسری نسل اس ناسٹلجیا سے پورے طور پر آزاد ہوتی ہے۔

ایران کے صدر اعظم فاطمی نے پچھلی دو دہائیوں سے امریکہ میں رہنے والے ایرانیوں کی ایرانی کلچر اور زبان سے ان کی ناواقفیت پر افسوس کرتے ہوئے کہا تھا۔ شیطان ملک امریکہ میں جاکر نئی نسل اپنے بزرگوں کے کلچر اور عقیدوں کو بھولتی جارہی ہے۔ یہ نسل اپنے خون اور روایات سے اجنبی ہوگئی ہے۔ لیکن ان کے اس افسوس کے باوجود یہ ایک ایسا فطری عمل ہے جس کے بہاؤ پر کوئی باندھ نہیں باندھا جاسکتا۔ میر انیس کے مرثیوں میں حضرت امام حسین، ہندوستانی بن جاتے ہیں اور رحیم فارسی بھول کر دوہے کی صنف میں شہرت پاتے ہیں۔ ماضی وحال کی اس تہذیبی کشمکش نے امریکہ میں ہندوستانی اور پاکستانی گھروں کو نہ صرف پنج وقتہ نمازی بنادیا ہے، چہروں کو بھی ڈاڑھیوں سے سجادیا ہے۔

امریکہ میں جن شاعروں کو مدعو کیا جاتا ہے، انہیں الگ الگ گھروں میں ٹھہرایا جاتا ہے۔ ہر مشاعرہ میں نیا مکان ہوتا ہے نیا میزبان ہوتا ہے لیکن ماحول ہر گھر میں کم وبیش ایک سا ہوتا ہے۔ دو مشاعروں میں ندا اور قتیل شفائی ایک ساتھ ٹھہرائے جاتے ہیں۔ قتیل شفائی سے وہ ہندوستان، پاکستان اور گلف کے کئی مشاعروں میں مل چکا تھا۔ وہ اس قسم کے شاعر ہیں جو عمر کی ہر منزل میں کسی نہ کسی وقتی عشق سے خود کو جوان رکھتے ہیں۔ جہاں جاتے ہیں، وہاں کوئی افسانہ چھوڑ آتے ہیں۔ اس عشق میں آگ کم ہوتی ہے راگ زیادہ ہوتا ہے۔ یہی ان کی شاعری کا مزاج بھی ہے۔ ان کی طرح ان کی محبوبائیں بھی عمر کے ایک خاص دائرہ سے باہر آنے میں ہچکچاتی ہیں، شاید اسی لئے قارئین سے زیادہ مشاعروں کے سامعین کو زیادہ بھاتی ہیں۔

امریکہ میں قیام کے دوران وہ جب بھی ندا کے ساتھ بازار جاتے تھے، کوسمیٹک کی دوکان پر ضرور رک جاتے تھے۔ ان کے پرس میں کاغذ کا ایک پرچہ تھا۔ جسے وہ بار بار دکاندار کو دکھاتے تھے اور جب وہ رومن حرفوں کی تحریر پڑھ کر انکار میں سر ہلاتا تھا تو اسے پھر سے پرس میں احتیاط سے رکھ لیتے تھے۔ جب کئی جگہ انہوں نے ایسا کیا تو ندا نے ان سے پوچھا......

"قتیل صاحب آپ ایسی کون سی چیز تلاش کر رہے ہیں جو کہیں نہیں ملتی......؟"

"پتہ نہیں کیوں نہیں مل رہی۔ پچھلی بار تو یہاں سے لے گیا تھا"۔

"آخر وہ ہے کیا؟"

وہ مسکراتے ہوئے کہتے ہیں۔ ایک فیس کریم ہے جو اقبال بانو نے منگائی ہے۔

فیس کریم تو یہاں ایک سے ایک اچھی ہیں، کوئی بھی لے لیجئے۔ ندا کہتا ہے۔

نہیں جی۔ یہ خاص کریم جو انہوں نے منگائی ہے وہ چہرہ کے لئے نہیں ہے چہرہ کی جھریوں کے لئے ہے۔ وہ مسکراتے ہوئے ندا کو سمجھاتے ہیں اور پھر پہلے کی طرح دوسری دوکان کی طرف مڑ جاتے ہیں۔

عام طور سے جاتے وقت امریکہ میں گرمی کا خوشگوار موسم ہوتا ہے، لیکن مختلف ریاستوں میں مشاعرے پڑھتے ہوئے برف باری شروع ہو جاتی ہے۔ سارا شہر چاندی جیسی شفاف برف سے ڈھک جاتا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کی سردیوں کے کپڑے اور جوتے وہاں کام نہیں آتے۔ اس موسم میں گھروں میں بجلی اور پانی کی طرح ہیٹ کی بھی ضرورت ہوتی ہے جس کے بغیر ایک پل گذارنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

شکاگو میں ندا افتخار نسیم کے یہاں ٹھہرتا ہے۔ وہ مشی گن لیک کے کنارے کئی منزلہ بلڈنگ میں ایک بڑے سے فلیٹ میں اپنی دو تندرست بلیوں کے ساتھ اکیلے رہتے ہیں۔ یہ بلیاں انہیں کے ساتھ سوتی ہیں اور انہیں کے ساتھ جاگتی ہیں۔ ان امریکی بلیوں سے وہ اُردو میں ہی بات کرتے ہیں جسے اب وہ اچھی طرح سمجھنے لگی ہیں۔ وہ اُردو کے پہلے 'گے' شاعر ہیں۔ جب سے انہوں نے اس راز کا انکشاف کیا ہے، اُردو ادب کی تاریخ میں کئی شاعروں کو بھی وہ اپنا جیسا ماننے پر آمادہ ہیں۔ ان میں ایک مرزا غالبؔ بھی ہیں جن کے کئی شعروں میں شامل پیکروں سے وہ ان کا 'گے' ہونا ثابت کر چکے ہیں۔ مثلاً

سبزۂ خط سے ترا کاکلِ مشکیں نہ دبا

یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

افتخار نسیم دانشور ادیب و شاعر ہیں۔ جسامت سے پنجابی پٹھان لگتے ہیں۔ بات بات پر ہنستے ہنساتے ہیں، لیکن جب ان سے کوئی ان کے جیسا ملنے آتا ہے تو ان کی چال ڈھال اور لہجہ اچانک بدل جاتا ہے اور وہ فوراً نسیم میاں سے نسیم بی بی ہو جاتے ہیں وہ ایک بار ندا کو ایسے بار میں بھی لے جاتے ہیں جہاں عورت عورت سے اور مرد مرد سے بے جھجک عشق فرماتے ہیں۔ افتخار امریکہ میں 'گے' جماعت کے فعال رکن ہیں۔ ان کے دو شعری مجموعے 'غزال' اور 'نرمان' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ انہوں نے جب اپنا پہلا مجموعہ ندا کو بھیجا تھا تو تاکیداً لکھا تھا۔ تم اس پر لکھنے کی تکلیف اُسی وقت کرنا جب 'گے' فلسفہ کے بارے میں تھوڑا بہت جان لو۔ ندا نے اس کتاب کے بارے میں کچھ نہیں لکھا، لیکن اس کتاب میں ان کی تحریر کے نیچے اپنا ایک شعر لکھ دیا تھا۔

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کہیں زمین کہیں آسماں نہیں ملتا

امریکہ میں نئی پرانی نسل کی کشمکش کے ساتھ ادھیڑ عمر کی تنہائیاں بھی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ ان میں وہ لوگ شامل ہیں جو یہاں کنوارے آتے ہیں، جب یہاں رچ بس جاتے ہیں تو انہیں اپنے ملکوں کی سست رفتار حسیناؤں کے مقابلہ میں یورپ کے تیز رفتار چہرے زیادہ بھاتے ہیں۔ لیکن تیز رفتار زندگی میں انسانی رشتے جلد ہی نئے سے پرانے ہو جاتے ہیں۔ یہ دو مختلف تہذیبوں کا فرق ہے۔ مگر جب اس کا تجربہ ہوتا ہے تو کافی دیر ہو چکی ہوتی ہے۔

بوسٹن میں لکھنؤ کے وسیم صاحب کا شاندار بنگلہ کافی کشادہ اور سجا سنورا ہے۔ اس میں کئی کمرے ہیں۔ ہر کمرہ فلمی سیٹ کی طرح خوبصورت اور آراستہ ہے۔ لیکن اس پورے گھر میں صرف ایک کمرہ ہی آباد ہے جس میں وہ اپنے کتے کے ساتھ رہتے ہیں۔ باقی کے کمرے ان تصویروں کے لئے وقف ہیں جن کا تعلق ان کے ماضی سے ہے۔ ان میں ایک تصویر وسلاوہ کی ہے۔ جو پولینڈ نژاد امریکن ہیں۔ یہ ۲۵ سال پہلے ان کی اہلیہ تھیں۔ آج کل خانہ داری سے آزاد ہو کر اسی شہر میں اپنے ایک ہم وطن مصور کے ساتھ رہتی ہیں۔ اور خود بھی

مصوری کرتی ہیں۔ وسیم صاحب کے گھر میں ان کی کئی پینٹنگز لگی ہوئی ہیں۔ ان میں ایک دو اس وقت کی ہیں جب وہ اس گھر میں تھیں۔ باقی کی انہوں نے وسلاوہ اور اس کے ساتھی مصور کی مشترک نمائشوں سے خریدی تھیں۔ وسلاوہ ان کے دو بچوں کی ماں بھی ہے۔ وسلاوہ سے علیحدگی کے وقت لڑکی کی عمر پانچ سال اور لڑکا سات سال کا تھا۔ لڑکی نے پندرہ سال کی عمر میں اپنی پسند کے ایک امریکن لڑکے سے شادی کرلی ہے۔ اب وہ نعیمہ احمد سے نعیمہ پال بن گئی ہے۔ لڑکے نے ۱۴ برس کی عمر میں باپ کا گھر چھوڑ کر اپنی الگ دنیا بسالی ہے۔ باپ اور رینٹل اسٹڈیز کے شعبہ میں مقامی کالج میں استاد ہیں۔ بیٹے کا ایک آرکسٹرا گروپ ہے۔ بنگلے کی مختلف دیواروں پر ٹنگی یہ تصویریں سال میں ایک مرتبہ ہی کرسمس کی چھٹیوں میں یہاں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ اسی دوران وسلاوہ بھی بچوں کے ساتھ وسیم صاحب کے یہاں کچھ دن کی مہمان بنے آجاتی ہیں، یہ آتے ہیں ٹھہرتے ہیں اور پھر چلے جاتے ہیں۔ لیکن ان کے نام کے کمروں کی صفائی، دو نیگرو لڑکیاں، ہفتہ میں دوبار سال بھر کرتی رہتی ہیں۔ امریکہ میں گذارے اپنے شب و روز سے وسیم صاحب کا رشتہ اب ان چند دنوں تک ہی محدود ہے۔ لیکن لکھنؤ کی شائستگی اور میرؔ اور میر انیسؔ کی شاعری ہمیشہ کی طرح اب بھی انکے ساتھ ہے۔

سفر کو جب بھی کسی داستان میں رکھنا
قدم یقین میں منزل گمان میں رکھنا

جو ساتھ ہے وہی گھر کانصیب ہے لیکن
جو کھو گیا ہے اسے بھی مکان میں رکھنا

وہ ایک خواب جو چہرہ کبھی نہیں بنتا
بناکے چاند اسے آسمان میں رکھنا

جو دیکھتی ہیں نگاہیں وہی نہیں سب کچھ
یہ احتیاط بھی اپنے بیان میں رکھنا

☆☆☆

زندگی کرنا سب سے بڑی عبادت ہے۔ لیکن الگ الگ مذہبوں کی طرح اس کے قانون قاعدے سب کیلئے یکساں نہیں ہوتے۔ ہر زندگی اس عبادت کے لئے اپنے اصول اور آداب مرتب کرتی ہے۔ ہیلن بھی اپنے طور سے جیتی ہے۔ حال میں مستقبل کے خواب کے ساتھ۔ زندگی کے سامنے کوئی مقصد ہو تو شب و روز کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جاتا ہے۔

اس کا ماضی، نچلے طبقے کی ایک چال ٹائپ عیسائی گھر سے شروع ہوتا ہے۔ اس گھر کا فرد بننے سے پہلے وہ ایک آشرم کے رجسٹر میں ایک چھ سات مہینے کی معصوم لڑکی تھی جو اب سے ۱۸ سال پہلے ایک ریلوے پلیٹ فارم پر روتی ہوئی ملی تھی۔ وہ آشرم کے رجسٹر میں درج ہونے سے پہلے کس علاقے کی تھی۔ وہ کس مذہب کے والدین کی اولاد تھی، اس گھر میں کونسی زبان بولی جاتی تھی، ان سوالوں کے جواب کسی کو نہیں معلوم۔ لیکن اب اس کا نام ہیلن تھا، مذہب عیسائی اور اس کی مادری زبان ہندوستانی کرسچین میں بولی جانے والی انگریزی تھی اور وہ ایک پرائیوٹ فرم میں پچھلے ایک سال سے ٹائپسٹ تھا۔ اس کا ایک منگیتر بھی ہے۔ جو پہلے اسی کے ساتھ اس کے فرم میں کام کرتا تھا۔ اب کئی سالوں سے دوبئی میں ہے وہاں وہ یہاں سے دوگنی تنخواہ پر ایک کمپنی میں ڈرائیور ہے۔ ہیلن کی وہ ماں جس نے اسے آشرم سے گود لیا تھا، مر چکی ہے۔ اس کے مرنے کے بعد باپ کی بڑھتی شراب نوشی کی عادت نے اپنی تندرستی کے ساتھ اینٹ پتھر کی چھوٹی سی چال کو بھی پی لیا تھا۔ آج کل ہیلن ورکنگ وومن ہوسٹل میں رہتی ہے اور باپ ادھر اُدھر کے اڈوں میں وقت گذارتا ہے۔

ندا کی ہیلن سے پہلی ملاقات جوہو میں کنگز ہوٹل کے ایک کمرے میں ہوئی تھی، اس کمرے میں ایک فلم کی اسکرپٹ کی نشستیں چل رہی تھیں۔ ایسی نشستوں میں تھوڑی دیر کام چلتا ہے، زیادہ وقت جام چلتا ہے۔ جام کی ان محفلوں کو رنگین بنانے کے لئے ہر شام پیشہ ور لڑکیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ چہرے مہرے جسم اور عمر کے لحاظ سے ان لڑکیوں کی الگ الگ قیمتیں ہوتی ہیں۔ قربانی کے جانوروں کی طرح ان کو جانچا پرکھا جاتا ہے، بھاؤ تاؤ کیا جاتا ہے، پھر سودا کیا جاتا ہے۔ قیمتوں میں بھی آدھی رات اور پوری رات کا فرق ہوتا ہے۔ آدھی رات بارہ بجے تک طے ہے۔ پوری رات صبح ساڑھے چار یا زیادہ سے زیادہ پانچ بجے ختم ہو جاتی تھی۔ ان سب کے ایجنٹ ہوتے ہیں جو کسی مقررہ کمیشن پر ان کے لئے کام کرتے ہیں۔ سودا طے ہو جانے کے بعد معاوضہ پیشگی ادا کیا جاتا ہے۔ اس معاوضہ میں پولس اور ہوٹل کے مالک کی بھی حصہ داری ہوتی ہے۔ آرڈر دینے پر ہوٹل کا ایک مخصوص آدمی جو اس شعبہ سے متعلق ہے، ایجنٹ کو فون کرتا ہے، ایجنٹ لڑکیوں کا نمبر گھماتا ہے۔ اور تھوڑی دیر میں گاہکوں کے سامنے اپنی چلتی پھرتی دکان لے کر حاضر ہو جاتا ہے۔ اس کی اس دوکان میں اس وقت الگ الگ لباسوں میں چار لڑکیاں تھیں۔ مراٹھی، گجراتی، نیپالی اور پنجابی۔ انہیں میں جو چہرے اور جسم سے سب سے مختلف اور پرکشش تھی اس کا نام ہیلن مائکل تھا۔ مدن جو فلم کا پروڈیوسر تھا اور جو اب جوانی گذار کے بڑھاپے کی سرحد میں داخل ہو چکا تھا۔ اسے جین اور شرٹ والی یہی لڑکی پسند آئی۔ اس کی عمر اس کی بیوی سے آدھی اور بڑے لڑکے سے دو سال کم تھی۔ اٹھارہ سال کی ہیلن سے معاملہ طے ہو جانے کے بعد دوسری لڑکیاں کسی اور منزل کی تلاش میں نکل جاتی ہیں۔ ہیلن وہیں رہ جاتی ہے۔ وہ اپنی عمر کے حساب سے زیادہ تجربہ کار اور کلاکار نظر آتی تھی۔ پہلے وہ اجنبی چہرہ پر شناسا مسکراہٹ سجا کر ہوٹل کے کمرے کا جائزہ لیتی ہے۔ پھر باری باری الگ الگ انداز میں کمرے میں موجود افراد پر نظر ڈالتی ہے۔ کسی کو دانت سے نچلا ہونٹ دبا کر دیکھتی ہے کسی کا دونوں بھوؤں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر معائنہ کرتی ہے۔ کسی کے قریب آکر آنکھیں جھپکاتی ہے اور دور ہو کر ہوائی بوسہ اڑاتی ہے۔

اس کے بعد دیر تک کھنکنے والا قہقہہ لگاتی ہے۔ چند لمحوں میں ہی وہ انجان ہوتے ہوئے جانی پہچانی بن جاتی ہے۔

کمرے میں اس کی موجودگی نشے کو اور بھی چونچال بنا دیتی ہے۔ کوئی اس کے بالوں کو چھو کر اپنا گلاس اس کے منہ سے لگاتا ہے، کوئی اس کے گال میں چٹکی بھر کے اس کے حسن کی تعریف کرتا ہے، کوئی ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچتا ہے، ان سب حرکتوں کے جواب میں اس کے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ، کبھی ہلکی کبھی گہری ہو کر چمک رہی تھی جسے اس نے ایجنٹ کے باہر جاتے ہی اپنے ہونٹوں پر سجا لیا تھا۔

جب نشہ زیادہ بے حجاب ہونے لگتا ہے تو وہ اپنا بیگ اٹھا کر چند لمحوں کے لئے اندر جاتی ہے اور جب باہر آتی ہے تو وہ جین اور شرٹ کے بجائے گلابی رنگ کے نائیلون کے گاؤن میں ملبوس ہوتی ہے۔ اس گاؤن میں اس کے جسم کے خطوط آگ کی لپٹوں کی طرح لپکتے محسوس ہوتے تھے۔ وہ ہوٹل کے میوزک سسٹم کو آن کر کے ناچنا شروع کر دیتی ہے۔ ناچتے ناچتے جب وہ پسینہ میں شرابور ہو جاتی ہے تو بستر پر بے سدھ ہو کر لیٹ جاتی ہے اور سارے لوگ مری ہوئی لاش پر گدھوں کی صورت الگ الگ حصوں سے اسے نوچنا کاٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد سارے گدھوں کو ہٹا کر ایک بھیڑیا آتا ہے اور اسے اپنے منہ میں بھر کے اندر لے جاتا ہے۔ مدن پروڈیوسر تھا بھیڑیے کا رول بھی اسی کا تھا۔

ورکنگ وومین ہوسٹل کے رجسٹر میں اس کے ماضی کی مدت تین سال ہے۔ اس میں لکھا ہے۔ ہیلن ایک نوکر پیشہ اکیلی لڑکی ہے۔ اس کو اس ہوسٹل میں باندرہ کے سینٹ پال چرچ کے فادر کی سفارش پر داخل کیا گیا ہے۔ اس کی نوکری ایک مشہور کنسٹرکشن کمپنی میں ہے۔ اس کمپنی میں کام زیادہ ہے جس کی وجہ سے کبھی کبھی رات کو بھی اسے باہر رہنا پڑتا ہے۔ اس کے لئے ہوسٹل کمیٹی سے اسے رعایتی اجازت دی گئی ہے۔ اچھے کردار کی ملنسار لڑکی ہے۔ اس کے روم پارٹنر کو کبھی اس سے شکایت نہیں ہوئی۔ کرایہ ہر مہینہ پابندی سے ادا کرتی ہے۔ جب رات کو ڈیوٹی کے لئے کمپنی سے فون آتا ہے، تو جانے سے پہلے وارڈن سے اجازت

طلب کرتی ہے۔ اس کا ایک بوائے فرینڈ ہے جو پچھلے کئی سال سے دوبئی میں ہے۔ وہ سال میں ایک بار اس سے ملنے آتا ہے۔ ان کی منگنی ہو چکی ہے لیکن شادی میں دونوں کی مرضی سے ابھی دیر ہے۔ اس دانستہ تاخیر کی وجہ وہ مکان ہے جو ابھی زیر تعمیر ہے اور جس کی کئی قسطیں ابھی ادا ہونی باقی ہیں۔ یہ قسطیں دونوں اپنی محنت کی سیونگ سے ادا کرتے ہیں۔ اس عبارت کے نیچے ایک اور نوٹ بھی شامل تھا۔ پہلی تحریر اور دوسری تحریر میں تین سال کا فرق تھا

دوسرا نوٹ۔

ہوسٹل کمیٹی نے طے کیا ہے، ہیلن ڈی سوزا نام کی لڑکی اب ہوسٹل میں نہیں رہے گی۔ جو ہو پولیس کے تھانے سے ہمیں اطلاع ملی ہے کہ وہ جیسی نظر آتی ہے ویسی نہیں ہے۔ وہ ایک کال گرل ہے اور غلط طریقہ سے پیسہ کماتی ہے۔ اس پیشے میں وہ پچھلے تین سال سے تھی۔ لیکن ہمیں اب معلوم ہوا۔ اس کی بدکرداری سے ہمارے ہوسٹل کی ساکھ خراب نہ ہو اس لئے ہم نے اسے دو دن کا نوٹس دیکر اس کا نام اپنے رجسٹر سے کاٹ دیا ہے۔ وہ اب اپنی کسی سہیلی کے ساتھ سانتا کروز ایسٹ میں آزاد چال نمبر ۸ میں رہتی ہے۔ ہوسٹل کے پتے پر اب اس کے لیٹر نہیں آتے۔ اس کے جانے کے بعد جو لیٹر آئے تھے وہ اس کے نئے پتے پر ری ڈائریکٹ کر دیے گئے تھے۔ ہم نے اس بارے میں چرچ کے فادر کو بھی بتادیا ہے ......

چرچ کے فادر نے اپنی ڈائری میں اس کے ماضی کے بارے میں لکھا تھا۔ اپنی ماں شیل کی طرح ہیلن بھی ایک نیک عیسائی لڑکی ہے۔ چرچ کے اسکول سے ہی اس نے تعلیم حاصل کی ہے۔ اس کی تعلیم میں مسز پال کی محنت اور محبت کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی تعلیم کی ذمہ داری چرچ نے پوری کی۔ پہلے وہ ایک وومن ہوسٹل میں تھی، آج کل اپنے آفس کی کسی سہیلی کے ساتھ رہتی ہے۔

یسوع مسیح نے کہا ہے۔ گناہگار پر پہلا پتھر وہ مارے جس نے کبھی کوئی گناہ نہیں کیا ہو۔ سب مٹی سے بنتے ہیں، مٹی میں مل جاتے ہیں۔ ہیلن بھی مٹی سے بنی ہے۔ مٹی کے دوش اس میں بھی ہیں۔ لیکن وہ اپنے گناہوں سے باخبر ہے۔ یہ ہی اس کی نیکی کی دلیل ہے۔ وہ ہر

اتوار کو پابندی سے چرچ آتی ہے اور اپنی ساری اچھائی برائی یسوع کے حوالے کر جاتی ہے۔ وہ بڑے اچھے دل کی لڑکی ہے۔ خداوند اس پر ضرور مہربان ہوگا۔

ہیلن نے اپنے حال کے بارے میں اپنی ڈائری میں یوں لکھا ہے۔

میں نے مصیبت میں خداوند سے دعا کی!

خداوند نے مجھے جواب دیا، اور کشادگی بخشی!

انسان میرا کیا کر سکتا ہے!

خداوند میری طرف میرے مددگاروں میں ہے!

خداوند جس کا مددگار ہوتا ہے اس کا وقت سازگار ہوتا ہے۔ آج میرا اپنا گھر ہے، میرا پتی ہے، دو سندر بچے ہیں، عزت کی زندگی ہے۔ یہ سب کچھ تو بہت پہلے سے میرے ساتھ تھا لیکن ذہن میں ایک خواب کی صورت۔ اس خواب کو حقیقت بنانے کے لئے ایک گھر بھی چاہئے تھا۔ یہی گھر میری منزل تھا۔ ممبئی میں اس منزل کو پانے کے لئے سب کے اپنے اپنے راستے ہوتے ہیں۔ میرے ماضی نے ایک رستہ اپنایا تھا۔ میں شکرگذار ہوں خداوند کی، وہ واقعی بہت مہربان ہے۔ اس نے میرے ماضی کی سوچ کے مطابق ہی میرا حال بنایا ہے۔

سفر میں دھوپ تو ہوگی جو چل سکو تو چلو
سبھی ہیں بھیڑ میں تم بھی نکل سکو تو چلو
کسی کے واسطے راہیں کہاں بدلتی ہیں
تم اپنے آپ کو خود ہی بدل سکو تو چلو
یہاں کسی کو کوئی راستہ نہیں دیتا
مجھے گراکے اگر تم سنبھل سکو تو چلو
یہی ہے زندگی کچھ خواب چند امیدیں
انہیں کھلونوں سے تم بھی بہل سکو تو چلو

☆☆☆

وہ گول سے منہ کا اپنی عمر سے زیادہ موٹا لڑکا، رات دن چلتی پھرتی، ہنستی گاتی، شاپنگ کرتی نشے میں جھومتی لنک روڈ کی نیلم ہوٹل کی فٹ پاتھ پر روز شام کو آکر بیٹھ جاتا تھا۔ وہ اتنے دنوں سے یہاں تھا کہ اب بجلی کے کھمبوں، دوکانوں اور قطار میں کھڑی رکشاؤں کی طرح وہ بھی سڑک کا ضروری حصہ محسوس ہوتا تھا۔ نیلم ہوٹل کا پتہ بتاتے وقت کسی لینڈ مارک کی طرح اس لڑکے کا حوالہ بھی دیا جاتا تھا، مثلاً اس کی بیماری بھی ہے اور ذریعہ معاش بھی۔ خدا رزاق ہے، اس نے سب سے رزق کا وعدہ کیا ہے۔ کوئی تندرستی سے کماتا ہے کوئی بیماری کو روزگار بناتا ہے۔ موٹا لڑکا اپنی بیماری سے ہی اپنا گھر چلاتا تھا۔ اپنے باپ کی طرح جواب نہیں ہے۔ اس کا گھر قریب کی ایک فٹ پاتھ پر لکڑی اور زنگ لگی ٹین کی چادروں سے بنی ایک جھونپڑی تھا۔ اس میں وہ اپنی بوڑھی ماں، ایک کالے کتے، ایک بہن اور دو چھوٹے بھائیوں کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ جب یہاں آکر بیٹھتا تھا تو یہی کتا اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ یہ کتا اس کا دوست بھی تھا اور چوکیدار بھی۔ سڑک کے دوسرے بھکاری بچوں کو معلوم تھا نورا اپنے مٹاپے کی وجہ سے نہ جلدی اٹھ سکتا ہے اور نہ زیادہ چل سکتا ہے۔ وہ اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کتے کی ہر وقت غراہٹ انکے حوصلے پست کردیتی تھا۔ ایک بار ایک لڑکے نے بے دھیانی میں اس کے ایلومینیم کے کٹورے

میں پڑی ریزگاری پر ہاتھ صاف کرنا چاہااور بری طرح سزا پائی۔ وہ جیسے ہی مٹھی میں پیسے بھر کر آگے بڑھا کتے نے لپک کر اس کی ایک بھاگتی ٹانگ کو منہ میں بھر لیا۔ لڑکا منہ کے بل گر گیا اور نورا اپنی جگہ بیٹھا خوشی سے تالیاں بجانے لگا۔ اس حادثہ کے بعد کسی دوسرے کو اسے پریشان کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ندا کی اس سے ملاقات ان دنوں سے ہے جب وہ پالی ہل کے ہوسٹل میں رہتا تھا۔ آتے جاتے دن میں ایک دوبار اسے دیکھ کر کوئی جملہ تراشنا ندا کا معمول تھا۔

نورا جب دیکھو مسکراتا نظر آتا تھا۔ کوئی اسکے موٹاپے کا مذاق اڑاتا تھااور وہ مسکراتا تھا۔ کوئی پیچھے سے اس کے چپت لگاتا تھااور وہ مسکراتا تھا، کوئی شرابی باہر سے نکلتے ہوئے اس کے کٹورے کو ٹھوکر سے کھسکاتا تھااور وہ مسکراتا تھا۔ اس کی بے ہنگم فربھی کواس ہر وقت کی ایک سی مسکراہٹ نے ارد گرد کے دکانداروں کا بھی کھلونا بنادیا تھا۔

ایک دن ایک فلم کے پروڈیوسر کی نظر اس پر پڑتی ہے۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ فلم میں بچوں کے اسکول کا ایک سین تھا۔ اس میں نورا تھوڑی دیر کے لئے بادشاہ بنایا گیا تھااس کو چمکیلے کپڑے پہنائے گئے تھے۔ اس کے سر پر تاج رکھا گیا تھا۔ اسکے سامنے بہت سارے میوے رکھے گئے تھے۔ ان میں کئی چیزوں کو تو اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ جو جی میں آتا ہے کھاتا ہے اور بیٹھا بیٹھا مسکراتا ہے۔ لیکن یہ تام جھام اور عیش دو ڈھائی گھنٹوں میں ختم ہو جاتا ہے۔ اس فلم میں کسی دوسرے کی آواز میں جو جملے اس سے بلوائے گئے تھے وہ فلم کے رائٹر نے یوں لکھے تھے۔

ہم اس ملک کے بادشاہ ہیں۔ ہم نہیں چاہتے ہماری آبادی میں کوئی غریب ہو کوئی بھکاری ہو۔ جنتا کی خدمت ہی ہماری حکومت ہے۔ ان مکالموں کے بعد نورا کے چہرہ پر جنتا کے جے کارے گونجتے دکھائے جاتے ہیں۔ اس کے سامنے بیٹھے ہوئے سارے بچے ایک آواز میں چلاتے ہیں۔ بادشاہ سلامت زندہ باداور اس کے بعد سین ختم ہو جاتا ہے۔

اس پہلی اور آخری فلم کے بعد اسے فلموں میں تو کام نہیں ملا لیکن اس چھوٹے سے

ڈائیلاگ نے اسے سڑک کا جانا پہچانا چہرہ بنادیا۔ وہ بھی لوگوں کو متوجہ کرنے کے لئے اپنی منمناتی آواز میں اکثر یہی مکالمہ بولا کرتا، ایک دفعہ ایک الیکشن کی میٹنگ میں بھی، مہمان مقرر کی تقریر سے پہلے بھیڑ کو بہلانے کے لئے اس سے یہ مکالمہ بلوایا گیا تھا اور اسکے معاوضہ میں اسے ۲۵ روپے ملے تھے۔ ہزاروں کی بھیڑ کے سامنے اسٹیج پر اس موٹے لڑکے کو بولتا دیکھ کر ہنسنے والوں میں آسٹریلیا سے آیا ہوا ایک ڈاکٹر بھی ہوتا ہے۔ وہ کچھ دن پہلے ہی اپنے وطن سے آیا تھا اور اس میڈیکل وفد کا ایک ممبر تھا جس کا کلینک سینٹ پال چرچ میں غریب مریضوں کا مفت علاج کر رہا تھا۔

میتھوس نے اب سے پہلے بھی کئی بار اسے فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ لیکن اس بار ایک بڑے مجمع میں اس کی ہیئت پر دوسروں کے ساتھ خود کو بھی ہنستا ہوا پایا تو وہ اچانک چونک گیا۔ اس نے فوراً جیب سے ڈائری نکال کر اس میں لکھا۔ یہ چہ بیمار ہے، اس بیماری کو بھیک کا ذریعہ نہیں بنانا چاہئے، اس کا علاج کرنا چاہیئے۔

نورا جب سے بادشاہ بنا تھا اس کی روز کی آمدنی میں اچھا خاصہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کی ماں پہلے دن میں دوبار اسکے ساتھ نظر آتی تھی۔ ایک بار صبح کے وقت جب وہ اسے لا کر یہاں بٹھاتی تھی۔ دوسری بار شام کو جب وہ اسے گھر واپس لے جانے آتی تھی۔ مگر اب ان دو وقتوں کے بیچ میں بھی ایک چکر کاٹ لیتی تھی۔ وہ آتی تھی، اور دوپہر تک کٹورے میں جتنی ریزگاری جمع ہوتی تھی اسے لے کر چلی جاتی تھی۔ ایسے ہی ایک دوپہر کو جب وہ آتی ہے تو نورا کی فٹ پاتھ پر بھیڑ کو دیکھ کر گھبرا جاتی ہے۔ اس کا دل زیادہ تیزی سے دھڑکنے لگتا ہے۔ اسے لگتا ہے نورا بھی اپنے باپ کی طرح بیٹھے بیٹھے گذر گیا ہے۔ وہ ڈرتے ڈرتے آگے بڑھتی ہے، لیکن بھیڑ میں اسے نورا کہیں نظر نہیں آتا۔ وہاں آس پاس کے جتنے لوگ تھے وہ اس کے اچانک غائب ہو جانے پر اپنی اپنی طرح بول رہے تھے۔

ایک کہہ رہا تھا۔ وہ کرسٹان ہے۔ اس کو بھی کرسٹان بنائے گا۔ چرچ والے اسی طرح ہمارے دھرم کو نشٹ کر رہے ہیں۔ ہم ہندو کو عیسائی نہیں بننے دیں گے۔

دوسرا کہہ رہا تھا۔ اڑیسہ میں بھی انہیں کے ذات والے بھولے بھالے ہندوستانیوں کو اسی طرح ورغلا رہے تھے۔ بجرنگ دل کے ایک سیوک نے انہیں جلا کر خاک کردیا۔

دوسرے نے نعرہ لگایا۔ بھارت ماتا کی جے!

نورا کی ماں خاموشی سے لوگوں کی باتیں سنتی رہی اور پھر کتے کو ساتھ لے کر واپس جھونپڑی میں آگئی وہ نورا کے اچانک غائب ہو جانے سے پریشان تھی نورا کے خالی کٹورے میں آج وہ ریزگاری بھی نہیں تھی جو گھر کا روز کا خرچہ تھا جھونپڑی کے سامنے ایک آدمی بے چینی سے نورا کی ماں کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اس نے پوچھا نورا کہاں ہے؟

کیوں تمہیں کیا کام ہے اس سے؟ وہ اسے گھورتی ہوئی تعجب بھری نظروں سے کہتی ہے۔

کل شوٹنگ ہے۔ ہمارے سیریل کے ڈائریکٹر نے اسے بلایا ہے۔ اچھے پیسے ملیں گے۔

ابھی تو نہیں ہے۔ کل آنا تو لے جانا۔ وہ پیسوں کی بات سن کر خوش ہوتے ہوئے جواب دیتی ہے۔

فٹ پاتھ کی بھیڑ سے اسے اتنا تو معلوم ہو گیا تھا کہ نورا مرا نہیں زندہ ہے۔ کوئی گورے رنگ کا آدمی اسے کار میں کہیں لے گیا ہے۔ ایسے ہی جیسے پہلے فلم کا پروڈیوسر لے گیا تھا۔ اس کا دل کہتا تھا نورا ضرور واپس آئے گا...... اور ہوا بھی یوں ہی۔ نورا دھلا دھلایا نئے کپڑے پہنے واپس آجاتا ہے۔ اس کے ساتھ وہی آسٹریلین ڈاکٹر ہوتا ہے جو اسے فٹ پاتھ سے اٹھا کر لے گیا تھا۔ نورا کی ماں اس کی آواز سن کر، آدھی رات کی کچی نیند سے جاگ کر باہر آتی ہے اور نورا سے لپٹ جاتی ہے۔

آسٹریلین ڈاکٹر کے ساتھ کھڑا آدمی نورا کی ماں کو سمجھاتے ہوئے کہتا ہے۔ تمہارا بچہ بیمار ہے یہ بیماری ڈاکٹر نے کہا ہے خطرناک ہے ہمارے ڈاکٹر نے اس کا علاج کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ سارا خرچ وہی اٹھائیں گے۔ تم اس کی ماں ہو اس لئے تمہاری اجازت کی ضرورت ہے۔ اگر ابھی سے اس کی دیکھ بھال نہیں ہوئی تو اس کا بچنا مشکل ہوگا......

نورا کی ماں چپ چاپ سب سنتی ہے اور پھر ناراضگی سے اونچی آواز میں بولتی ہے۔ نہیں کرانا تمہارا علاج۔ یہ جیسا ہے ویسا ہی اچھا ہے۔ یہ علاج کرائے گا تو گھر کون چلائے گا زندہ رہے یا مرے مگر ہم اسے کرستان نہیں بننے دینگے۔ جس دھرم کا ہے اسی دھرم میں رہے گا سمجھے۔ بڑے آئے علاج کرنے والے ۔

ڈاکٹر میتھوس مایوس ہو کر واپس چلا جاتا ہے۔ اس واقعہ کے ایک ڈیڑھ مہینہ کے بعد نورا اسی فٹ پاتھ پر بیٹھے بیٹھے اپنے باپ ہی کی طرح ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتا ہے۔ اب اس کی جگہ اس کے چھوٹے بھائی نے سنبھال لی ہے۔ وہ بھی اسی کی طرح متاپے کی بیماری کا شکار ہے......

ایک رات نیلم ہوٹل کے بار میں ڈاکٹر میتھوس ندا سے اپنی نیلی آنکھیں پھیلاتے ہوئے پوچھتا ہے۔ حیرت ہے بھارت میں موت کی بھی تجارت ہوتی ہے اس لڑکے کا ابھی تک زندہ رہنا ایک معجزہ ہے، میں تو سمجھتا تھا یہ دس بارہ دن تک ہی زندہ رہ پائے گا۔ لیکن اب تک زندہ ہے شاید ڈاکٹر میتھوس کافی عرصے کے بعد ادھر آئے تھے اور دور سے نورا اور اسکے بھائی میں فرق نہیں کرپائے تھے۔

'چھوٹا آدمی'

تمہارے لئے سب دعا گو ہیں
تم جو نہ ہو گے
تو کچھ بھی نہ ہو گا
اسی طرح مر مر کے جیتے رہو تم
تمہیں ہر جگہ ہو
تمہیں مسئلہ ہو
تمہیں حوصلہ ہو
مصور کے رنگوں میں

تصویر بھی تم
مصنف کے لفظوں میں
تحریر بھی تم
مقرر کے نعروں میں
تقریر بھی تم
تمہارے لئے ہی
خدا باپ نے اپنے اکلوتے بیٹے کو
قرباں کیا ہے
سبھی آسمانی کتابوں نے تم پر
تمہارے عذابوں کو آساں کیا ہے
خدا کی بنائی ہوئی اس زمیں پر
جو سچ پوچھو تم سے محبت ہے سب کو
تمہارے دکھوں کا مداوا نہ ہوگا
تمہارے دکھوں کی ضرورت ہے سب کو۔

(جاری)

☆☆☆

تحریر کے لئے دو نظمیں

وہ آئی
اور اس نے مسکرا کے
میری بڑھتی عمر کے
سارے پرانے، جانے انجانے برس
پہلے ہواؤں میں اڑائے
اور پھر
میری زبان کے سارے لفظوں کو
غزل کو، گیت کو، دوہوں کو، نظموں کو
کھلی کھڑکی سے
باہر پھینک کر یوں کھل کھلائی
قلم نے
میز پر لیٹے ہی لیٹے آنکھ مچکائی
میاؤں کر کے
کودی بند شیشی میں پڑی سیاہی
اٹھا کے ہاتھ دونوں

چائے کے کپ نے لی انگڑائی
اچانک میرے ہونٹوں پر
اشاروں
اور بے معنی صداؤں کی
وہی بھاشا ابھر آئی
جسے لکھتا ہے سورج
جسے پڑھتا ہے دریا
جسے سنتا ہے سبزہ
جو پھولوں میں مہکتی ہے
ہواؤں میں کھنکتی ہے
جسے صدیوں سے بادل بولتا ہے
اور ہر دھرتی سمجھتی ہے

☆☆☆

بہت میلا ہے یہ سورج
کسی دریا کے پانی میں
اسے دھو کر سجائیں پھر

گگن میں چاند بھی
کچھ دھندلا دھندلا ہے
مٹا کے اس کے سارے داغ دھبے
جگمگائیں پھر

ہوائیں سو رہی ہیں
پربتوں پر پاؤں پھیلائے
جگا کے ان کو نیچے لائیں
پیڑوں میں بسائیں پھر

دھماکے کچی نیندوں میں
ڈرا دیتے ہیں بچوں کو
دھماکے بند کر کے
لوریوں کو گنگنائیں پھر

وہ جب سے آئی ہے
یوں لگ رہا ہے
اپنی یہ دنیا
جو صدیوں کی امانت ہے
جو ہم سب کی وراثت ہے
پرانی ہو چکی ہے
اس میں اب تھوڑی
مرمت کی ضرورت ہے

☆☆☆